حمورابی اور بابلی تہذیب و تمدن

مالک رام

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
نئی دہلی

حمورابی اور بابلی تہذیب و تمدّن

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی

صدر دفتر:
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی 110025
شاخیں:
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اُردو بازار۔ دہلی 110006
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنسس بلڈنگ۔ بمبئی 400003
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ یونی ورسٹی مارکیٹ۔ علی گڑھ 202002

پہلی بار دسمبر ۱۹۹۲ء

قیمت =/75

لبرٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) پٹودی ہاؤس۔ دریا گنج۔ نئی دہلی ۲ میں طبع ہوئی۔

فہرست

HAMMURABI, KING OF BABYLON, FROM A RELIEF IN THE BRITISH MUSEUM.

Brit. Mus., No. [illegible]

مقدمہ

میں دراصل تاریخ کا طالبعلم ہوں۔ اردو ادب اور تحقیق کی طرف تو میں، یوں کہیے، صراطِ مستقیم سے بھٹک کر نکل آیا۔ اردو میں نے اپنے قصبے ڈبھالیہ، ضلع گجرات، پاکستان) کے ورنیکلر مڈل اسکول میں صرف آٹھویں درجے تک پڑھی، بلکہ ان دنوں ہمارے ہاں ذریعۂ تعلیم ہی اردو تھی۔ جب انگریزی اسکول پہنچا، تو جونیر اسپیشل اور سینیر اسپیشل کے بعد نویں اور دسویں کے دو برس میں نے دوسرے مضامین کے ساتھ اردو بھی پڑھی۔ لیکن باور فرمایئے، یہ کم و بیش اسی کا اعادہ تھا، جو میں اپنے ابتدائی مدرسے میں آٹھویں تک پڑھ چکا تھا۔ میں نے ۱۹۳۰ء میں پنجاب یونی ورسٹی (گورنمنٹ کالج) لاہور سے ایم اے (تاریخ) کی سند لی۔ لکھنے کا شوق ہوا، تو ابتدا میں مدّتوں، یادش بخیر، نیرنگ خیال (لاہور)، زمانہ (کانپور) ہفتہ وار آریہ گزٹ (لاہور) وغیرہ میں تاریخی موضوعات پر لکھتا رہا۔

مجھے شروع سے دنیا کے مختلف ممالک کی قدیم تاریخ سے بہت دلچسپی رہی ہے۔ میں بی اے کے درجے میں تھا (۱۹۲۶ء - ۱۹۲۸ء) جب میں نے پہلی مرتبہ حمورابی کا نام پڑھا۔ اور معلوم ہوا کہ دنیا کا قدیم ترین قانون (آیئن) اسی کا نافذ کردہ ہے۔ لیکن یہ شناسائی علیک سلیک سے آگے نہیں بڑھی۔ تعارف بہت سرسری رہا۔ محفلِ غیر میں گاہے، سرِ راہے گاہے۔ دراصل اس زمانے میں اس کے بارے میں کچھ زیادہ چھپا بھی نہیں تھا۔ اب تو ایک پورا کتابخانہ جمع ہو گیا ہے۔

تعلیم ختم کرنے کے بعد پانچ چھے برس اِدھر اُدھر ہرزہ گردی میں گذرے۔ اور پھر ۱۹۳۶ء میں حکومتِ ہند کی ملازمت میں شامل ہو گیا۔ دو تین برس بعد (۱۹۳۹ء میں) ملک سے باہر بھیج دیا گیا۔ کارِ منصبی کی بجا آوری کے سلسلے میں ڈھائی تین برس کے لیے (۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۲ء تک) میرا قیام عراق میں رہا۔ ہمارا دفتر بغداد میں تھا، لیکن ملک کے مختلف شہروں کا دورہ روز کا معمول تھا۔

یہاں پھر حمورابی کا نام سننے میں آیا، اور اب کے ذرا زیادہ سنجیدگی سے۔ وہ عراق ہی کا حکمران تھا اور بابل اس کا دارالسلطنت تھا۔ عراقی محکمۂ آثارِ قدیمہ نے بابل کے آثار کھود نکالے ہیں۔ یہ کھنڈرات فرات کے اُس طرف ۵۰-۵۵ میل کے فاصلے پر ہیں۔ ایک چھٹی کے دن جی میں آئی کہ کیوں نا، بابل کے کھنڈرات دیکھے جائیں۔ چنانچہ میں نے گاڑی لی اور ڈیڑھ دو گھنٹے میں بابل پہنچ گیا۔

میں دن بھر اُس ویرانے میں گھومتا رہا؛ کچھ گرد اور ریت اپنے سر پر ڈالی، کچھ حلق میں اُتاری، اور مختلف پہلوؤں سے شہر دیکھتا رہا۔ میں نے تصوّر میں یہ دیکھا کہ ممکن ہے، کبھی حمورابی بھی اس جگہ پھرتا رہا ہو۔ اس خیال سے عجیب سُرور حاصل ہوا۔ جب بغداد واپس پہنچا، تو فیصلہ کیا کہ بابلِ قدیم کی تاریخ کا تفصیلی مطالعہ کرنا چاہیے۔ ان بیس برس میں اس موضوع پر بہت کچھ شائع ہو چکا تھا۔ اگلے دن میں نے کتاب خانے سے کچھ کتابیں نکلوائیں۔ انھیں دیکھا اور ان کی مدد سے ایک اچھی لمبی مآخذ کی فہرست مرتّب کی۔ اور انگلستان اور امریکا دوستوں کو لکھا کہ ان میں سے جو کتابیں چھپا ہو سکتی ہیں، ان کے بھیجنے کا انتظام کیا جائے۔

غرض میں نے چند مہینوں میں حمورابی، اس کے قانون، اور قدیم بابلی تہذیب و تمدّن سے متعلق اچھی خاصی واقفیت بہم پہنچالی۔ لیکن یہ ساری تگ و دَو اپنے اسی تاریخ کے شوق کی تسکین کے لیے تھی، اس موضوع پر لکھنے کا میرا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

---

* یاد رہے کہ یہ آج سے ۴۰-۴۲ برس پہلے کا ذکر ہے۔ آج تو عراق حکومت نے اس کا نقشہ ہی بدل دیا ہے

انجمن ترقی اردو (ہند) کے سکتر ڈاکٹر مولوی عبدالحق مرحوم نے پاکستان جانے کے بعد وہاں پاکستان انجمن (کراچی) سے ایک تماہی رسالہ "تاریخ وسیاسیات" نام کا جاری کیا تھا۔ اس کی ترتیب وتدوین قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی کے ذمے تھی۔ میری قاضی صاحب مرحوم سے بھی اچھی خاصی راہ ورسم تھی۔ ایک دن ان کا خط ملا کہ مولوی صاحب کی اور میری درخواست ہے۔ کہ آپ اس رسالے کے لیے مضمون لکھیے۔ چونکہ میں ان دنوں بابل اور حمورابی میں الجھا ہوا تھا اور یہ موضوع میرے ذہن پر سوار تھا، میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، حمورابی کے قانون کا اردو میں ترجمہ کر کے ان کی خدمت میں بھیج دیا۔ موصوف نے نہ صرف اس پر صاد کیا، بلکہ لکھا کہ مولوی صاحب (عبدالحق) نے بھی اسے بہت پسند کیا ہے۔ غرض دونوں نے حوصلہ افزائی کرتے ہوئے اس موضوع پر مزید مضامین لکھنے کی فرمایش کردی۔

اس پر میں نے چند مضامین قلمبند کیے، جو "تاریخ وسیاسیات" میں شائع ہوتے رہے۔ افسوس کہ دو تین سال بعد اس رسالے نے دم توڑ دیا۔ اِلّاماشاءاللہ، اتنا سنجیدہ اور ثقیل پرچہ آج بھی اردو خوانوں کے حلق سے بآسانی نہیں اترتا، چالیس برس اُدھر کیا صورت تھی، آپ اس کا تصوّر کرسکتے ہیں۔ "تاریخ وسیاسیات" بند ہوجانے کے باعث اس سلسلے کا آخری مضمون (بابلی زبان وادبیات) تماہی اردو، کراچی میں شائع ہوا تھا۔ یہ ساری داستان، میں نے اس لیے بیان کی ہے کہ جہاں آپ کو میرے میرو غالب کو چھوڑ کر حمورابی تک پہنچ جانے کی وجہ معلوم ہو، وہیں اس کتاب کا شانِ نزول بھی محفوظ ہو جائے۔

(۲)
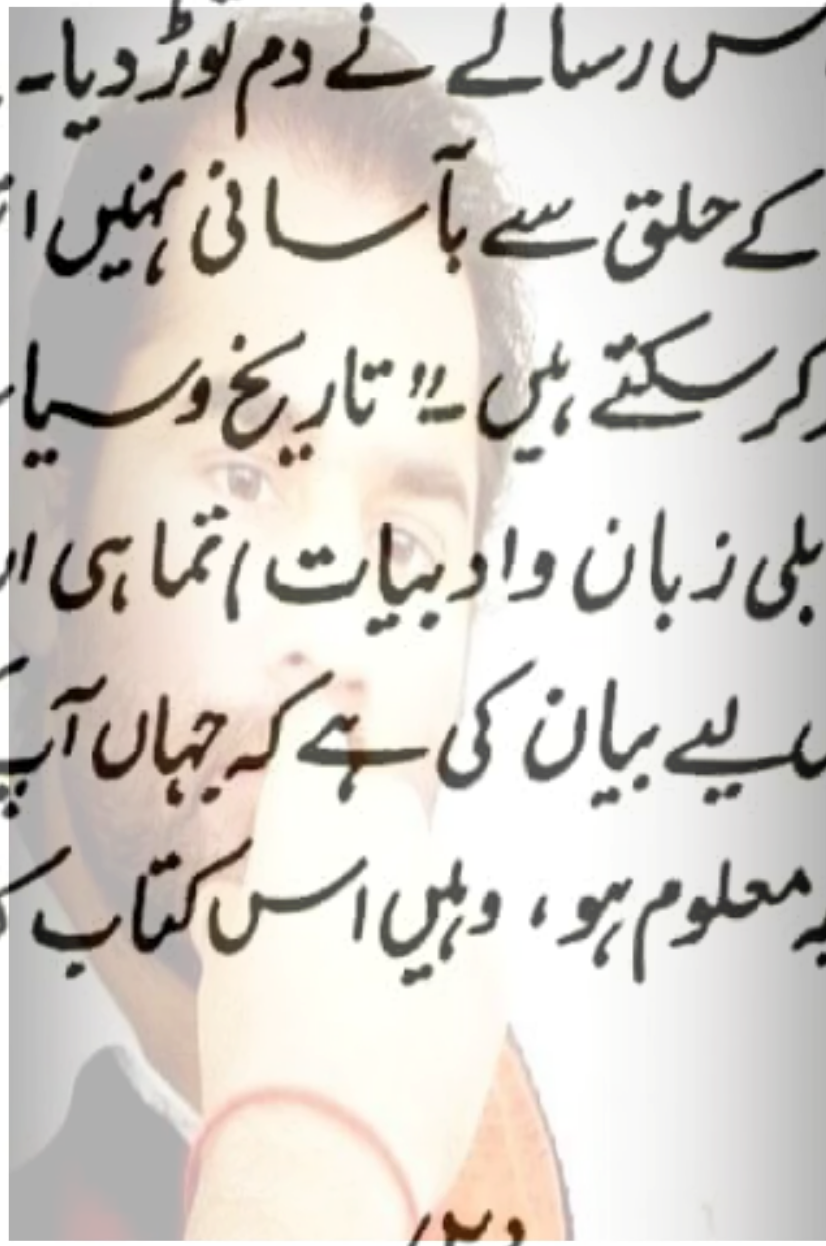
اس کے بعد میں اَور اَور اطراف میں نکل گیا۔ یہ حقیقت ہے کہ میں ان مضامین کو بھول چکا تھا۔ گذشتہ ۳۰-۳۵ برس میں میری دسیوں کتابیں منظرِ عام پر آئیں، لیکن کبھی ان مضامین کو جمع کرنے یا انھیں کتابی شکل میں شائع کرنے کا خیال بھی ذہن میں نہیں گذرا۔

پارسال ایک عزیز دوست آئے اور کہنے لگے: کسی زمانے میں تم نے حمورابی اور بابل قدیم

سے متعلق کچھ مضمون لکھے تھے، وہ کیا ہوئے؟ مجھے ایک ضرورت سے حمورابی کا قانون دیکھنا ہے۔ میں نے حقیقتِ حال بیان کی، تو وہ بہت خفا ہوئے۔ فرمایا: اس موضوع پر آج تک اردو میں کچھ نہیں لکھا گیا۔ اور تم نے ایسے نادر موضوع پر لکھا، اور پھر ان مضامین کو یوں ضائع کر دیا۔ انھوں نے اصرار کیا کہ انھیں فوراً جمع کر کے کتابی شکل میں چھاپ دیا جائے۔

اب مشکل یہ تھی کہ نہ ان مضمونوں کی اصل میرے پاس تھی، نہ نقل۔ ملا کی دوڑ مسجد تک کے مصداق، پاکستان میں میری صرف ایک مسجد ہے اور اس کا نام مشفق خواجہ ہے۔ چنانچہ میں نے انھیں کراچی خط لکھا کہ کہیں سے "تاریخ و سیاسیات" کے پرانے پرچے تلاش کر کے ان مضامین کے عکس فراہم کیجیے۔ خوش قسمتی سے اس رسالے کا مکمل فائل ان کے ذاتی کتب خانے میں موجود ہے۔ انھوں نے عکس بھجوا دیے، جس کے لیے میں ان کا تہِ دل سے شکر گزار ہوں۔ میں نے ان پر ایک نظر ڈالی، اور یوں آج یہ کتاب آپ کے پیشِ نظر ہے۔ فالحمد للہ

(۳)

اس کی ضرورت نہیں کہ میں بابلی تہذیب و تمدن کی اہمیت کے بارے میں کسی تفصیل سے لکھوں۔ "مشک"، آپ کے سامنے ہے، آپ خود فیصلہ کر لے سکتے ہیں، "عطار" غریب کیا کہیگا! دنیا کے علم و فن، آئین و قوانین، حکومت کے نظم و نسق، مذہب، معاشرت ــ غرض زندگی کے ہر شعبے کی تشکیل و ترقی اور ترویج میں بابل کا جو مقام رہا ہے، اس پر بڑی وقیع اور قیمتی کتابوں کی ایک کھیپ کی کھیپ لکھی جا چکی ہے، اور یہ سب آسانی سے مہیا ہیں۔

ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ آج ہم جس مقام تک پہنچے ہیں، اس میں بابل کا کتنا حصہ ہے۔ کیا اس کے آثار اور ان پر غور و فکر کی آج کچھ معنویت ہے، اور ہم کس حد تک اپنے مستقبل کی ترقی و تشکیل میں اس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ پرانی تاریخ کے مطالعے کا یہی مقصد ہے اور اسی میں اس کی افادیت ہے۔

قرآن میں بار بار دنیا کے مختلف ملکوں کی سیروسیاحت کی ترغیب دی گئی ہے۔ جیساکہ اس کے اصلی مقصد اور موضوع کے پیشِ نظر امید کی جاسکتی ہے، اس میں بیشتر مقامات پر عبرت اور سبق حاصل کرنے کی ہدایت ہے کہ دیکھو، جن لوگوں نے حق کے قبول کرنے سے انکار کیا، ہمارے انبیاء کی تکذیب کی، ان کا کیا حشر ہوا! قانونِ فطرت یکساں ہے۔ زمان و مکان کی تبدیلی سے نہ یہ قانون بدلتا ہے، نہ اس کا نتیجہ مختلف ہوجاتا ہے۔ گندم سے گندم پیدا ہوگی اور جَو سے جَو۔ آگ جلائیگی اور پانی ہر چیز کو گیلا کردیگا۔ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا (۳۵: ۴۳)۔ پس، تم بھی کُفر سے باز آجاؤ، ورنہ تمھارا انجام بھی ان گذشتہ اقوام کا سا ہوگا۔

لیکن عبرت حاصل کرنے اور حق کی قبولیت کی ترغیب دینے کے علاوہ اس سیر و تفریح کے کچھ اور مقاصد بھی ہیں۔ مثلاً اگر کسی کے دل میں دوسروں کی ترقی و تموّل کے باعث حسد پیدا ہو، تو وہ چل پھر کر دیکھے کہ کامیابی کن اسباب سے حاصل کی جاسکتی ہے۔ اگر وہ ناکام رہا ہے، اور مقابلے کے میدان میں دوسروں سے پیچھے رہ گیا ہے، تو کہیں یہ خود اس کی اپنی کسی خامی کا نتیجہ تو نہیں ہے! یا ممکن ہے کہ اس نے اپنی صلاحیتوں کا ٹھیک استعمال نہ کرتے ہوئے پوری پوری کوشش ہی نہ کی ہو۔ اسی کو غالب نے ایک شعر میں یوں بیان کیا ہے:

حسد سے دل اگر افسردہ ہے، گرمِ تماشا ہو
کہ چشمِ تنگ، شاید کثرتِ نظارہ سے وَا ہو

نیز ان مختلف مقامات اور اقوام کے دیکھنے اور مطالعے سے انسان یہ سوچنے پر مجبور ہوگا کہ ہمارے یہ پیشرو کیسے لوگ تھے، ان کا رہن سہن اور معاشرت کیسی تھی، کن اشغال و اعمال سے انھیں کامیابی اور ترقی نصیب ہوئی اور ان کے کونسے افعال ایسے تھے، جو غلط تھے، اور جن کے ارتکاب سے انھیں ناکامی کا مُنھ دیکھنا پڑا۔ اور اس سارے کا مقصد یہ ہے کہ ہم کن باتوں میں ان کا تتبّع کرکے اپنی عاقبت سنوار سکتے ہیں اور کن چیزوں سے احتراز کرکے ناکامی سے بچ سکتے ہیں۔ دوسرے

لفظوں میں ان کی کونسی باتوں پر ہم ترقی دے سکتے ہیں جو فلاح و بہبود کے حصول میں ہماری ممد و معاون ہو سکتی ہیں۔

بابلی تہذیب کا بھی اسی نقطۂ نظر سے مطالعہ کرنا چاہیے کہ کیا اس میں ہمارے غور و فکر کے لیے کوئی سامان ہے یا نہیں ؟

نئی دلی
یکم اکتوبر ۱۹۹۲ء

مالک رام

پہلا باب

قانونِ حمورابی

۱۸۹۷ء میں فرانس کی "وزارتِ تعلیم و فنونِ لطیفہ" نے فیصلہ کیا کہ ایران کے شہر سُوس ایک علمی مہم بھیجی جائے، جو وہاں جا کے آثارِ قدیمہ کی کھدائی کا کام کرے۔ سُوس (پرسی پولس) ایران کا ایک قدیم شہر ہے۔ دانیال نبی کی کتاب میں اس کا نام شوشن دیا ہے (۸ : ۲)۔ یہ شہر کسی زمانے میں تہذیب و تمدّن کا مشہور مرکز رہا ہے۔ فارسیوں سے پہلے یہ عیلامی قوم کی سرگرمیوں کی جولانگاہ رہا تھا، اس لیے فرانسیسی وزارتِ تعلیم کو بجا توقع تھی کہ یہاں کے کھنڈروں سے تاریخ کے اُس تاریک دور کے لیے روشنی کا سامان مہیّا ہونا چاہیے، جو اب تک ہماری نظروں سے اوجھل ہے۔ بارے انھیں مایوسی سے دوچار نہیں ہونا پڑا۔ مہم کو غیر معمولی کامیابی نصیب ہوئی اور چار برس بعد وہ علمی اور فنّی خزانوں سے مالا مال ہو کر وطن واپس آئی۔ لیکن یہ خدا کی دین ہے کہ یہاں انھیں ایک ایسی چیز ملی جس کی تلاش میں وہ نہیں آئے تھے۔ وہ آئے تھے ایران کے آثارِ قدیمہ کی جستجو میں، اور یہاں انھیں دستیاب ہوا ایک ایسا علمی دفینہ، جس کا سرزمینِ ایران سے یا فارسیوں اور عیلامیوں سے دور کا بھی تعلق نہیں تھا۔

دسمبر ۱۹۰۱ء کے ایام تھے۔ جاڑے کا موسم اپنے شباب پر تھا۔ سردی سے ٹھٹھرے ہوئے مزدور بیدلی سے اپنا کام کر رہے تھے کہ اچانک ایک مزدور کا پھاوڑا کسی سخت چیز سے ٹکرایا۔ جب احتیاط سے مٹی ہٹائی گئی، تو بطنِ زمین سے ایک کالے کلوٹے پتھر کا بڑا سا ٹکڑا برآمد ہوا۔ تھوڑے

دن بعد (جنوری ۱۹۰۲ء) اس جگہ سے ہٹ کے تھوڑی دور پرے کھدائی کرتے ہوئے اسی پتھر کے دو اور ٹکڑے ملے۔ جب ان تینوں کو جوڑا گیا، تو معلوم ہوا کہ یہ ایک ہی کھمبے کے حصے ہیں۔ اس کی شکل مخروطی تھی۔ سات فٹ چار انچ لمبائی میں اور کم و بیش دو فٹ گھیر میں۔ اس کے سامنے اور پشت کے رُخ پر بابل کے قدیم میخی رسم الخط میں کچھ تحریر دکھائی دی۔ اس مہم کے قائد موسیو مورگاں تھے۔ اور اُن کے ساتھ کتبہ خوانی کے فرائض انجام دینے کے لیے اس زمانے کے مشہور ماہر اشوریات موسیو شیئل تھے۔ انھوں نے ایک ہی نظر میں اس کتبے کی اہمیت بھانپ لی اور فوراً کام پر جُت گئے۔ انھوں نے پہلے اس طویل کتبے کو پڑھا، جو بجائے خود ایک عظیم الشان اور قابلِ تعریف کارنامہ تھا۔ پھر اس کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ کیا۔ حکومتِ فرانس نے اس کی اہمیت کو مدِنظر رکھتے ہوئے اسی سال (۱۹۰۲ء) اصل کتبے اور اس ترجمے کو کتابی صورت میں شائع کر دیا۔

حضرت مسیح ناصری علیہ السّلام سے تقریباً دو ہزار سال پہلے بابل (عراق) کا ایک بادشاہ حمورابی نام ہوا ہے۔ یہ حضرت ابراہیم علیہ السّلام کا ہمعصر تھا؛ عہد نامۂ قدیم میں اس کا ذکر آیا ہے۔ اس نے ایک قانون نافذ کیا۔ اور اسے ایک پتھر کے کھمبے پر کندہ کروا کے سپارہ کے مندر کے احاطے میں کھڑا کر دیا۔ سپارہ اس جگہ تھا، جہاں آج کل بغداد کے جنوب میں ۳۰-۴۰ میل کے فاصلے پر ابوحبہ گاؤں کے ٹیلے ہیں۔ یہ کھمبا ایک ہزار برس کے لگ بھگ اس مندر کی زینت رہا، حتیٰ کہ حضرت مسیحؑ سے تقریباً گیارہ سو برس قبل عیلامی بادشاہ شتروک نخنت بابل پر حملہ آور ہوا۔ بابلیوں کو شکست فاش ہوئی۔ فاتح نے اپنی فتح و نصرت کا ایک مادی نشان یہ پسند کیا کہ اس کھمبے کو سپارہ سے اپنے دارالخلافہ سوسہ منتقل کیا۔ دونوں مقاموں کے درمیان دو سو میل کا فاصلہ ہے۔ وہ تو کہیے کہ کھمبا ایسا بڑا یا بوجھل نہیں تھا، ورنہ ممکن ہے کہ جو مشکل فیروز شاہ تغلق کو اشوک کا کھمبا فیروز آباد لے جانے میں پیش آئی تھی، شتروک نخنت کو بھی اسی کا سامنا کرنا پڑتا۔

موسیو شیئل کو خوش قسمتی سے یہی کھمبا سُوس کے کھنڈروں میں مل گیا۔ اصلی کھمبا پیرس کے مشہور عجائب گھر لُوور کی زینت ہے۔ اس کا ایک نہایت نفیس اور روشن چربہ برٹش میوزیم لندن میں

موجود ہے اور دوسرا بغداد کے متحفِ آثارِ قدیمہ میں۔ اس کی چوٹی پر حمورابی کی کھڑی تصویر ہے، جس میں وہ کرسی پر بیٹھے ہوئے شمس دیوتا سے قانون لے رہا ہے۔ شمس انسانوں اور دیوتاؤں، دونوں کے لیے سب سے بڑا مقنن اور جج خیال کیا جاتا تھا۔ تصویر کے نیچے سامی بابلی زبان میں جو ان دنوں اکدی کہلاتی تھی، کتبہ ہے۔

یوں معلوم ہوتا ہے کہ حمورابی کی بددعاؤں کے باوجود کسی شخص نے اس کتبے کو مٹانے کی کوشش کی تھی۔ سامنے کے رُخ پر صرف سولہ (۱۶) کالم ہیں۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم پانچ (۵) اور تھے جو مٹا دیے گئے ہیں۔ افسوس ہے کہ اس طرح متن کا کافی حصہ ضائع ہوگیا۔ لیکن حُسنِ اتفاق سے اس میں سے کچھ حصہ اور ماخذوں سے مل گیا ہے۔ پشت پر پورے اٹھائیس (۲۸) کالم صحیح وسالم موجود ہیں اور دو ایک جگہ کو چھوڑ کر پوری تحریر آسانی سے پڑھی جا سکتی ہے اور اس کے لیے بھی پتھر کی ساخت کا قدرتی نقص ذمہ دار ہے، نہ کہ کندہ کرنے والے کا قلم۔ اندازہ ہے کہ پورے کتبے میں (۴۹) کالم تھے۔ ان میں چار ہزار سطریں تھیں اور تقریباً آٹھ ہزار جملے۔ تاریخی اور علمی لحاظ سے اس کتبے کی قیمت اور اہمیت کا کما حقہ اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ آج سے چار ہزار سال پہلے کی کسی تحریر کا دستیاب ہو جانا، جس کی صحت میں کسی قسم کا شبہہ نہ ہو، جو مصنف کے اپنے لفظوں میں ہو اور جس میں تحریف اور حذف و اضافہ کا گمان تک نہ ہو سکے، اپنی قسم کی بےنظیر مثال ہے۔ اسی کتبے کا ترجمہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔ آیندہ صفحات میں، اس کی روشنی میں، اس زمانے کی تہذیب و تمدن، مذہب و معتقدات، علمی اور ادبی سرگرمیوں وغیرہ پر روشنی ڈالی جائیگی۔

اصل کتبہ ایک مسلسل عبارت ہے۔ تمہید اور خاتمے کے علاوہ دفعات کی تقسیم بھی موسیو شیئل نے کی تھی۔ اگرچہ ان کی تقسیم ہر جگہ درست نہیں اور اس پر آسانی سے نظرثانی کی جا سکتی ہے، اس کے باوجود میں نے بھی انھیں کے نمبر قائم رکھے ہیں، تاکہ اگر ناظرین میں سے کوئی صاحب مقابلہ کرنا چاہیں تو انھیں مشکل نہ پیش آئے۔ البتہ ان کی کتاب میں ایک چھاپے کی غلطی کے باعث دو دفعات کا نمبر ۱۷۶ دیا گیا تھا۔ یہاں انھیں ۱۷۶ (الف) اور ۱۷۶ (ب) کے نمبروں سے ظاہر کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ میں نے سہولت کے لیے مضمون کی مناسبت سے بغلی سرخیوں کا اضافہ کر دیا ہے۔

۱۔ تمہید

جب انونا کی کے حکمران، صاحبِ عظمت انو نے اور آسمان اور زمین کے مالک بعل نے جو کائنات کی تقدیر کا کرتا دھرتا ہے، بنی نوعِ انسان کے گروہ کو، قانون کے ربانی محافظ اور ایا کے پلوٹھے، مردوخ کے سپرد کیا، تو گویا اسے انجیجی میں سربلند کیا اور انھوں نے اس کے پاک نام کو بابل میں، جو روئے زمین کی ملکہ ہے، مشہور کیا، اور اس کے لیے اس مملکت میں ایک ایسی ابدی پادشاہی قائم کی، جس کی بنیادیں زمین اور آسمان کے ساتھ ہمیشہ قائم رہنے والی ہیں۔

اس کے بعد انو اور بعل نے مخلوق کا دل خوش کرنے کو، مجھ شہرۂ آفاق پادشاہ اور خداترس حمورابی کو مامور کیا، کہ زمین پر عدل قائم کرو، فرومایوں اور شریروں کو نیست و نابود کردو، زبردستوں کو زیردستوں پر ظلم کرنے سے باز رکھو، تاکہ میں ان فرزندانِ تاریکی کے سروں پر سورج دیوتا کی طرح چمکوں اور زمین کو نور سے بھر دوں۔

میں ہوں، حمورابی، بعل کا منتخب گڈریا، خوشحالی اور فراوانی تقسیم کرنے والا، نفور اور دورانجی کو تکمیل تک پہنچانے والا، ای دور مندر کا فیاض دل نگہبان۔

سورما پادشاہ، جس نے اریدو کو دوبارہ اس کی قدیم عظمت پر بحال کیا ہے اور ای ابسو دھرم کو آلائشوں سے پاک کیا ہے۔

چار کھونٹ کا فاتح، بابل کی شہرت کا بڑھانے والا، اپنے آقا مردوخ کا دل خوش کرنے والا، جس کی وہ روزانہ ای سجیلہ کے مندر میں خدمت کرتا ہے۔

اور شہر کو نعمتوں سے مالا مال کرنے والا، سن دیوتا کی برکت سے پیدا شدہ شاہزادہ ای جشنغل پر دولت کی بارش کرنے والا ناچیز پجاری۔

مصلحت اندیش پادشاہ، عظیم الشان شمس کا لاڈلا، سبارآکا بانی، ملکات کے روضوں کو سرسبز

کرنے والا، ای ببرّا کی فلک بوس، شاندار عمارت کا تعمیر کرنے والا۔

لارسا کا انتقام لینے والا سورما، اپنے حامی شمس کی عظمت کی نشانی یعنی ای ببرّا مندر کا بحال کرنے والا۔

پادشاہ، جس نے اریخ کے باشندوں کو وافر پانی مہیا کر کے انھیں نئی زندگی دی ہے. جس نے ای اَنّا کا مندر بلند کیا ہے، جس نے انو اور عشتار پر دولت و ثروت کی بارش کی ہے۔

ملک کا محافظ، جس نے نسین کے پراگندہ باشندوں کو پھر سے یکجا کیا ہے، جس نے ای جلما مندر میں مال و دولت کے ڈھیر لگا دیے ہیں۔

شہر کا محافظ پادشاہ، زمامہ دیوتا کا بھائی، جس نے کِش کی نوآبادی قائم کی ہے، جس نے ای میت ارسج، کو شان و شوکت کی چادر اڑھا دی ہے، ای ہر سج کلمہ کے مقدّس ملبوسات کی نگہبان دیوی، عشتار کے عظیم الشان مندروں کا آراستہ کرنے والا۔

دشمنوں کا جان لیوا، جس کی مدد سے فتح حاصل کی جاتی ہے، جس نے کوثہ کو وسیع کیا ہے اور ای مشلام مندر کو ہر پہلو سے ترقی دی ہے۔

مست اور تنومند سانڈ، جو دشمن کو پچھاڑ دیتا ہے، توتو کا پیارا، بورسیپا کا دلارا، عالی منزلت، ای زدا مندر کا ان تھک خادم۔

مقدّس شہری پادشاہ، صاحبِ عقل، ہوشیار، جس نے دِل بَت کی نوآبادیوں کو وسعت دی ہے، جس نے عظیم الشان شہر نِنَب کے لیے غلّہ جمع کیا ہے۔

عصا و تاجِ شاہی کا مالک، جسے دانا ماما دیوی نے پیدا کیا ہے، جس نے کِش کی سرحدوں کو بڑھایا ہے، جو ننتو میں پاک بھینٹ چڑھاتا ہے۔

وہ دور اندیش، جس نے پیش بینی سے لاغاش اور غرسو کے لیے چراگاہیں اور پانی کے گھاٹ بنائے، جس نے ای ننو میں قیمتی چڑھاوے چڑھائے۔

دشمنوں کو گرفتار کرنے والا، تیلیتم کا برگزیدہ، حلاّب کی پیش گوئیوں کو پورا کرنے والا، جو آنونت کے دل کو مسرور کرتا ہے۔

صالح پادشاہ، جس کی دعائیں اداد دیوتا سنتا ہے، جو کراکر کے سورما اداد کے دل کو خوش کرتا ہے،

جس نے ای اُنجل جل کے جہازوں کو چلایا ہے۔

بادشاہ، جس نے ای تُخ کے مندر کے پجاری ادب کی جان بخشی کی ہے۔

شہر کا شاہی چوپان، بے عدیل پہلوان، جس نے مُشکن نُبشری کو زندگی بخشی ہے، جس نے مُشلَم کے مندر کو خوشحالی عطا کی ہے۔

عاقل اور مردِ میدان، جس نے ڈاکوؤں کو زیر کیا ہے، جس نے مالکد کے باشندوں کو خطرے میں پناہ دی اور ان کے لیے بڑی تعداد میں رہنے کے مکان تیار کیے جس نے ایا اور دمجل نُونا کے لیے دائمی پاک چڑھاوے کا انتظام کیا، کیوں کہ انھوں نے اس کی سلطنت کی شوکت بڑھائی ہے۔

شہر کا شاہی حاکم، جس نے اپنے خالق داجن کی مدد سے دریاے فرات کے کنارے کے ضلاع کو زیر کیا ہے، جس نے میرا اور ٹُتول کے لوگوں کو انعام بخشے ہیں۔

نامور بادشاہ، جس نے عشتار کا چہرہ منور کر دیا ہے، جس نے ننازو کے سامنے رزقِ حلال پیش کیا ہے، جو کال کے زمانے میں اپنی رعایا کو خوراک مہیا کرتا ہے اور امن کے زمانے میں، بابل کے مضافات میں ان کے مال کی حفاظت کرتا ہے۔

بنی نوع انسان کا گلّہ بان، خادم جس نے انونت کو اجادی کے نواح میں ای اولماشش کے مندر میں متمکن کیا۔

عدل و انصاف پھیلانے والا، رعایا کا رہنما، جس نے اشور کے سر پرست معبود کو پھر سے وہاں قائم کیا ہے۔

دشمنوں کا قلع قمع کرنے والا، جس نے نینوا کے ای مِشمش مندر میں عشتار کا نام چمکایا ہے۔

بلند مرتبے والا، مقدس دیوتاؤں کے حضور عاجز، سمولا ایل کا نام لیوا، سمولیت کا جگر گوشہ، ملوکیت کا ستونِ اعظم، صاحبِ جبروت بادشاہ، بابل کا سورج، سومر اور اکد کو منور کرنے والا حکمران جس کی چار کھونٹ میں اطاعت کی جاتی ہے، عشتار دیوی کا دُلارا، وہ میں ہوں۔

جب مردوخ نے مجھے نظم و نسق اور رہنمائی کے لیے بنی نوعِ انسان پر حکمران مقرر کیا تو میں نے لوگوں کی بہبودی کے لیے ملک میں یہ آئین و قوانین جاری کیے۔

۲- قانون

بد دعا

۱۔ اگر کوئی شخص کسی کو بد دعا دے کہ اس پر مستقل عذاب مسلط ہو جائے اور ایسا کرنے کے لیے اس کے پاس کوئی معقول وجہ نہ ہو تو بد دعا دینے والے کی سزا قتل ہے۔

جادو

۲۔ اگر کوئی شخص کسی پر جادو کر دے اور ایسا کرنے کے لیے اس کے پاس کوئی معقول وجہ نہ ہو، تو جس شخص پر جادو کیا گیا ہے، وہ مقدس دریا پر جائے اور اس میں غوطہ لگائے۔ اگر وہ مقدس دریا میں ڈوب جائے، تو جادو کرنے والا اس کا مکان لے لے۔ اور اگر مقدس دریا اسے بیگناہ ٹھہرائے اور وہ زندہ بچ کے نکل آئے، تو جادو کرنے والے کی سزا قتل ہے۔ مزید یہ کہ جس نے دریا میں غوطہ لگایا تھا، وہ جادو کرنے والے کا مکان لے لے۔

شہادت

۳۔ اگر کوئی شخص کسی مقدمے میں جھوٹی گواہی دے اور جو کچھ اس نے کہا ہے، اس کے لیے اس کے پاس کوئی معقول عذر نہ ہو، اور اس مقدمے میں کسی کی جان خطرے میں ہو، تو اس گواہ کی سزا قتل ہے۔

۴۔ اگر اس نے غلے یا چاندی سے متعلق گواہی دی ہے، تو جتنے تاوان کا مطالبہ ہے، اتنی رقم بطور جرمانہ اس سے وصول کی جائے۔

قاضی کی ذمہ داری

۵۔ اگر کوئی قاضی کسی مقدمے کی سماعت کرنے اور فیصلہ کرنے کے بعد تحریری حکم سنا دے اور

بعد کو معلوم ہو جائے کہ یہ فیصلہ غلط تھا۔ اور یہ بھی ثابت ہو جائے کہ اس غلط فیصلے کے لیے قاضی عمداً ذمہ دار تھا، تو مقدّمے میں جتنا جرمانہ کیا گیا تھا، اس کا بارہ گنا اس قاضی سے وصول کیا جائے۔ نیز علی الاعلان عوام کے سامنے اُسے اس کے عہدے سے برخاست کر دیا جائے۔ نہ اسے بحال کیا جائے، نہ کبھی وہ دوسرے قاضیوں کے ساتھ مل کر کسی مقدّمے کی سماعت کرے۔

سرقہ

۶۔ اگر کوئی شخص کسی دیوتا (کے معبد) یا حویلی کا سامان چوری کرے، تو اس کی سزا قتل ہے۔ اور جو شخص اس سے چوری کا مال خریدے وہ بھی قتل کر دیا جائے۔

۷۔ اگر کوئی آدمی کسی دوسرے شخص کے بچے یا غلام سے، ولی کی غیر حاضری میں، یا اقرار نامہ لکھے بغیر، چاندی یا سونا یا غلام یا لونڈی یا بیل یا بھیڑ یا گدھا یا کوئی اور چیز خریدے یا بطور بیعانہ قبول کرے، تو وہ آدمی چور تصوّر کیا جائیگا۔ اسے قتل کر دیا جائے۔

۸۔ اگر کوئی آزاد شدہ غلام، کسی مندر یا حویلی کا بیل یا بھیڑ یا گدھا یا سؤر یا کشتی چوری کرے، تو وہ اس کی قیمت کا تیس گنا جرمانہ ادا کرے۔ اگر وہ آدمی طبقہ عوام میں سے ہو، تو وہ دس گنا جرمانہ ادا کرے۔ اگر چور کے پاس جرمانہ ادا کرنے کو کچھ نہ ہو، تو اسے قتل کر دیا جائے۔

گم شدہ مال

۹۔ اگر کسی آدمی کی کوئی چیز گم ہو جائے اور وہ اسے کسی دوسرے کے قبضے میں پائے، تو اگر وہ شخص کہے کہ "ایک بیچنے والے نے (یہ چیز مجھے بیچی تھی اور میں) نے اسے پنچوں کی موجودگی میں خریدا ہے۔" اور مدّعی کہے کہ "میں ایسے گواہ پیش کر سکتا ہوں، جو میرا مال شناخت کر سکتے ہیں" تو خریدار فروخت کرنے والے کو پیش کرے اور ان پنچوں کو بھی جن کے سامنے سودا ہوا تھا۔ اور مدّعی اپنے گواہ پیش کرے، جو اس کی گم شدہ چیز کی شناخت کریں۔ قاضی فریقین کی شہادت کو جانچے۔ پنچ اور اس چیز کے شناخت کرنے والے گواہ، جو کچھ ان کے علم میں ہے، اسے خدا

کو حاضر و ناظر جان کر بیان کریں۔ اس صورت میں فروخت کرنے والا چور متصوّر ہوگا، اس کی سزا قتل ہے۔ مدّعی کو اس کا گمشدہ مال واپس دیا جائے اور خریدار نے جو قیمت ادا کی تھی، وہ اسے بیچنے والے مجرم کی جایداد سے دلائی جائے

۱۰۔ اگر خریدار، بیچنے والے کو پیش نہ کر سکے، جس سے اس نے مال لیا تھا، نہ پنچوں کو، جن کی موجودگی میں خریدا تھا، لیکن مدّعی اپنے گواہ حاضر کر دے، جو مال شناخت کر لیں، تو خرید نے والا چور متصوّر ہوگا۔ اس کی سزا قتل ہے۔ مدّعی کا گم شدہ مال اس کے حوالے کر دیا جائے۔

۱۱۔ اگر مدّعی مال شناخت کرنے والے پیش نہ کرے، تو (ثابت ہوا کہ) اس کا دعویٰ بدنیتی پر مبنی تھا اور اس نے تہمت لگائی ہے، اس کی سزا قتل ہے۔

۱۲۔ اگر بیچنے والا فوت ہو چکا ہے، تو اس کے ترکے میں سے خریدار پنجگنی رقم بطور تاوان لینے کا حقدار ہے۔

۱۳۔ اگر پنچ کہیں دور (مقام پر) رہتے ہوں، تو قاضی (ان کو پیش کرنے کے لیے خریدار کو) چھ مہینے کی مہلت دے سکتا ہے۔ اگر چھ مہینے میں اس کے گواہ حاضر نہ ہوں تو (ثابت ہوا کہ) اس نے یہ کارروائی بدنیتی سے کی ہے۔ مقدّمے کا تمام خرچہ اس پر ڈالا جائے۔

۱۴۔ اگر کوئی شخص کسی کے نابالغ لڑکے کو چرائے تو اس کی سزا قتل ہے۔

سرکش لونڈی، غلام

۱۵۔ اگر کسی شخص کے بہکانے پر، کسی حویلی کا یا کسی عامی کا غلام یا لونڈی گھر سے بھاگ جائے، تو اس شخص کو قتل کر دیا جائے۔

۱۶۔ اگر کوئی شخص، کسی حویلی کے، یا کسی عامی کے سرکش غلام یا لونڈی کو اپنے گھر میں پناہ دے اور اسے سرکاری اہلکار کے حوالے نہ کرے، تو اس شخص کو قتل کر دیا جائے۔

۱۷۔ اگر کوئی شخص، کسی سرکش غلام یا لونڈی کو باہر کھلے میں پائے اور اسے واپس لا کے اس کے مالک کے حوالے کر دے، تو مالک اس شخص کو "دو شیکل" چاندی ادا کرے۔

۱۸۔ اگر وہ غلام یا لونڈی اپنے مالک کا نام نہ بتائے تو اسے مندر میں لایا جائے۔ وہاں اس کی گذشتہ

زندگی کی تفتیش کی جائے اور اسے اس کے مالک کے حوالے کیا جائے۔

۱۹۔ اگر وہ غلام، اس کے گھر میں پوشیدہ ملے اور اس کے قبضے سے گرفتار کیا جائے، تو اس شخص کی سزا قتل ہے۔

۲۰۔ اگر غلام، پکڑنے والے کے ہاتھ سے بھاگ جائے، تو وہ شخص مالک کے سامنے خدا کی قسم کھانے پر بیگناہ متصور ہوگا۔

نقب زنی

۲۱۔ اگر کوئی شخص کسی کے گھر میں سیندھ لگائے، تو اسے سیندھ کے منہ پر قتل کیا جائے اور اسی جگہ دفن کر دیا جائے۔

ڈکیتی

۲۲۔ اگر کوئی شخص ڈاکہ مارے اور گرفتار ہو جائے، تو اس کی سزا قتل ہے۔

۲۳۔ اگر ڈاکو گرفتار نہ ہو سکے، تو جس شخص کا نقصان ہوا ہے، وہ خدا کے سامنے اپنے نقصان کا دعویٰ پیش کرے اور جس علاقے اور حدود میں یہ چوری کی واردات ہوئی ہے، وہاں کی برادری اور پنچ اس کا سارا نقصان پورا کر کے دیں۔

۲۴۔ اگر (ڈاکے میں) جان کا نقصان بھی ہوا ہے، تو برادری اور پنچ مقتول کے وارثوں کو ایک "منّ" چاندی ادا کریں۔

۲۵۔ اگر کسی شخص کے گھر میں آگ لگ جائے اور کوئی دوسرا شخص جو اسے بجھانے کے لیے آئے، اس کے مال اسباب کو بری نظر سے دیکھے اور اسے (چرا کر) لے جائے، تو اس چور کو اسی آگ میں جھونک دیا جائے۔

فوجی ملازم

۲۶۔ اگر کسی مسلح سپاہی کو کارِ سرکار پر جانے کا حکم دیا جائے اور وہ خود نہ جائے، بلکہ کسی اور کو

اپنا قائم مقام بنا کر بھیج دے، تو وہ سپاہی قتل کر دیا جائے؛ اور وہ قائم مقام اس کے مکان پر قبضہ کر لے۔

۲۷۔ اگر کوئی مسلح سپاہی کارِ سرکار، سرانجام دیتا ہوا، بدقسمتی سے، قید ہو جائے اور (اس کی غیر حاضری میں) اس کا کھیت اور میوہ باغ، انتظام کے لیے کسی دوسرے شخص کے حوالے کیے جائیں، تو اپنے شہر میں واپس آنے پر، کھیت اور میوہ باغ اس سپاہی کو لوٹا دیے جائیں اور وہ خود ان کا انتظام کرے۔

۲۸۔ اگر کوئی مسلح سپاہی، کارِ سرکار سرانجام دیتا ہوا، بدقسمتی سے، قید ہو جائے اور اس کا بیٹا ان کا انتظام کر سکتا ہے، تو کھیت اور میوہ باغ اس کے حوالے کر دیے جائیں؛ اور وہ اپنے باپ کے کاروبار کی نگرانی کرے۔

۲۹۔ اگر اس کا بیٹا نابالغ ہو اور اپنے باپ کے کاروبار کی نگرانی نہ کر سکتا ہو، تو کھیت اور میوہ باغ کا ایک تہائی اس کی ماں کے حوالے کر دیا جائے اور اس کی ماں اس کی پرورش کرے۔

۳۰۔ اگر کوئی مسلح سپاہی اپنے کھیت اور میوہ باغ اور گھر بار کی نگرانی کرنے کی جگہ ان کی دیکھ بھال کرنے میں غفلت برتے اور کوئی دوسرا شخص، اس کے کھیت اور میوہ باغ اور گھر بار پر قبضہ کر لے اور تین سال تک ان کی نگہداشت کرتا رہے، تو وہ سپاہی واپس آ کر چاہے کہ اپنے کھیت اور میوہ باغ میں ہل چلائے اور گھر بار پر قبضہ جمائے، تو یہ اسے واپس نہیں دیے جائینگے، بلکہ جس کے قبضے میں وہ ہیں اور جو ان کا انتظام کرتا رہا ہے، وہی بدستور ان سے نفع اٹھاتا رہیگا۔

۳۱۔ اگر اس سپاہی نے دیکھ بھال میں صرف ایک سال کے لیے غفلت کی ہو اور اس کے بعد وہ لوٹ آئے، تو کھیت اور میوہ باغ اور گھر بار اسے واپس دے دیے جائیں اور وہ ان کا انتظام کرے۔

۳۲۔ اگر کوئی مسلح سپاہی کارِ سرکار کرتا ہوا قید ہو جائے اور کوئی تاجر، زرِ رستگاری ادا کر کے اس کو چھڑا لے اور اس کے شہر میں واپس لے آئے، تو اگر اس کے گھر میں فدیہ کی رقم ادا کرنے کے لیے کافی سامان ہے، تو وہ اپنی آزادی کے لیے خود (اس تاجر کو) ادا کرے۔ اگر اس کے گھر

میں کافی نہیں، تو شہر کا مندر ادا کرے۔ اگر مندر میں بھی استطاعت نہ ہو، تو شہر کی حویلی ادا کرے۔ اس سپاہی کا کھیت یا اس کا میوہ باغ یا اس کا گھر، زرِ فدیہ کے عوض میں نہیں دیے جا سکتے۔

۳۳۔ اگر کوئی پری فیکٹ (Prefect) یا بریگیڈیر کسی سپاہی کی اپنے کام میں کوتاہی پر چشم پوشی کرے اور اس کی جگہ کسی بھاڑے کے آدمی کو کارِ سرکار پر بھیج دے، تو اس پری فیکٹ یا بریگیڈیر کی سزا قتل ہے۔

۳۴۔ اگر کوئی پری فیکٹ یا بریگیڈیر، کسی سپاہی کی جایداد پر قبضۂ مخالفانہ کر لے، یا کسی سپاہی کو زخمی کر دے، یا کسی سپاہی کو اجرت پر (کام کرنے کو) بھیج دے، یا کسی مقدمے میں اسے اعلیٰ افسر کے ہاتھوں میں سونپ کے خود الگ ہو جائے، یا سپاہی سے کوئی بادشاہ کا عطا کردہ انعام ہتھیا لے، تو اس پری فیکٹ یا بریگیڈیر کی سزا قتل ہے۔

۳۵۔ اگر کوئی آدمی ایسے گائے بیل یا بھیڑیں خریدے، جو بادشاہ نے کسی سپاہی کو عطا کیے تھے، تو اس کی رقم ضبط کر لی جائے۔

۳۶۔ کسی مسلح سپاہی یا جاگیردار کا کھیت یا میوہ باغ یا مکان، قیمت کے عوض، الگ الگ فروخت نہیں کیا جا سکتا۔

۳۷۔ اگر کسی شخص نے، کسی مسلح سپاہی یا جاگیردار کا کھیت یا میوہ باغ یا مکان خریدا ہے تو اس کی معاہدے کی تختی توڑ دی جائے اور اس کی رقم ضبط کر لی جائے۔ اور کھیت یا میوہ باغ یا مکان (جو بھی ہو) اس کے مالک کو واپس دے دیا جائے۔

۳۸۔ کوئی سپاہی یا جاگیردار، اپنا کھیت یا میوہ باغ یا مکان، اپنی بیوی یا بیٹی کے نام منتقل نہیں کر سکتا۔ نہ یہ قرض میں رہن ہی رکھے جا سکتے ہیں۔

۳۹۔ (البتہ) وہ تحریری وصیت کے ذریعے اپنی بیوی یا بیٹی کے نام ایسا کھیت یا میوہ باغ یا مکان چھوڑ جا سکتا ہے، جو اس نے خود خریدا تھا اور اسے قرض میں رہن بھی رکھ سکتا ہے۔

۴۰۔ وہ اپنا کھیت یا میوہ باغ یا مکان کسی مندر کی پجارن یا تاجر یا کسی دوسرے جاگیردار کے ہاتھ فروخت کر سکتا ہے اور خریدار، اس کھیت یا میوہ باغ یا مکان کا انتظام کرنے اور اس سے

نفع اٹھانے کا حق رکھتا ہے، جو اس نے خریدا ہے۔

۴۱۔ اگر کسی شخص نے (اپنے انتظام کے دوران میں) کسی مسلح سپاہی یا جاگیردار کے کھیت یا میوہ باغ یا مکان کی احاطہ بندی کی ہے اور اس کے لیے لکڑی کے تختے مہیا کیے ہیں، تو وہ سپاہی یا جاگیردار، کھیت یا میوہ باغ یا مکان پر دوبارہ قابض ہونے سے پہلے ان لکڑی کے تختوں کی قیمت ادا کرے، جو لگائے گئے تھے۔

زراعت (پٹّہ)

۴۲۔ اگر کوئی شخص کاشت کے لیے کھیت لے اور اس میں کھیتی نہ کرے، تو وہ کھیت کے انتظام سے بے توجہی کا قصوروار ہے۔ اس کے مالک کو اس علاقے کی اوسط پیداوار کے برابر اناج دے۔

۴۳۔ اگر اس نے زمین میں ہل نہیں چلایا اور اسے افتادہ چھوڑ دیا ہے، تو وہ زمین کے مالک کو اس کے پڑوسی کی پیداوار کے برابر اناج دے اور جس کھیت کو اس نے افتادہ چھوڑ دیا تھا، اسے گھاس پھوس سے صاف کر کے اور اس میں بوائی کر کے اس کے مالک کے حوالے کرے۔

۴۴۔ اگر کوئی شخص بنجر زمین کاشت کے لیے تین سال کے ٹھیکے پر لے، لیکن کاہلی کے سبب کھیت میں کام نہ کرے، تو اس کا فرض ہے، کہ چوتھے برس وہ کھیت میں ہل چلائے اور اسے گھاس پھوس سے صاف کرے اور بوائی کر کے اس کے مالک کے حوالے کرے اور اسے فی گن دس گر کے حساب سے غلّہ بھی ادا کرے۔

۴۵۔ اگر کوئی شخص اپنا کھیت کسی کو پٹّے پر دے اور پٹّے کی رقم وصول کر لے اور بعد کو (برق و باراں کا) دیوتا اداد کھیت کو زیرِ آب کر دے اور فصل تباہ ہو جائے تو اس نقصان کے لیے مزارع ذمہ دار ہے۔

۴۶۔ اگر زمیندار نے پٹّے کی رقم وصول نہیں کی، یا کھیت کو آدھی یا تہائی بٹائی پر دیا ہے، تو اس صورت میں مزارع اور زمیندار اسی نسبت سے باقی اناج آپس میں تقسیم کر لیں، جو فصل کی تباہی سے بچ رہا ہے۔

۴۷۔ اگر مزارع نے پچھلے برس کھیت سے کوئی فائدہ حاصل نہیں کیا اور اس لیے اب کے کاشت کے لیے آگے کرایے پر اٹھا دیا ہے تو زمیندار، اس مزارع سے مواخذہ نہیں کرسکتا۔ اس کے کھیت میں کاشت ہوئی ہے فصل کے موقع پر وہ ٹھیکے کے مطابق اپنا حصّہ وصول کرلے۔

زراعت (قرض)

۴۸۔ اگر کوئی شخص مقروض ہو اور اداد دیوتا (طوفانِ باد و باراں سے) اس کا کھیت غرقاب کردے یا فصل تباہ ہوجائے یا امساکِ باراں کے باعث اناج پیدا ہی نہ ہو، تو اس برس وہ قرضخواہ کو اناج ادا نہ کرے۔ وہ (قرض کی) تختی کو پانی سے دھو ڈالے اور اس سال کا سود وہ ادا نہ کرے۔

۴۹۔ اگر کوئی شخص کسی ساہوکار سے چاندی قرض لے اور اس کے عوض میں ساہوکار کے پاس اناج یا تلوں کا کھیت رہن رکھ دے اور یہ اقرار کرے کہ "میں غلے یا تل کی کاشت کرونگا، تم فصل پر جو کچھ اس میں ہو، وہ کاٹنا اور لے لینا۔" تو جب اس کا مزارع، اس کھیت میں غلّہ یا تل پیدا کرے، تو زمین کا مالک فصل کے موقع پر غلّہ یا تل جو کچھ بھی کھیت میں ہو لے لے، اور اسے اس چاندی کے ساتھ، جو اس نے قرض لی تھی اور اس پر سود کی بجائے، ساہوکار کے حوالے کردے اور اپنے مزارع کو گذارہ کے لیے اناج مہیّا کرنے کا انتظام کرے۔

۵۰۔ اگر ایسا کھیت دیا گیا تھا، جس میں بونی ہوچکی ہے یا تل کاشت کیے جاچکے ہیں تو زمین کا مالک غلّہ یا تل، جو بھی کھیت میں ہو، خود لے لے اور ساہوکار کو چاندی اور اس کا سود نقد ادا کرے۔

۵۱۔ اگر اس کے پاس ادا کرنے کو چاندی نہ ہو تو وہ چاندی اور سود کی رقم کے برابر مقررہ سرکاری نرخ پر تل دے دے۔

۵۲۔ اگر مزارع نے کھیت میں اناج یا تل کی کاشت نہیں کی، تو اس کا ٹھیکہ منسوخ نہیں کیا جاسکتا۔

آبپاشی میں غفلت

۵۳۔ اگر کوئی شخص اپنے کھیت کے مینڈھ کو مضبوط کرنے میں سستی سے کام لے اور کھیت کے

مینڈھ مضبوط نہ کرے اور مینڈھ میں سوراخ ہو جائے اور (خارج شدہ پانی سے کسی دوسرے کی) زمین زیرِ آب ہو جائے، تو اس کا جتنا اناج ضائع ہوا ہے وہ اس شخص سے وصول کیا جائے، جس کی مینڈھ ٹوٹی تھی۔

۵۴۔ اگر اس کے پاس دینے کو اناج نہ ہو، تو اسے بھی اور اس کا گھربار بھی فروخت کر دیے جائیں اور وصول شدہ چاندی، وہ لوگ آپس میں تقسیم کر لیں، جن کا اناج ضائع ہوا ہے۔

۵۵۔ اگر کوئی شخص اپنا آبپاشی کا گڑھا کھولے اور اس کی غفلت سے اس کے پڑوسی کا کھیت زیرِ آب ہو جائے تو وہ اپنے پڑوسی کو اس علاقے کی اوسط پیداوار کے مطابق اناج بھر دے۔

۵۶۔ اگر کسی شخص نے پانی کھولا ہے اور اس سے اس کے پڑوسی کا بویا ہوا کھیت زیرِ آب ہو گیا ہے، تو وہ دس "گر" فی "گن" کے حساب سے اسے اناج تول کر دے دے۔

چرائی کا تاوان

۵۷۔ اگر کوئی گڈریا کسی کھیت کے مالک کے ساتھ سابقہ سمجھوتے کے بغیر، اپنی بھیڑیں اس کے کھیت میں چرنے کو چھوڑ دے اور مالک کے علم کے بغیر بھیڑیں کھیت چر جائیں، تو مالک (وقت آنے پر) اپنی فصل کی کٹائی کرے اور اس کا نقصان پورا کرنے کو، وہ گڈریا، جس نے اس کے علم کے بغیر اپنی بھیڑیں کھیت میں چرائی تھیں، اسے بیس "گر" فی "گن" کے حساب سے غلّہ دے۔

۵۸۔ اگر بھیڑیں کھیت سے چر چگ کے واپس جا چکیں اور چوبی باڑے میں بند کر دی جائیں اور گڈریا، پھر اپنی غفلت سے انھیں نکل جانے دے اور وہ جا کر دوبارہ کھیت چر جائیں تو وہ گڈریا اس کھیت کو لے لے، جو دوبارہ چر لیا گیا ہے اور فصل کے موقع پر زمین کے مالک کو ساٹھ (۶۰) "گر" فی "گن" کے حساب سے غلّہ بھر دے۔

۵۹۔ اگر کوئی شخص کسی میوہ باغ کے مالک کے علم کے بغیر اس میں سے درخت کاٹ گرائے، تو وہ نصف "من" چاندی ہرجانہ ادا کرے۔

باغوں کی بٹائی

۶۰۔ اگر کوئی شخص اپنا کھیت کسی مالی کو ٹھیکے پر دے کہ اس میں باغ لگا دو اور مالی نے اس

میں پیڑ لگا دیے ہوں، تو وہ مالی چار برس تک، اس کی رکھوالی اور دیکھ بھال کرتا رہے۔ پانچویں برس باغ کا مالک اور مالی اسے ادھیا لیں۔ ہاں باغ کا مالک اپنا حصّہ پہلے چُن لے۔

۶۱۔ اگر مالی سارے کھیت میں پیڑ نہ لگائے اور کچھ حصّہ بنجر چھوڑ دے، تو خالی زمین اس کے حصّے میں شامل کر دی جائے۔

۶۲۔ اور اگر کھیت میں جو اس کے حوالے کیا گیا تھا، کوئی باغ لگایا ہی نہ جائے اور اگر پہلے اس میں غلّہ پیدا ہوتا تھا، تو مالی، زمین کے مالک کو قرب و جوار کے کھیتوں کی پیداوار کے مطابق، ان تمام برسوں کا غلّہ دے، جن میں اس نے غفلت برتی ہے اور وہ کھیت کو تیار کر کے واپس مالک کے حوالے کرے۔

۶۳۔ اگر زمین بنجر تھی، تو وہ اسے توڑ کر مالک کے حوالے کرے اور ہر سال کے لیے دس گر" فی "گن" کے حساب سے اسے غلّہ بھی دے۔

۶۴۔ اگر کوئی شخص اپنا میوہ باغ کسی مالی کو رکھوالی اور دیکھ بھال کے لیے ٹھیکے پر دے، تو جتنی مدّت میوہ باغ مالی کے پاس رہے، وہ اس کی پیداوار کا دو تہائی مالک کو دیتا رہے اور ایک تہائی اپنے پاس رکھے۔

۶۵۔ اگر مالی نے میوہ باغ کی رکھوالی نہیں کی، جس سے اس کی پیداوار کم ہو گئی ہے تو مالی، قرب و جوار کی پیداوار کے مطابق حساب کر کے دے دے۔

(یہاں سے کتبے کے پانچ کالم مٹے ہوئے ہیں۔ مندرجہ ذیل دفعات (۶۶ سے لے کر.. اتک) بعض اور ماخذ سے لی گئی ہیں۔ اصل کتبے کی عبارت دفعہ ۱۰۱ سے دوبارہ شروع ہوتی ہے)

۶۶۔ اگر کوئی شخص کھجوروں کا باغ کسی مالی کو دیکھ بھال اور انتظام کے لیے ٹھیکے پر دے اور مالی کسی ساہوکار سے چاندی قرض لے، اور جب ساہوکار ادائی کا تقاضا کرے، مالی کے پاس ادا کرنے کو کچھ نہ ہو اور وہ ساہوکار سے کہے کہ "اپنی چاندی کے عوض میں، میرے باغ سے کھجوریں لے لو" تو چاہیے کہ ساہوکار اسے قبول نہ کرے۔ باغ میں جو کھجوریں ہیں، وہ باغ کا مالک لے لے اور وہ خود اصل چاندی اور قرض کی تختی کی شرط کے بموجب مقررہ سود اس ساہوکار کو ادا کر دے اور

باغ میں جو کھجوریں بچ رہیں، ان پر بھی قبضہ کر لے۔

۱۷۔ اگر کوئی آدمی، کسی مکان کے لیے غلّہ یا چاندی یا کوئی اور چیز ادا کرے اور پایا جائے کہ وہ مکان جن بنیادوں یا دیواروں پر تعمیر ہوا ہے، وہ پڑوسی کے مکان کی ہیں، تو جو کچھ اس نے ادا کیا ہے، وہ اسے کھو بیٹھیگا اور مکان واپس دے دیا جائیگا۔ ہاں، اگر مکان پڑوسی کی موجودہ بنیادوں یا دیواروں پر تعمیر نہیں ہوا ہے، تو وہ اسے غلّے یا چاندی یا کسی اور چیز کے عوض میں خرید سکتا ہے۔

قرض اور شرح سود

۹۰۔ اگر کسی ساہوکار نے (غلّہ یا) چاندی قرض پر دی ہے، تو وہ فی "گر" غلّے کے لیے سو "قا ع" سود لے سکتا ہے۔ اگر اس نے چاندی سود پر دی ہے، تو وہ فی "شیکل" چاندی پر ۱/۶ "شیکل" اور ۶ "گرین" سود لے سکتا ہے۔

۹۱۔ اگر کوئی شخص سود پر چاندی قرض لے، لیکن ادائی کے لیے اس کے پاس چاندی نہ ہو، بلکہ غلّہ ہو، تو شاہی قانون کے مطابق ساہوکار سو "قاع" فی "گر" کے حساب سے سود لے سکتا ہے۔ اگر ساہوکار اس پر رضامند نہ ہو اور سو "قاع" فی "گر" کے علاوہ ۱/۶ "شیکل" اور ۶ "گرین" بھی سود میں لینا چاہے، تو اس کی تمام رقم روک دی جائے۔

۹۲۔ اگر کسی ساہوکار نے غلّہ یا چاندی سود پر قرض دی ہے اور وہ سود وصول کر چکا ہے اور اصل غلّہ یا چاندی بھی، اور بعد کو یوں ظاہر کرے جیسے کہ غلّہ یا چاندی (باقی غائب)

۹۳۔ (غائب)

سود در سود

۹۴۔ اگر ساہوکار قرض کی جزوی ادائی میں غلّہ وصول کر چکا ہے اور وہ اسے مُجرا نہیں دیتا، نہ نئی تختی تحریر کرتا ہے، یا اگر اس نے سود کا اصل زر میں اضافہ کر دیا ہے، تو وہ وصول کردہ غلّے

سے دُگنا واپس کرے۔

ڈنڈی مارنا

۹۵۔ اگر کوئی ساہوکار غلّہ یا چاندی، سُود پر قرض دے اور تول میں کم چاندی مقروض کے حوالے کرے، یا ماپ میں کم غلّہ دے یا قرض وصول کرتے وقت، وہ تول میں زیادہ چاندی یا ماپ میں زیادہ غلّہ لے لے، تو اس ساہوکار کی سزا یہ ہے کہ اس نے جو کچھ قرض پر دیا تھا، وہ ضبط کر لیا جائے۔

قرض کا دن

۹۶۔ اگر کوئی ساہوکار، غلّہ یا چاندی ایسے دن قرض پر دے، جس دن پنچایت کا اجلاس نہیں ہوتا۔ تو اس کے قرض کی ساری رقم ضبط کر لی جائے۔

قرض کی واپسی پر گواہ ہوں

۹۷۔ اگر کسی شخص نے غلّہ یا چاندی، کسی ساہوکار سے قرض لی ہے اور ادا کرنے کو اس کے پاس غلّہ یا چاندی نہیں، بلکہ کسی اور قسم کا مال ہو، تو جو کچھ بھی اس کے پاس ہے، وہ گواہوں کی موجودگی میں پیش کرے اور اپنے ساہوکار کا قرض چُکا دے۔ ساہوکار اسے قبول کرنے سے انکار نہیں کر سکتا۔

۹۸۔ (غائب)

۹۹۔ (غائب)

تجارتی قرض

۱۰۰۔ اگر کوئی شخص، کسی دوسرے کو مشترکہ تجارت کی غرض سے چاندی اُدھار دے، تو آخری نفع نقصان سے متعلق خدا کے سامنے (حلفیہ) اعلان کیا جائے، اور اس میں وہ دونوں برابر کے شریک ہونگے۔

۱۰۱۔ اگر کوئی ساہوکار کسی خُردہ فروش کو کاروبار کے لیے چاندی (سُود پر) دے اور پھر اس چاندی کو استعمال کرنے کے لیے وہ اسے سفر پر روانہ کرے، تو اس صورت میں جس جگہ وہ خُردہ فروش گیا ہے، اگر وہ وہاں نفع کمائے، تو وہ اس چاندی کے لیے، جو اُسے دی گئی تھی، سُود ضبطِ تحریر میں لائے۔ وہ دونوں (اس کی غیر حاضری کے) دنوں کا حساب کریں اور اُسے وہ ساہوکار کے حوالے کرے۔ اگر جہاں وہ گیا ہے، وہاں اسے کوئی نفع حاصل نہ ہو، تو وہ خُردہ فروش ساہوکار کو اس چاندی سے، جو اس نے لی تھی، دگنی واپس کرے۔

قرضِ حسنہ

۱۰۲۔ اگر کسی ساہوکار نے، کسی خُردہ فروش کو قرضِ حسنہ دیا ہے اور جہاں وہ خُردہ فروش گیا تھا، وہاں اسے گھاٹا ہوا ہے تو وہ صرف اصل رقم ساہوکار کو واپس کرے۔

۱۰۳۔ اگر سفر میں اس کا تمام مال اسباب رہزن لوٹ لے جائیں، تو خُردہ فروش، خدا کے نام کا حلف اُٹھائے، اِس پر وہ ادائی سے بری الذمّہ قرار دیا جائے۔

۱۰۴۔ اگر کوئی ساہوکار غلّہ یا اُون یا تیل یا کوئی اور جنس، تجارت کی غرض سے کسی خُردہ فروش کے سپرد کرے، تو خُردہ فروش اس مال کی قیمت قلمبند کرکے ساہوکار کے حوالے کردے اور تصفیہ کے وقت خُردہ فروش تاجر سے اس چاندی کی جو وہ قیمت میں ادا کرے، مُہری رسید لے۔

۱۰۵۔ اگر کوئی خُردہ فروش بے احتیاطی سے کام لے اور ساہوکار سے اس چاندی کی جو اُس نے ادا کی ہے، مُہری رسید نہ لے، تو وہ چاندی، جو مُہری رسید کے تحت نہیں دی گئی، حساب میں مُجرا نہیں ہوگی۔

۱۰۶۔ اگر کوئی خُردہ فروش کسی ساہوکار سے چاندی لے اور پھر ساہوکار سے تنازعہ کرے، تو ساہوکار اس خُردہ فروش کو، اس چاندی کے لیے، خدا اور پنچایت کے سامنے بلائے؛ اور خُردہ فروش اس چاندی سے جو اس نے لی تھی، تگنی واپس کرے۔

۱۰۷۔ اگر کوئی ساہوکار، کسی خُردہ فروش پر جھوٹا الزام لگائے، حال آں کہ ساہوکار نے جو کچھ اس خُردہ فروش کو دیا تھا، وہ اُسے واپس کرچکا ہے، لیکن ساہوکار نے جو کچھ وصول کیا ہے، وہ اس سے

انکاری ہے۔ اس صورت میں، خُردہ فروش ساہوکار کو خدا اور پنچایت کے سامنے بلائے۔ اور چونکہ ساہوکار نے خُردہ فروش سے تنازعہ کیا ہے، اس لیے وہ خُردہ فروش کو اس کا چھ گنا ادا کرے، جو اس نے وصول کیا تھا۔

شراب میں دھوکا دھڑی

۱۰۸۔ اگر کوئی شراب فروش عورت، شراب کی قیمت میں غلّہ قبول نہ کرے، بلکہ غلّے کی قیمت کے برابر پوری تول کر چاندی لے اور چاندی کی قیمت غلّے کی قیمت سے کم لگائے، تو اس شراب فروش پر مقدمہ چلایا جائے اور (بطورِ سزا) اسے پانی میں ڈال کر غرق کر دیا جائے۔

شراب فروش اور بغاوت

۱۰۹۔ اگر باغی کسی شراب فروش عورت کے مکان پر جمع ہوں، اور وہ انھیں گرفتار کر کے حویلی میں حاضر نہ کرے، تو اس شراب فروش کی سزا قتل ہے۔

شراب فروش راہبہ

۱۱۰۔ اگر کوئی پُجارن یا راہبہ، خانقاہ میں رہنے کی بجائے، شراب کی دکان کھول لے یا شراب نوشی کی غرض سے، کسی شراب کی دکان میں داخل ہو، تو اس عورت کو زندہ جلا دیا جائے۔
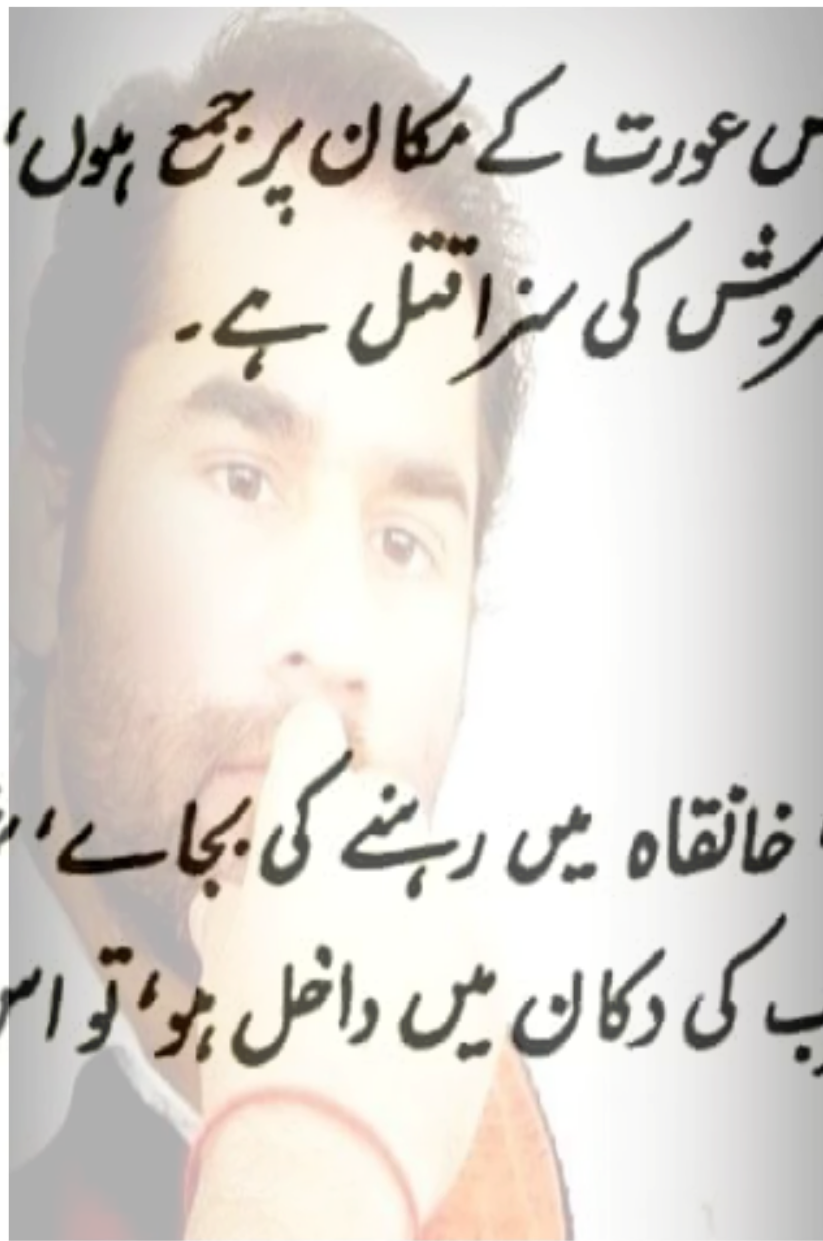
قرض شراب

۱۱۱۔ اگر کوئی شراب فروش عورت کسی تقریب کے موقع پر ساٹھ "قاع" شراب اُدھار دے، تو فصل پر اسے پچاس "قاع" غلّہ دیا جائے۔

خیانت

۱۱۲۔ اگر کوئی شخص سفر پر جائے اور وہاں کسی دوسرے آدمی کو چاندی یا سونا یا جواہرات یا کوئی

اورمنقولہ سامان دے کہ یہ میرے گھر پہنچا دینا، اور وہ آدمی، سارا سامان، جو اس کے حوالے کیا گیا تھا، نہ لے جائے اور اس کے گھر والوں کے سپرد نہ کرے، بلکہ اپنے پاس رکھ لے، تو سامان کا مالک، اس آدمی پر تمام ایسے مال کے لیے جو اس کے حوالے کیا گیا تھا اور اس نے اس کے گھر والوں کے سپرد نہیں کیا، نالش کرے اور مجرم اس تمام مال کی، جو اس کے حوالے کیا گیا تھا، پچگنی قیمت مالک کو ادا کرے۔

استحصال بغیر علم

۱۱۳۔ اگر کوئی شخص دعویٰ کرے کہ اسے کسی دوسرے سے غلّہ یا چاندی لینا ہے اور وہ اس کے علم کے بغیر اس کے کھتے یا ذخیرے سے غلّہ نکال لے، تو چونکہ اس شخص نے مالک کے علم کے بغیر، اس کے کھتے یا ذخیرے سے غلّہ لیا ہے، اس لیے اس پر مقدمہ چلایا جائے۔ غلّہ جو اس نے لیا ہے، واپس کیا جائے اور جو کچھ لینے کا اسے حق تھا، وہ بھی ضبط کرلیا جائے۔

بیگار

۱۱۴۔ اگر کسی آدمی کو کسی دوسرے شخص سے کوئی غلّہ یا چاندی نہ لینا ہو، لیکن اس کے باوجود وہ کسی (قرضی) قرض کے بدلے میں اسے بیگار میں پکڑے، تو وہ ہر مرتبہ بیگار کے لیے اسے ۱/۳ "من" چاندی بطور ہرجانہ ادا کرے۔

حبسِ ناجائز (طبعی موت)

۱۱۵۔ اگر کسی آدمی کو، کسی دوسرے سے غلّہ یا چاندی لینا ہو اور اس کے لیے وہ مقروض کو اپنے گھر میں بند کر دے، تو اگر وہ مقروض اس دوران میں اس روکنے والے گھر میں (طبعی موت سے) وفات پا جائے، تو اس صورت میں قرضخواہ کے تمام حقوق ختم ہوجائینگے۔

(غیر طبعی موت)

۱۱۶۔ اگر اس محبوس کی موت قرضخواہ کے گھر میں کسی ضرب یا بدسلوکی کے نتیجے میں واقع ہو، تو

متوفی کا ولی، قرضخواہ سے جواب طلب کرے۔ اگر متوفی آزاد شہری تھا، تو قرضخواہ کا بیٹا قتل کر دیا جائے؛ اگر وہ غلام تھا، تو قرضخواہ ۱/۳ من چاندی ادا کرے اور جو کچھ اس کا واجب الادا تھا، وہ بھی اسے نہ دیا جائے۔

بیوی بچے رہن

۱۱۷۔ اگر کوئی شخص قرض لے اور اپنی بیوی یا اپنے بیٹے یا اپنی بیٹی کو چاندی کے عوض یا خدمت کرنے کے لیے (قرضخواہ کے) حوالے کر دے، تو وہ تین سال تک اپنے آقا کے گھر میں خدمت کرینگے اور چوتھے سال اپنی پہلی حالت پر واپس آجائینگے۔

غلام لونڈی رہن

۱۱۸۔ اگر مقروض کسی غلام یا لونڈی کی خدمات منتقل کر دے، اور قرضخواہ انھیں کہیں باہر بھیج دے اور چاندی کے عوض میں بیچ دے، تو یہ قابلِ مواخذہ نہیں۔

اُمّ الوَلد

۱۱۹۔ اگر کوئی شخص قرض لے اور چاندی کے عوض میں کسی ایسی لونڈی کو فروخت کر دے، جس سے اس کے اولاد ہو چکی ہے، تو لونڈی کا مالک وصول کردہ چاندی واپس کر دے، جو تاجر نے اسے ادا کی تھی اور وہ لونڈی آزاد کر دی جائے۔

غلّے کا ذخیرہ

۱۲۰۔ اگر کوئی شخص اپنا غلّہ کسی دوسرے کے مکان میں ذخیرہ کرے اور کھتّے کو نقصان پہنچ جائے، یا مالکِ مکان غلّہ نکالنے کے لیے کھتّہ کھولے یا ذخیرہ کردہ غلّے کی مقدار سے متعلق کوئی تنازعہ پیدا ہو جائے، تو غلّے کا مالک اپنے غلّے کا دعویٰ خدا کے سامنے کرے اور صاحبِ مکان جس نے غلّہ نکالا ہو، اسے دُگنا واپس کرے۔

۱۲۱۔ اگر کوئی شخص اپنا غلّہ کسی دوسرے کے مکان میں ذخیرہ کرے، تو وہ فی "گر" پانچ "قاع" غلّہ سالانہ کے حساب سے کرایہ ادا کرے۔

امانت

۱۲۲۔ اگر کوئی شخص کسی دوسرے کے پاس چاندی یا سونا یا کوئی اور چیز امانت رکھنا چاہے تو وہ سب چیزیں، پنچایت کے بڑوں کو دکھائے اور ایک دستاویز لکھی جائے اور پھر وہ امانت رکھے۔

۱۲۳۔ اگر وہ پنچایت کے علم یا دستاویز لکھے بغیر امانت رکھے اور بعد کو جس کے ہاں وہ چیز رکھی گئی ہے، اس سے انکار کردے، تو اب کوئی مطالبہ نہیں ہوسکتا۔

امانت میں خیانت

۱۲۴۔ اگر اس نے چاندی یا سونا یا کوئی اور چیز پنچایت کی موجودگی میں امانت رکھی تھی اور اب امانت دار اس سے انکاری ہے، تو وہ اس پر مقدمہ چلائے اور جتنا اس کا مطالبہ ہے، امانت دار اس کے بدلے میں دُگنا واپس کرے۔

امانت کی چوری

۱۲۵۔ اگر کوئی شخص اپنا مال اسباب امانت رکھے اور امانت دار کے گھر میں سیندھ لگ جائے یا چور دیوار پھاند کر گھس آئیں، جس سے صاحبِ مکان کے سامان کے ساتھ مالِ امانت میں سے بھی کوئی چیز چوری چلی جائے، تو اس صورت میں صاحبِ مکان، جو کچھ اس کے پاس امانت رکھا گیا تھا اور گم ہوگیا ہے، پورا کرے اور مالک کو واپس دے۔ صاحبِ مکان اپنے گمشدہ مال کی خود کھوج کرے، اور چور سے وصول کرے۔

۱۲۶۔ اگر کسی شخص کا سارا مال چوری نہ گیا ہو لیکن اس کے باوجود وہ یہ دعویٰ کرے کہ میرا سارا مال چوری ہوگیا ہے اور اس طرح اپنے نقصان سے متعلق بڑھا کر کہے، تو چونکہ اس کا سب کچھ

چوری نہیں گیا، وہ اپنے نقصان کا دعویٰ خدا کے سامنے پیش کرے۔ جتنا دعویٰ وہ ثابت کر سکے، وہ پورا کیا جائے اور اس کے نقصان کی تلافی کی جائے۔

ناجائز تہمت

۱۲۷۔ اگر کوئی شخص کسی مقدس راہبہ یا کسی دوسرے شخص کی بیوی کے خلاف بلاوجہ اُنگلی اٹھائے، تو اس شخص کو قاضی کے سامنے پیش کیا جائے اور اس کی پیشانی داغ دی جائے۔

نکاح

۱۲۸۔ اگر کوئی شخص کسی عورت سے تعلقات زناشوئی قائم کرے، لیکن باقاعدہ نکاح نامہ نہ لکھا جائے تو وہ عورت (قانوناً) اس کی بیوی نہیں ہے۔
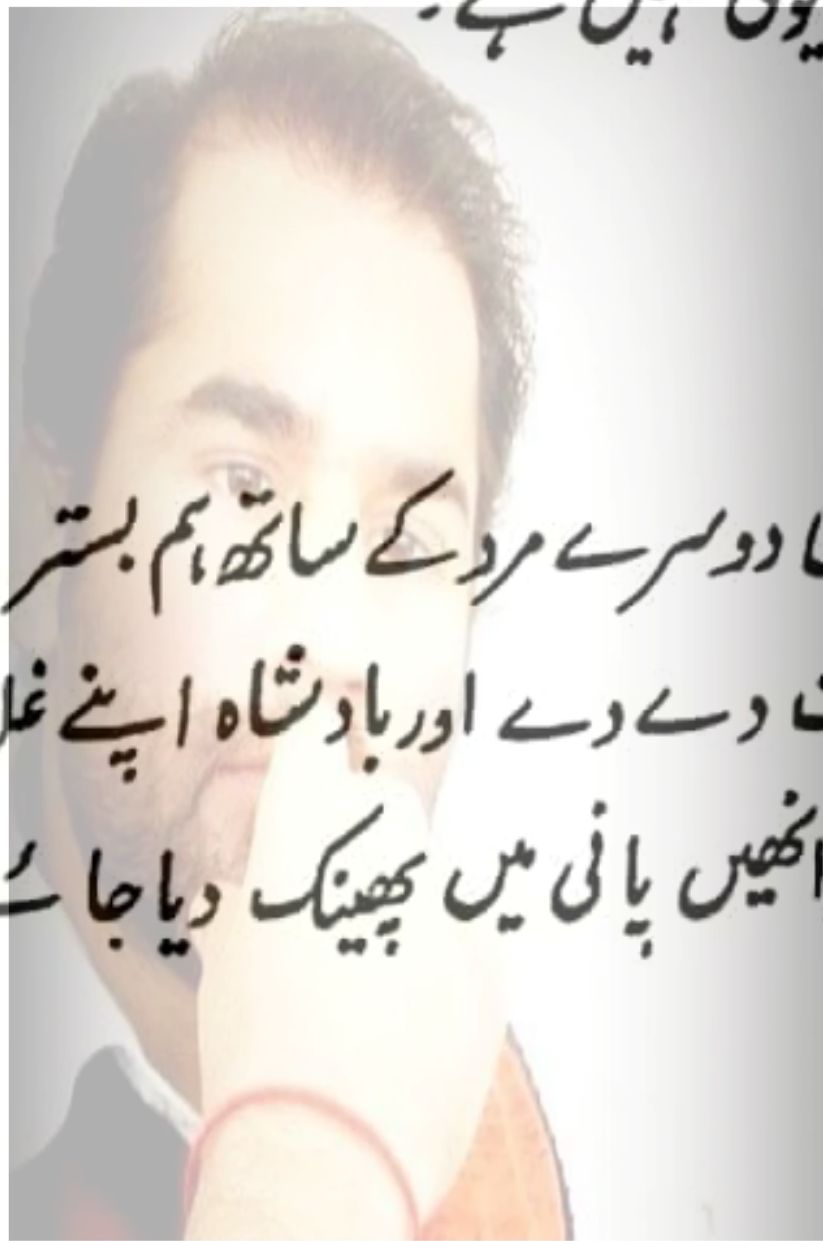
زنا

۱۲۹۔ اگر کسی شخص کی بیوی، کسی دوسرے مرد کے ساتھ ہم بستر پائی جائے، تو بجز اس کے کہ خاوند بیوی کو زندہ رہنے کی اجازت دے دے اور بادشاہ اپنے غلام کو زندہ رہنے کی اجازت دے دے، ان دونوں کی مشکیں باندھ کر انھیں پانی میں پھینک دیا جائے۔

زنا بالجبر

۱۳۰۔ اگر کوئی شخص کسی دوسرے کی بیوی سے، جو ابھی تک مرد کے قریب نہ گئی ہو اور اپنے باپ ہی کے گھر میں رہتی ہو، زنا بالجبر کرے اور پکڑا جائے، تو اس کی سزا قتل ہے۔ وہ عورت بیقصور ہے۔

لعان

۱۳۱۔ اگر کوئی شخص اپنی بیوی پر تہمت دھرے، لیکن وہ کسی دوسرے مرد کے ساتھ ہم بستری کی

حالت میں نہ پکڑی گئی ہو، تو وہ عورت خدا کے نام کی قسم اُٹھائے اور اپنے گھر واپس چلی جائے۔
۱۳۲۔ اگر کسی شخص کی بیوی کے خلاف کسی دوسرے مرد کے باعث، انگشت نمائی کی جائے اور وہ اس دوسرے مرد کے ساتھ ہم بستری کی حالت میں نہ پکڑی گئی ہو، تو وہ عورت اپنے خاوند کی خاطر متبرک دریا میں غوطہ لگائے۔

قیدی کی بیوی

۱۳۳۔ اگر کوئی شخص جنگ میں قیدی ہو جائے اور اس کے گھر میں کھانے پینے کا سامان موجود ہو اور اس کے باوجود، اس کی بیوی اس کا گھر چھوڑ دے اور کسی دوسرے کے گھر میں چلی جائے، تو چونکہ اس عورت نے اپنے جسم کی حفاظت نہیں کی، بلکہ دوسرے کے گھر پڑ گئی ہے، اس لیے وہ عورت قابلِ مواخذہ ہے، اسے دریا میں ڈبو دیا جائے۔
۱۳۴۔ اگر کوئی شخص قیدی ہو جائے، اور اس کے گھر میں کھانے پینے کا سامان موجود نہ ہو، اور اس حالت میں اس کی بیوی کسی دوسرے کے گھر میں پڑ جائے، تو وہ عورت قصوروار نہیں۔
۱۳۵۔ اگر کوئی شخص قیدی ہو جائے اور اس کی بیوی کے لیے کھانے پینے کا سامان موجود نہ ہو، اور اس پر وہ کسی دوسرے شخص کے گھر میں پڑ جائے، جہاں اس کے اولاد پیدا ہو۔ اگر بعد کو اس کا خاوند رہا ہو کر اپنے شہر میں واپس آجائے، تو وہ عورت اپنے خاوند کے پاس لوٹ آئے۔ بچے اپنے باپ ہی کے پاس رہینگے۔

بھگوڑے کی بیوی

۱۳۶۔ اگر کوئی شخص اپنا شہر چھوڑ کر مفرور ہو جائے اور اس کی غیر حاضری میں اس کی بیوی کسی دوسرے شخص کے گھر میں پڑ جائے، تو اگر کبھی اس کا خاوند لوٹ آئے اور اپنی بیوی پر حق جمانا چاہے، تو چونکہ وہ شخص بھاگ گیا تھا اور اپنا شہر چھوڑ کے چلا گیا تھا، وہ "بھگوڑے کی بیوی" اپنے خاوند کے پاس واپس نہ جائے۔

داشتہ کے حقوق

۱۳۷۔ اگر کوئی شخص اپنی ایسی داشتہ کو چھوڑ دینے کا فیصلہ کرلے، جس سے اس کے اولاد ہے۔ یا ایسی پجارن کو جو اسے اولاد پیش کر چکی ہے، تو اس صورت میں وہ اس عورت کا جہیز اسے واپس کرے اور وہ اسے کھیت یا میوہ باغ یا جایداد سے نفع اندوزی کا حق دے اور وہ عورت اپنی اولاد کی پرورش کرے۔ جب وہ بچوں کو پال پوس کر بڑا کرلے، تو جایداد سے جو کچھ اس کے بچوں کو دیا گیا ہے، وہ اس میں سے ایک بیٹے کے حصے کے برابر لے اور اس کے بعد اس کی پسند کا مرد اس سے نکاح کرلے۔

بانجھ کو طلاق

۱۳۸۔ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو طلاق دینا چاہے، جس سے اس کے کوئی اولاد نہیں ہے تو وہ "زرِعروس" کی چاندی ادا کرے، اور جو جہیز وہ اپنے باپ کے گھر سے ساتھ لائی تھی، وہ بھی اسے واپس کرے۔ اور اس کے بعد اسے طلاق دے۔

۱۳۹۔ اگر کوئی "زرِعروس" مقرر نہیں ہوا تھا، تو وہ طلاق کی صورت میں اسے ایک "من" چاندی دے دے۔

۱۴۰۔ اگر وہ شخص طبقۂ عوام میں سے ہے، تو وہ صرف ⅓ "من" چاندی ادا کرے۔
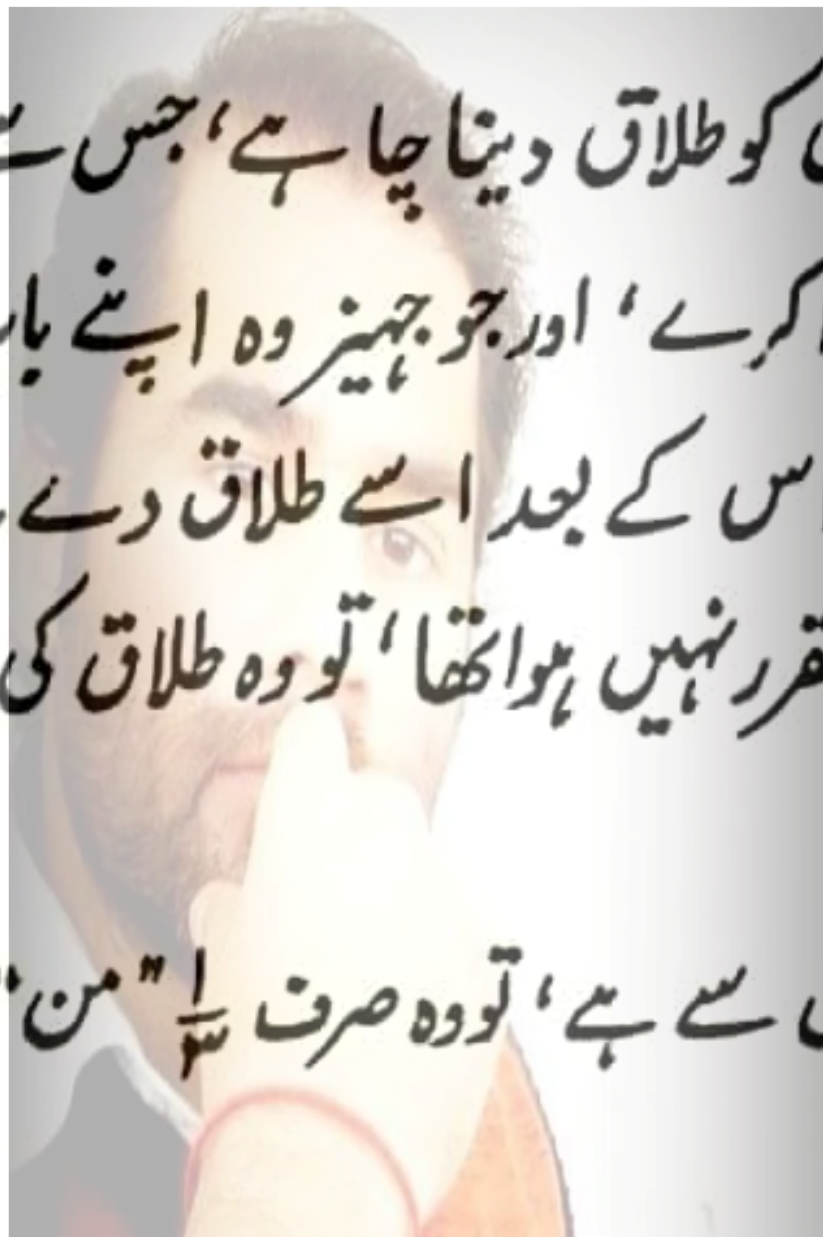
عیاش بیوی

۱۴۱۔ اگر کسی شخص کی بیوی، اس کے گھر میں رہتی ہوئی، نکل جانے پر تل جائے اور وہ آوارگی کی مجرم ہو یا اس نے گھر کو اپنی فضول خرچی سے تباہ کر دیا ہو، یا اس نے اپنے خاوند سے بے التفاتی کی ہو، تو اس عورت کو قاضی کے سامنے پیش کیا جائے۔ اگر اس کا خاوند کہہ دے کہ "میں اسے طلاق دیتا ہوں" تو وہ جہاں چاہے چلی جائے، وہ اسے طلاق کے لیے کچھ معاوضہ نہیں دیگا۔ اگر اس کا خاوند کہے کہ "میں اسے طلاق نہیں دیتا" تو وہ شخص کسی دوسری

عورت سے نکاح کرسکتا ہے اور وہ (پہلی) عورت اپنے خاوند کے گھر میں لونڈی بن کر رہے۔

عیّاش خاوند

۱۴۲۔ اگر کوئی عورت اپنے خاوند سے نفرت کرے اور اس سے کہے "تم میرے نزدیک نہیں آسکتے"، تو اس کی نفرت کے اسباب کی تحقیق کی جائے۔ اگر پایا جائے کہ وہ عورت باعصمت ہے اور اس کا کوئی قصور نہیں، بلکہ اس کا خاوند آوارہ ہے اور اس کی طرف التفات نہیں کرتا، تو وہ عورت موردِ الزام نہیں۔ وہ بے شک اپنا جہیز لے لے اور اپنے باپ کے گھر واپس چلی جائے۔

عیّاش بیوی کی سزا

۱۴۳۔ اگر وہ عورت باعصمت نہیں، بلکہ آوارہ ہے، یا فضول خرچ ہے اور اپنے خاوند کی طرف التفات نہیں کرتی تو وہ پانی میں ڈبو دی جائے۔

پجارن بیوی

۱۴۴۔ اگر کوئی شخص، کسی پجارن سے نکاح کرے اور وہ پجارن اپنے خاوند کو ایک لونڈی پیش کرے، جس سے اس کے اولاد بھی ہو جائے۔ اگر اس کے بعد وہ شخص داشتہ رکھنا چاہے، تو اسے اس کی اجازت نہ دی جائیگی۔ وہ داشتہ نہیں رکھ سکتا۔

۱۴۵۔ اگر کوئی شخص کسی پجارن سے نکاح کرے اور اس سے اس کے اولاد پیدا نہ ہو، جس پر وہ داشتہ رکھنے کا فیصلہ کرے تو اگر وہ کسی داشتہ کو بیوی بنا کر اپنے گھر لے آئے، تو اس داشتہ کا درجہ اس پجارن کے برابر نہیں ہوگا۔

پجارن بیوی کی لونڈی

۱۴۶۔ اگر کوئی شخص کسی پجارن سے نکاح کرے اور وہ اپنے خاوند کو ایک لونڈی پیش کرے، جس سے اس کے اولاد پیدا ہو جائے۔ اگر بعد کو یہ لونڈی اپنی مالکن سے برابری کا دعویٰ

کرنے لگے، تو چوں کہ وہ بچوں کی ماں ہے، اس کی مالکن اسے چاندی کے عوض میں فروخت نہیں کرسکتی۔ ہاں اسے بیڑی پہنائی جاسکتی ہے اور اس سے لونڈی غلاموں کا سا سلوک کیا جائے۔

۱۴۷۔ اگر اس لونڈی کے اولاد نہ ہو، تو اس کی مالکن اسے چاندی کے عوض میں فروخت کرسکتی ہے

بیمار بیوی

۱۴۸۔ اگر کوئی شخص نکاح کرے اور اس کی بیوی کو کوئی بیماری لاحق ہوجائے، جس پر وہ دوسرا نکاح کرنے کا فیصلہ کرے، تو اسے نکاح کرنے کی اجازت ہے۔ لیکن وہ اپنی اس بیوی کو جسے بیماری لاحق ہوگئی ہے، طلاق نہیں دے سکتا۔ وہ اس کے بنائے ہوئے گھر ہی میں رہیگی اور وہ اس کی زندگی بھر اس کے نان نفقے کے لیے ذمہ دار ہے۔

۱۴۹۔ اگر وہ عورت اپنے خاوند کے گھر میں رہنے پر رضامند نہ ہو، تو وہ شخص اس کا جہیز واپس کردے، جو وہ اپنے باپ کے گھر سے ساتھ لائی تھی، اور وہ بےشک چلی جائے۔

بیوی کو ہبہ

۱۵۰۔ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو کھیت یا میوہ باغ یا کوئی اور سامان دے، اور (اس سے متعلق) مُہری تختی اس کے حوالے کردے، تو شوہر کی وفات کے بعد اس عورت کی اولاد کا اس جایداد پر کوئی حق نہیں۔ اپنی وفات پر وہ عورت اسے جس بچے کے نام چاہے ترکے میں چھوڑ جائے۔ البتہ وہ اسے اپنے بھائیوں کو نہیں دے سکتی۔

قرض (ماقبل نکاح)

۱۵۱۔ اگر کوئی عورت جو کسی شخص کے گھر میں رہتی ہے، اپنے خاوند سے یہ عہد لے چکی ہے کہ وہ اسے کسی قرضخواہ کے حوالے نہیں کریگا اور وہ (اس سے متعلق اس سے تحریری) تختی لے چکی

ہے، تو اگر اس شخص پر اس عورت سے نکاح کرنے سے پہلے کا کوئی قرض ہے، تو اس کا قرضخواہ اس عورت کو قرضے میں قُرق نہیں کر سکتا۔ اسی طرح اگر اس عورت پر اس مرد کے گھر میں داخل ہونے سے پہلے کا کوئی قرض ہو، تو اس کے قرضخواہ اس کے خاوند کو قُرق نہیں کر سکتے۔

قرض مابعد نکاح

۱۵۲۔ اگر اس عورت کے، اس مرد کے گھر آنے کے بعد وہ مقروض ہو جائیں، تو اس صورت میں وہ دونوں ساہوکار کا قرض ادا کرنے کے لیے ذمہ دار ہیں۔

زانیہ قاتلہ

۱۵۳۔ اگر کسی شخص کی بیوی، کسی دوسرے مرد کی خاطر اپنے خاوند کو قتل کر دے، تو اس عورت کو صلیب پر میخوں سے گاڑ کر ہلاک کر دیا جائے۔

بیٹی سے زنا

۱۵۴۔ اگر کوئی شخص اپنی بیٹی سے زنا کرے، تو وہ شخص شہر بدر کر دیا جائے۔

بہو سے زنا

۱۵۵۔ اگر کوئی شخص کسی لڑکی سے اپنے بیٹے کا رشتہ ٹھہرائے اور اس کا لڑکا اس عورت سے خلوت صحیحہ کر چکا ہو اور بعد کو وہ شخص خود اس سے ہم بستر ہو اور وہ پکڑا جائے، تو اس شخص کی مشکیں باندھ کے اسے پانی میں پھینک دیا جائے۔

۱۵۶۔ اگر کوئی شخص کسی لڑکی سے اپنے بیٹے کا رشتہ ٹھہرائے اور اس کے لڑکے نے ابھی اُس لڑکی سے خلوت نہ کی ہو، اور وہ شخص خود اس لڑکی سے مجامعت کرے، تو وہ نصف "من" چاندی ادا کرے اور جو کچھ وہ اپنے باپ کے گھر سے لائی تھی، اسے واپس کیا جائے اور اس کی پسند کا مرد اسے اپنے عقدِ نکاح میں لے لے۔

ماں سے زنا

۱۵۷۔ اگر کوئی شخص اپنے باپ کے بعد، اپنی ماں سے زنا کرے، تو ان دونوں کو زندہ جلا دیا جائے۔

سوتیلی ماں (اُمّ الوَلد) سے زنا

۱۵۸۔ اگر کوئی شخص اپنے باپ کے بعد اس کی داشتہ سے زنا کرتا پکڑا جائے، جس سے (اس کے باپ کی) اولاد ہو چکی ہے، تو وہ شخص اپنے باپ کے گھر سے عاق کر دیا جائے۔

نسبت توڑنا

۱۵۹۔ اگر کوئی شخص اپنے خسر کے گھر میں مال سامان لائے اور اسے "زرِعروس" ادا کرے، لیکن بعد کو کسی دوسری عورت کی طرف مائل ہو جائے اور اپنے خسر سے کہے کہ "میں تمھاری بیٹی سے شادی نہیں کرنا چاہتا" تو لڑکی کا والد اس سارے مال پر بدستور قابض رہیگا، جو وہ اس کے پاس لایا تھا۔

۱۶۰۔ اگر کوئی شخص اپنے خسر کے گھر میں مال سامان لائے اور اسے "زرِعروس" ادا کر دے، لیکن بعد کو لڑکی کا باپ کہے، کہ "میں تمھیں اپنی لڑکی نہیں دیتا" تو وہ اس سارے مال کا دُگنا واپس کرے، جو اس کے گھر میں لایا گیا تھا۔

۱۶۱۔ اگر کوئی شخص اپنے خسر کے گھر میں مال سامان لائے اور اسے "زرِعروس" ادا کرے، لیکن بعد کو اس کا کوئی دوست اس پر تہمت لگائے، اور خسر (نامزد داماد سے کہے کہ "تم میری بیٹی سے شادی نہیں کر سکتے" تو وہ اس سارے مال کا دگنا ادا کرے، جو اس کے گھر میں لایا گیا تھا اور وہ لڑکی بھی اس دوست سے نکاح نہیں کر سکتی۔

جہیز کا وارث

۱۶۲۔ اگر کوئی شخص کسی عورت سے نکاح کر لے اور اس سے اس کے اولاد ہو، اور اس کے بعد

وہ عورت فوت ہو جائے، تو اب اس عورت کے باپ کا اس کے جہیز پر کوئی حق نہیں۔ جہیز اس کے بچوں کی ملکیت ہے۔

۱۶۳۔ اگر کوئی شخص کسی عورت سے نکاح کرے اور اس عورت نے اسے کوئی اولاد نرینہ پیش کی ہو، اور وہ عورت فوت ہو جائے، تو اگر "زرِ عروس" جو وہ شخص اپنے خسر کے گھر میں لایا تھا، اس کے خسر کی طرف سے اسے واپس دیا جا چکا ہے، تو اب اس عورت کے جہیز پر اس کے خاوند کا کوئی حق نہیں۔ یہ جہیز اس عورت کے باپ کے گھر واپس جائے۔

۱۶۴۔ اگر اس کے خسر نے زرِ عروس بیٹی کے جہیز میں واپس نہیں کیا تھا، تو خاوند "زرِ عروس" کی جملہ رقم منہا کر کے لے لے اور بقایا جہیز اس عورت کے باپ کے گھر واپس بھیج دے۔

بیٹے کو ہبہ

۱۶۵۔ اگر کوئی شخص، کھیت یا میوہ باغ یا مکان اپنے کسی بیٹے کو ہبہ کر دے، جو اس کی نظر میں سب سے زیادہ عزیز ہو اور اس سے متعلق اسے ایک مُہری تختی لکھ کے دے دے، تو جب والد وفات پا جائے اور بھائی بھائی آپس میں ترکہ تقسیم کریں، تو وہ اپنے والد کے تحفے کو اپنے پاس رکھے، جو اس نے اسے اس مساوی حصّے سے زیادہ دیا تھا، جو وہ اب پدری ترکے سے لیگا۔

زرِ عروس

۱۶۶۔ اگر کسی شخص نے اپنے بیٹوں کی شادیاں کر دی ہیں، لیکن کسی خُرد سال لڑکے کی شادی نہیں کر سکا، تو باپ کی وفات کے بعد جب بھائی اپنے پدری ترکے کو آپس میں تقسیم کریں، تو وہ اپنے خُرد سال بھائی کو، جس کی شادی ابھی نہیں ہوئی، اس کے حصّے کے علاوہ زرِ عروس کے لیے بھی چاندی دیں اور اس کی شادی کی جائے۔

سوتیلے بھائیوں کا ورثہ

۱۶۷۔ اگر کسی شخص نے نکاح کیا ہو اور اس بیوی سے اس کی اولاد ہو اور وہ بیوی فوت ہو جائے

اور اس کے بعد وہ کسی اور عورت سے نکاح کرلے اور اس دوسری بیوی سے بھی اس کی اولاد پیدا ہو، تو اس شخص کی وفات پر اس کی اولاد، اپنی ماؤں کے لحاظ سے ترکے کی تقسیم نہیں کریگی، بلکہ ان دونوں کا جہیز ان کی اپنی اپنی اولاد لے لیگی اور پدری ترکہ ان میں برابر برابر تقسیم ہوگا۔

عاق کرنا

۱۶۸۔ اگر کوئی شخص اپنے بیٹے کو عاق کرنے کا فیصلہ کرلے اور قاضی سے کہے کہ میں اپنے بیٹے کو عاق کرتا ہوں، تو قاضی اس کی وجوہ کی تفتیش کرے۔ اگر بیٹے نے کوئی ایسا بھاری جرم نہیں کیا، جو اُسے فرزندی سے خارج کرنے کے لیے کافی سمجھا جا سکتا ہے، تو باپ اپنے بیٹے کو فرزندی سے عاق نہیں کرسکتا۔

۱۶۹۔ اگر اس نے اپنے باپ کے خلاف کوئی ایسا بھاری جرم کیا ہے، جو اسے فرزندی سے خارج کردینے کے لیے کافی وجہ قرار دیا جاسکتا ہے، تو اس کے پہلے قصور پر اسے صرف تنبیہ کی جائے۔ اگر وہ دوبارہ کوئی بھاری جرم کرے، تو اس کا باپ بیشک، اسے فرزندی سے عاق کردے۔

لونڈی کی اولاد

۱۷۰۔ اگر کسی شخص کے اپنی بیوی سے بھی اولاد ہو اور لونڈی سے بھی اولاد ہو، اور باپ نے اپنی زندگی میں لونڈی کی اولاد کو "میرے بچے" کہ کر پکارا ہو اور انھیں اپنی بیاہتا بیوی کے بچوں کے ساتھ شمار کیا ہو اور بعد کو اس شخص کی وفات ہوجائے، تو بیوی اور لونڈی دونوں کی اولاد، اپنے پدری ترکے میں برابر کی حصّے دار ہے۔ ہاں، بٹوارے میں بیوی کی اولاد قرعہ ڈال کر اپنا حصّہ پہلے چُن لے۔

۱۷۱ (الف)۔ اور اگر باپ نے اپنی زندگی میں لونڈی کی اولاد کو "میرے بچے" کہ کر مخاطب نہیں کیا اور بعد کو باپ کی وفات ہوجائے، تو لونڈی کی اولاد بیاہتا بیوی کی اولاد کے ساتھ ورثے میں حصّے دار نہیں ہوگی۔ البتہ اب وہ لونڈی اور اس کے بچے غلامی سے آزاد کردیے جائینگے اور بیاہتا بیوی کی اولاد، لونڈی کے بچوں سے خدمت لینے کی حقدار نہیں ہے۔

بیوی کا ورثہ

۱۷۱ (ب)- بیاہتا بیوی اپنا جہیز اور وہ مال سامان، جو اس کے خاوند نے خاص طور پر اس کے نام ہبہ کیا ہو اور جس کے لیے مُہری تختی لکھی گئی ہو، لے لیگی اور وہ اپنے (متوفی) خاوند کے مکان میں مقیم رہیگی - وہ اپنی حینِ حیات اس سے فائدہ اُٹھاسکتی ہے، لیکن اس کو چاندی کے عوض میں فروخت نہیں کرسکتی۔ اس کی وفات کے بعد یہ اس کی اولاد کو منتقل ہوجائیگا۔

۱۷۲ (الف)۔ اگر اس کے متوفی خاوند نے اس کے نام کوئی چیز ہبہ نہیں کی تھی، تو اس کا جہیز اسے واپس دے دیا جائے اور وہ اپنے خاوند کے ترکے میں سے ایک لڑکے کے برابر حصّہ لے لے۔ اگر اس کی اولاد اسے مکان سے نکالنے کی خاطر دق کرے، تو قاضی معاملے کی تفتیش کرے اور اگر اولاد کا قصور ہے، تو وہ عورت اپنے خاوند کے مکان سے نہیں نکالی جائیگی۔

۱۷۲ (ب)۔ اگر وہ عورت خود ہی چلی جانے کا فیصلہ کرلے، تو اس کے خاوند نے جو کچھ اس کے نام ہبہ کیا تھا، وہ اسے اپنی اولاد کے حوالے کرے۔ ہاں جو جہیز وہ اپنے باپ کے گھر سے لائی تھی، وہ اسے اپنے پاس رکھے اور اس کی پسند کا مرد اسے اپنے عقدِ نکاح میں لے لے۔

جہیز کے وارث

۱۷۳۔ اگر اس عورت کے، جہاں وہ گئی ہے، یعنی دوسرے خاوند سے بھی اولاد ہو اور بعد کو وہ عورت فوت ہوجائے، تو اس کے جہیز کی وارث اس کے پہلے اور دوسرے خاوند دونوں کی اولاد ہوگی۔

۱۷۴۔ اگر دوسرے خاوند سے اس کی کوئی اولاد نہیں، تو اس کی پہلے خاوند سے اولاد ہی اس کی وارث ہوگی۔

آزاد عورت کے حقوق

۱۷۵۔ اگر کسی حویلی کا غلام، یا کسی عامی کا غلام کسی آزاد شہری کی بیٹی سے نکاح کرلے اور اس سے اس کے اولاد ہو، تو غلام کا مالک اس آزاد شہری کی اولاد سے خدمت لینے کا کوئی حق

نہیں رکھتا۔

۱۷۶ (الف)۔ اور اگر کسی حویلی کا غلام یا کسی عامی کا غلام، کسی آزاد شہری کی بیٹی سے نکاح کرے، اور جب وہ عورت شادی کرلے اور اپنے باپ کے گھر سے جہیز لے کر اس حویلی کے غلام یا عامی کے غلام کے گھر میں آجائے، اور جب وہ گھر بسا کر رہنے لگیں اور جایداد پیدا کرلیں اور بعد کو وہ حویلی کا غلام یا عامی کا غلام فوت ہوجائے، تو آزاد شہری کی بیٹی (ترکے میں سے پہلے) اپنا جہیز لے لے اور جو کچھ اس نے اور اس کے متوفی شوہر نے گھر بسانے کے بعد پیدا کیا تھا، اس کے دو برابر برابر حصے کیے جائیں۔ ایک حصہ غلام کا مالک لے لے اور دوسرا آزاد شہری کی بیٹی اپنی اولاد کے لیے لے لے۔

۱۷۶ (ب)۔ اگر آزاد شہری کی بیٹی کوئی جہیز نہیں لائی تھی، تو جو کچھ اس نے اور اس کے متوفی شوہر نے گھر بسانے کے بعد پیدا کیا تھا، اس کے دو حصے کیے جائیں۔ آدھا غلام کا مالک لے لے اور آدھا آزاد شہری کی بیٹی اپنی اولاد کے لیے لے لے۔

نابالغ اولاد

۱۷۷۔ اگر کوئی بیوہ، جس کے چھوٹے چھوٹے نابالغ بچے ہوں، دوسرا نکاح کرنے کا فیصلہ کرلے، تو وہ قاضی کی منظوری کے بغیر ایسا نہیں کرسکتی۔ جب وہ دوسرا نکاح کرے، تو قاضی اس کے متوفی شوہر کے ترکے کی تحقیق کرے۔ اس کے متوفی شوہر اور اس عورت کی جایداد بطور امانت، اس کے دوسرے خاوند کے سپرد کی جائے اور ایک تختی (پر جایداد کی فہرست لکھ کر) ان کے حوالے کی جائے۔ وہ دونوں متوفی شوہر کے ترکے کی دیکھ بھال کریں۔ وہ کسی چیز کو چاندی کے عوض میں فروخت نہیں کرسکتے۔ اگر کوئی خریدار کوئی ایسی چیز خریدے، جس پر اس بیوہ کے بچوں کا حق ہے، تو اس کی چاندی ضبط کرلی جائے اور وہ چیز اصل مالک کو بحال کی جائے۔

مذہبی عورتوں کی وراثت

۱۷۸۔ اگر کسی مقدس راہبہ یا پجارن یا دیوداسی کو اس کا باپ جہیز دے اور تختی لکھی جائے، لیکن تختی

میں یہ نہ لکھا ہو کہ اپنے مرنے پر وہ جو ترکہ چھوڑے، اس کو جسے چاہے دے، جا سکتی ہے اور نہ اسے اس کے بیچنے کی آزادی دی جا سکتی ہے اور نہ اسے اس کے بیچنے کی آزادی دی جائے اور پھر باپ فوت ہو جائے، تو اس عورت کے بھائی، اس کا کھیت یا میوہ باغ لے لیں اور اس کے حصے کی قیمت کے مطابق اسے اناج اور تیل اور اُون دیتے رہیں اور چاہیے کہ وہ اس پر قانع رہے۔ اگر اس کے بھائی اسے اس کے حصے کی قیمت کے برابر اناج اور تیل اور اُون نہ دیں اور وہ اس پر قانع نہ ہو، تو اس کا کھیت یا میوہ باغ، اس کی پسند کے کسی مزارع کے سپرد کر دیا جائے۔ اور اس کا مزارع اس کا کفیل رہے۔ جب تک وہ عورت زندہ رہے، وہ کھیت اور میوہ باغ اور جو کچھ اور بھی اس کے باپ نے اسے دیا تھا، اس سے لطف اندوز ہوتی رہیگی۔ لیکن وہ نہ تو اسے چاندی کے بدلے میں فروخت کر سکتی ہے، نہ کسی اور کے نام منتقل کر سکتی ہے۔ اس کے وارث اس کے بھائی ہیں۔

۱۷۹۔ اگر کسی مقدس راہبہ یا پجارن یا دیوداسی کو اس کا باپ جہیز دے اور دستاویز لکھی جائے اور تختی میں لکھ دے کہ وہ اپنے ترکے کو جس کے نام چاہے چھوڑ جا سکتی ہے اور اسے جایداد کے بیچنے کی پوری آزادی ہے، تو جب اس کا باپ فوت ہو جائے، وہ اپنا ترکہ جسے چاہے، دے جائے۔ اس کے بھائی کوئی مطالبہ نہیں کر سکتے۔

۱۸۰۔ اگر کوئی شخص اپنی اس بیٹی کو جہیز نہ دے، جو کسی خانقاہ میں پجارن ہے، یا دیوداسی ہے، تو وہ باپ کی وفات کے بعد پورے ترکے میں سے ایک بیٹے کے حصے کے برابر لیگی۔ وہ تاحینِ حیات اس سے مستفید ہو۔ اس کے ترکے کے وارث اس کے بھائی ہونگے۔

۱۸۱۔ اگر کوئی شخص اپنی بیٹی کو خدا کے نام پر پجارن یا قدیسہ یا مندر کی کنواری بنانے کی منت مانے اور اسے کوئی جہیز نہ دے، تو باپ کی وفات کے بعد وہ عورت پدری ترکے میں سے ایک بیٹے کے حصے کا ایک تہائی لے لے۔ وہ حینِ حیات اس سے مستفید ہو۔ اس کے ترکے کے وارث اس کے بھائی ہیں۔

۱۸۲۔ اگر کوئی شخص اپنی بیٹی کو جہیز نہ دے اور وہ بابل کے مردوخ (دیوتا) کی پجارن ہو، اور نہ دستاویز لکھے، تو جب باپ فوت ہو جائے، وہ عورت پدری ترکے میں سے، اپنے بھائیوں کے ساتھ

ایک بیٹے کے حصّے کا ایک تہائی لیگی۔ لیکن اس کا انتظام اس کے حوالے نہیں کیا جائیگا۔ "مردوخ کی پجارن" اپنا ترکہ، جس کے نام چاہے، چھوڑ جائے۔

داشتہ کی بیٹی کا حصّہ

۱۸۳۔ اگر کوئی باپ، اپنی زندگی میں، کسی داشتہ کے بطن سے اپنی بیٹی کو جہیز مہیّا کرے اور اس کا نکاح کردے اور اس سے متعلّق دستاویز لکھ کے اسے دے دے؛ پھر وہ شخص فوت ہوجائے، تو اب وہ پورے ترکے میں حصّہ دار نہیں ہوگی۔

۱۸۴۔ اگر باپ نے حینِ حیات، اپنی داشتہ کے بطن سے بیٹی کو جہیز مہیّا نہ کیا ہو، نہ اس کا نکاح ہی کیا ہو، تو جب اس کی وفات ہوجائے، اس کے بھائی پدری جایداد کی حیثیت کے مطابق اسے جہیز دیں اور اس کا نکاح کردیں۔

متبنّیٰ

۱۸۵۔ اگر کوئی شخص، کسی شیرخوار بچّے کو اپنے نام پر متبنّیٰ کرے اور اسے پال پوس کر بڑا کرے، تو اس متبنّیٰ بیٹے کی واپسی کا مطالبہ نہیں کیا جاسکتا۔

۱۸۶۔ اگر کوئی شخص کسی شیرخوار بچّے کو متبنّیٰ کرے اور اسے لے لینے کے بعد اس کے باپ اور اس کی ماں سے بدسلوکی سے پیش آئے، تو وہ متبنّیٰ لڑکا، اپنے حقیقی باپ کے گھر واپس چلا جائے۔

۱۸۷۔ کسی ملازم یا حویلی کے دربان، یا دیوداسی کے متبنّیٰ بیٹے کی واپسی کا مطالبہ نہیں کیا جاسکتا۔

۱۸۸۔ اگر کوئی عامی، کسی بچے کو متبنّیٰ کرے اور اسے اپنا ہنر سکھائے تو اب اس بچے کی واپسی کا مطالبہ نہیں کیا جاسکتا۔

۱۸۹۔ اگر اس نے اسے اپنا پیشہ نہ سکھایا ہو، تو وہ متبنّیٰ لڑکا اپنے حقیقی باپ کے گھر واپس جاسکتا ہے۔

۱۹۰۔ اگر کوئی شخص کسی شیرخوار بچے کو گود لے اور اسے پال پوس کر بڑا کرے، لیکن اس نے اسے اپنے بچوں کے ساتھ شمار نہ کیا ہو، تو وہ متبنّیٰ لڑکا اپنے حقیقی باپ کے گھر واپس جاسکتا ہے۔

۱۹۱۔ اگر کسی شخص نے، کسی شیر خوار بچے کو گود لیا ہو اور اس کی پرورش کی ہو اور پھر اس نے اپنا گھر بار بسالیا ہو اور اس کی اپنی اولاد ہو جائے، تو اب اگر وہ اس متبنّیٰ لڑکے سے دست بردار ہونا چاہے، تو وہ لڑکا یوں نہیں چل دیگا۔ اس کا اتکہ اسے اپنی جایداد میں سے ایک بیٹے کے حصّے کا ایک تہائی سازو سامان دے اور پھر وہ لڑکا چلا جائے۔ ہاں، البتہ وہ شخص اس لڑکے کو کھیت یا میوہ باغ یا مکان نہ دے۔

۱۹۲۔ اگر کسی ملازم یا دیوداسی کا متبنّیٰ بیٹا اپنے اتکہ یا انّا سے کہے کہ "تم میرے باپ نہیں ہو" یا "تم میری ماں نہیں ہو"، تو اس کی زبان کاٹ دی جائے۔

۱۹۳۔ اگر کسی ملازم یا دیوداسی کا متبنّیٰ بیٹا حقیقی باپ کے مکان کو جان گیا ہے اور اس وجہ سے وہ اپنے اتکہ یا انّا کو حقارت کی نظر سے دیکھے اور اپنے باپ کے گھر آئے جائے، تو اس کی آنکھیں نوچ ڈالی جائیں۔

دایہ کی ذمّہ داری

۱۹۴۔ اگر کوئی شخص اپنا بچہ دایہ کے سپرد کرے اور وہ بچہ دایہ کے پاس فوت ہو جائے اور دایہ اس کے باپ اور اس کی ماں کے علم کے بغیر اس کی جگہ دوسرا بچہ رکھ دے، تو اس پر مقدّمہ چلایا جائے۔ اور چونکہ اس نے اس کے باپ اور اس کی ماں کے علم کے بغیر دوسرا بچہ رکھ دیا ہے، اس لیے اس کی چھاتیاں کاٹ ڈالی جائیں۔
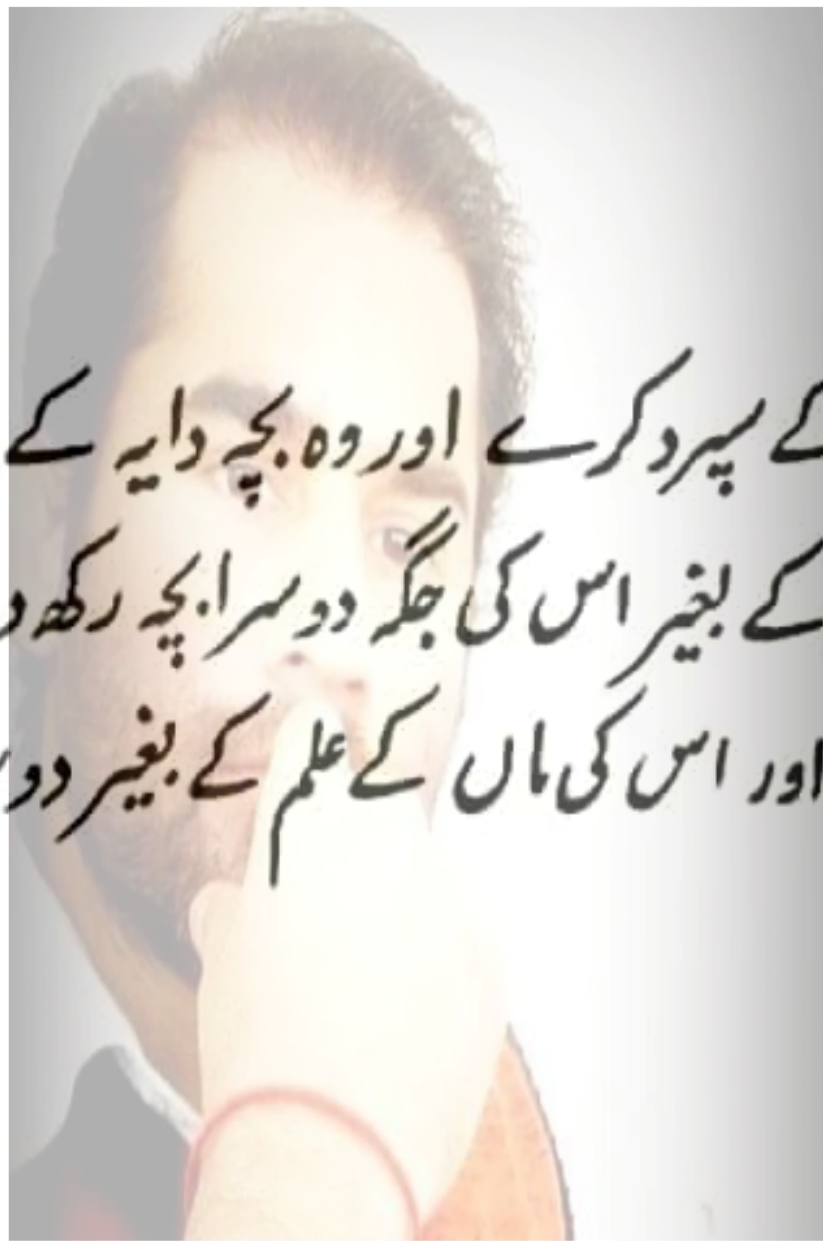
ضربات اور زخمی کرنا

۱۹۵۔ اگر کوئی بیٹا اپنے باپ پر ہاتھ اٹھائے، تو اس کے ہاتھ کاٹ ڈالے جائیں۔

۱۹۶۔ اگر کوئی شخص، کسی آزاد شہری کی آنکھ بیکار کر دے، تو اس کی اپنی آنکھ نکال دی جائے۔

۱۹۷۔ اگر وہ کسی آزاد شہری کی ہڈی توڑ ڈالے، تو اس کی اپنی ہڈی توڑ ڈالی جائے۔

۱۹۸۔ اگر وہ کسی عامی کی آنکھ بیکار کر دے، یا کسی عامی کی ہڈی توڑ ڈالے، تو وہ ایک "من" چاندی (تاوان) ادا کرے۔

۱۹۹۔ اگر وہ کسی شخص کے غلام کی آنکھ بیکار کر دے، یا کسی شخص کے غلام کی ہڈی توڑ ڈالے، تو وہ اس غلام کی قیمت کا نصف ادا کرے۔

۲۰۰۔ اگر کوئی شخص کسی اپنے ہم مرتبہ شخص کے دانت توڑ ڈالے، تو اس کے دانت توڑ ڈالے جائیں۔

۲۰۱۔ اگر اس نے کسی عامی کے دانت توڑے ہوں، تو وہ ⅓ "من" چاندی ادا کرے۔

۲۰۲۔ اگر کوئی شخص، اپنے سے اونچے طبقے کے کسی آدمی پر حملہ کرے، تو اسے بھری سبھا میں گائے کے چمڑے کے بنے ہوئے تازیانے سے ۶۰ ضربیں لگائی جائیں۔

۲۰۳۔ اگر کوئی آزاد شہری، اپنے ہم مرتبہ کسی دوسرے آزاد شہری کے بیٹے پر حملہ کرے، تو وہ ایک "من" چاندی ادا کرے۔

۲۰۴۔ اگر کوئی عوام کے طبقے کا آدمی، کسی دوسرے عامی پر حملہ کرے، تو وہ دس شیکل چاندی ادا کرے۔

۲۰۵۔ اگر کسی شخص کا غلام، کسی آزاد شہری کے بیٹے پر حملہ کرے، تو اس کا کان کاٹ دیا جائے۔

۲۰۶۔ اگر کوئی شخص تکرار کرتے ہوئے، کسی دوسرے شخص پر حملہ کر دے اور اسے زخمی کر دے، تو وہ قسم اٹھائے کہ "میں نے جان بوجھ کر اسے نہیں مارا تھا" اور وہ ڈاکٹر کا خرچ ادا کرے۔

۲۰۷۔ اگر وہ شخص، ضرب کے نتیجے میں مر جائے، تو بھی وہ اسی طرح قسم اٹھائے۔ اور اگر متوفی، کسی آزاد شہری کا بیٹا تھا، تو وہ شخص ½ "من" چاندی ادا کرے۔

۲۰۸۔ اگر وہ کسی عامی کا بیٹا تھا، تو وہ شخص ⅓ "من" چاندی ادا کرے۔

۲۰۹۔ اگر کوئی شخص کسی آزاد شہری کی بیٹی کو مارے، جس سے اس کا حمل ساقط ہو جائے، تو وہ حمل کے لیے دس شیکل چاندی ادا کرے۔

۲۱۰۔ اگر وہ عورت، ضرب کے صدمے سے مر جائے، تو اس شخص کی بیٹی قتل کر دی جائے۔

۲۱۱۔ اگر اس کی ضرب کے صدمے سے کسی عامی کی بیٹی کا حمل ساقط ہو جائے تو وہ پانچ شیکل چاندی ادا کرے۔

۲۱۲۔ اگر وہ عامی عورت فوت ہو جائے، تو وہ ½ "من" چاندی ادا کرے۔

۲۱۳۔ اگر وہ کسی شخص کی لونڈی کو مارے، جس سے اس کا حمل ساقط ہو جائے، تو وہ دو شیکل چاندی

ادا کرے۔

۲۱۴۔ اگر وہ لونڈی مر جائے تو وہ شخص ⅓ "من" چاندی ادا کرے۔

طبیب کی فیس اور ذمہ داری

۲۱۵۔ اگر ڈاکٹر کسی آزاد شہری کے کسی شدید زخم کا علاج دھات کے چاقو سے کرے اور اس آزاد شہری کو تندرست کر دے، یا کسی آزاد شہری کی آنکھ کے ڈھیلے پر دھات کے چاقو سے عمل جرّاحی کرے اور اس کی آنکھ بنا دے، تو اسے دس شیکل چاندی فیس دی جائے۔

۲۱۶۔ اگر وہ مریض کسی عامی کا بیٹا تھا، تو اسے پانچ شیکل چاندی فیس دی جائے۔

۲۱۷۔ اگر وہ مریض کسی کا غلام تھا، تو غلام کا مالک ڈاکٹر کو دو شیکل چاندی ادا کرے۔

۲۱۸۔ اگر کوئی ڈاکٹر کسی شخص کے کسی شدید زخم کا علاج دھات کے چاقو سے کرے، جس سے اس شخص کی موت واقع ہو جائے، یا چاقو سے کسی شخص کے ڈھیلے پر عمل جرّاحی کرے اور اس سے اس شخص کی آنکھ بیکار ہو جائے، تو اس ڈاکٹر کے ہاتھ کاٹ ڈالے جائیں۔

۲۱۹۔ اگر کوئی ڈاکٹر کسی عامی کے غلام کے کسی شدید زخم کا علاج دھات کے چاقو سے کرے، جس سے اس غلام کی موت واقع ہو جائے تو وہ غلام کی جگہ غلام دے۔

۲۲۰۔ اگر وہ اس غلام کے ڈھیلے میں چاقو سے شگاف دے، جس سے اس کی آنکھ بیکار ہو جائے تو وہ اس غلام کی قیمت کے نصف کے برابر چاندی ادا کرے۔

۲۲۱۔ اگر کوئی ڈاکٹر کسی آزاد شہری کی ٹوٹی ہوئی ہڈی جوڑ دے، یا اس کا سڑا ہوا گوشت ٹھیک کر دے، تو مریض ڈاکٹر کو پانچ شیکل چاندی فیس ادا کرے۔

۲۲۲۔ اگر وہ مریض کسی عامی کا بیٹا ہو، تو وہ تین شیکل چاندی فیس ادا کرے۔

۲۲۳۔ اگر وہ مریض کسی کا غلام ہے، تو غلام کا مالک ڈاکٹر کو دو شیکل چاندی فیس دے۔

سالوتری کی فیس اور ذمہ داری

۲۲۴۔ اگر بیلوں اور گدھوں کا معالج کسی بیل یا گدھے کے شدید زخم کا علاج کرے اور اسے

ٹھیک کر دے، تو بیل یا گدھے کا مالک، سالوتری کو ۱/۶ شیکل چاندی فیس ادا کرے۔

۲۲۵۔ اگر وہ بیل یا گدھے کے شدید زخم کا علاج کرے اور اس سے جانور مر جائے، تو سالوتری، جانور کی قیمت کا ایک چوتھائی بیل یا گدھے کے مالک کو ادا کرے۔

داغ لگانے والا

۲۲۶۔ اگر کوئی داغ لگانے والا، کسی غلام کے مالک کے علم کے بغیر، اس غلام کو "ناقابلِ انتقال غلام" والا داغ لگا دے تو اس داغ لگانے والے کے ہاتھ قطع کر دیے جائیں۔

۲۲۷۔ اگر کوئی شخص، کسی داغ لگانے والے کو دھوکا دے کر اس سے "ناقابلِ انتقال غلام" داغوا لے تو اس شخص کو قتل کر کے اسی کے مکان میں گاڑ دیا جائے۔ داغ لگانے والا قسم کھائے کہ "میں نے اصلیت جانتے ہوئے اسے داغ نہیں لگایا" اور وہ بےقصور سمجھا جائے۔

معمار۔ راج

۲۲۸۔ اگر کوئی راج، کسی شخص کا مکان تعمیر کرے، اور اسے مکمل کر دے، تو مالک راج کو مکان کے رقبے کے لیے دو شیکل چاندی فی "شر" کے حساب سے اُجرت ادا کرے۔

۲۲۹۔ اگر کوئی راج کسی شخص کا مکان تعمیر کرے اور اس کا کام پختہ نہ ہو، یا جو مکان اس نے تعمیر کیا تھا، وہ بیٹھ جائے اور اس سے مالکِ مکان ہلاک ہو جائے، تو وہ راج قتل کر دیا جائے۔

۲۳۰۔ اگر مالکِ مکان کا بچہ ہلاک ہو جائے، تو راج کا بچہ قتل کر دیا جائے۔

۲۳۱۔ اگر مالکِ مکان کا غلام ہلاک ہو جائے، تو راج مالکِ مکان کو غلام کی جگہ غلام دے۔

۲۳۲۔ اگر کچھ سامان ضائع ہو جائے، تو راج، نقصان کی تلافی کرے اور چونکہ جو مکان اس نے تعمیر کیا تھا، وہ پایدار نہیں تھا، جس سے وہ گر گیا، اس لیے وہ اپنے مسالے سے نیا مکان تعمیر کر کے دے۔

۲۳۳۔ اگر کوئی راج، کسی شخص کا مکان تعمیر کرے اور اس نے کام اچھی طرح نہیں کیا اور مکان کی دیوار اپنی جگہ سے سرک جائے، تو وہ راج اس دیوار کو اپنے خرچ پر ٹھیک کر کے دے۔

کشتی ساز

۲۳۴۔ اگر کوئی جہاز ساز کسی شخص کے لیے ۶۰ ٹن کی کشتی تیار کرے تو وہ شخص اسے بطور اجرت (۲) شیکل چاندی ادا کرے۔

۲۳۵۔ اگر کوئی جہاز ساز کسی شخص کے لیے کشتی تیار کرے اور اس کا کام پایدار نہ ہو، جس سے وہ کشتی سال کے اندر اندر بیکار ہو جائے، تو جہاز ساز، اس کشتی کی پڑتال کرے اور اپنے خرچ پر اسے مستحکم کرے اور یہ مستحکم کشتی مالک کو واپس دے۔

ملاّح

۲۳۶۔ اگر کوئی شخص، اپنی کشتی کسی ملاّح کو کرایے پر دے اور ملاّح بے احتیاطی سے کام لے، جس سے کشتی ڈوب جائے اور ضائع ہو جائے تو وہ ملاّح اس شخص کو کشتی کی جگہ کشتی دے۔

۲۳۷۔ اگر کوئی شخص کشتی اور ملاّح کرایے پر لے اور کشتی پر غلّہ، اون، تیل، کھجوریں یا کوئی اور مال بار کر دے، اور اگر وہ ملاّح بے احتیاطی سے کام لے اور کشتی ڈبو دے اور کھیپ ضائع ہو جائے، تو ملاّح کشتی کی جگہ، جو اس نے ڈبوئی ہے، کشتی اور پوری کھیپ بھر کر دے، جو اس نے ضائع کی۔

۲۳۸۔ اگر کوئی ملاّح کسی شخص کی کشتی ڈبو دینے کے بعد اسے دوبارہ ترا دے تو وہ اس کی آدھی قیمت کی چاندی ادا کرے۔

۲۳۹۔ اگر کوئی شخص کسی ملاّح کو ملازم رکھے، تو وہ اسے (۶) گر، غلّہ سالانہ مزدوری دے۔

۲۴۰۔ اگر کوئی گشتی جہاز، کسی لدا دکشتی سے ٹکرا جائے اور اسے ڈبو دے، تو غرق شدہ کشتی کا مالک اپنے تمام نقصان کا مطالبہ خدا کے سامنے کرے، گشتی جہاز (کا مالک) غرق شدہ لدا دکشتی (کے مالک) کو کشتی کی اور کھیپ کی قیمت ادا کرے۔

زراعت پیشہ زمیندار کا بیل

۲۴۱۔ اگر کوئی شخص کسی کا بیل روک لے، تو وہ (۱۳) "من" چاندی جرمانہ ادا کرے۔

۲۴۲۔ اگر کوئی شخص، کھیتی یا بار برداری کا بیل، سال بھر کے لیے کرایے پر لے، تو اس کی اُجرت (۴) "گر" غلہ ہے۔

۲۴۳۔ ایک دودھیل گائے کا سالانہ کرایہ (۳) "گر" غلہ اس کے مالک کو دیا جائے۔

۲۴۴۔ اگر کوئی شخص بیل یا گدھا کرایے پر لے اور شیر اسے باہر کھُلی جگہ میں ہلاک کردے، تو یہ نقصان مالک کا ہے۔

۲۴۵۔ اگر کوئی شخص بیل کرایے پر لے اور اس کی غفلت یا مار پیٹ سے یہ مرجائے، تو وہ بیل کے مالک کو بیل کی جگہ بیل لاکر دے۔

۲۴۶۔ اگر کوئی شخص بیل کرایے پر لے اور اس کی ٹانگ توڑ دے یا اس کی گردن کا منکا کاٹ ڈالے، تو وہ بیل کے مالک کو بیل کی جگہ بیل لاکر دے۔

۲۴۷۔ اگر کوئی شخص بیل کرایے پر لے اور اس کی آنکھ پھوڑ دے، تو وہ بیل کے مالک کو اس کی قیمت کے نصف کے برابر چاندی ادا کرے۔

۲۴۸۔ اگر کوئی شخص بیل کرایے پر لے اور اس کا سینگ توڑ ڈالے، یا اس کی دُم کاٹ دے یا اس کی تھوتھنی زخمی کردے، تو وہ اس کی قیمت کی ایک چوتھائی کے برابر چاندی ادا کرے۔

۲۴۹۔ اگر کوئی شخص بیل کرایے پر لے، اور خدا اسے ہلاک کردے، تو جس شخص نے بیل کرایے پر لیا تھا، وہ خدا کے نام کی قسم کھائے اور وہ بیقصور ٹھہرایا جائے۔

.. کا قانون

۲۵۰۔ اگر کوئی مست سانڈ، شارع عام میں کسی شخص پر حملہ کردے اور اس کے سینگ بھونک دے اور اسے ہلاک کردے، تو اس حادثے میں کوئی چارہ جوئی نہیں ہوسکتی۔

۲۵۱۔ اگر کسی شخص کو معلوم ہو کہ میرا بیل سینگ مارنے کا عادی ہے۔ اور وہ نہ اس کے سینگ کند کرے، نہ اپنے بیل کو باندھ کر رکھے، تو اگر اس کا بیل کسی آزاد شہری کے سینگ بھونک دے اور اسے ہلاک کردے، تو وہ نصف "من" چاندی ادا کرے۔

۲۵۲۔ اگر متوفی کسی کا غلام ہو، تو وہ ⅓ من چاندی ادا کرے۔

مزارع

۲۵۳۔ اگر کوئی شخص، اپنا کھیت کسی دوسرے آدمی کو رہنے کے لیے ٹھیکے پر دے، اور اسے بیج کے لیے غلّہ دے، اور ہل جوتنے کے لیے بیل اس کے حوالے کرے، اور اس سے معاہدہ کرے، کہ وہ کھیت میں کاشت کریگا، تو اگر وہ دوسرا آدمی تقاوی یا فصل میں سے چوری کر لے اور یہ اس کے قبضے سے مل جائے، تو اس کے ہاتھ کاٹ دیے جائیں۔

۲۵۴۔ اگر وہ شخص تقاوی وصول کر لے، لیکن اس نے بیلوں کو خستہ اور کمزور کر دیا ہو (جس سے وہ ہل چلانے کے قابل نہ رہے ہوں) تو وہ مزارع بیلچے، کھرپے سے کاشت کر کے غلّہ پورا کرے۔

۲۵۵۔ اگر وہ بیلوں کو آگے کرایے پر دے دے، یا تقاوی کا غلّہ چرا لے اور کھیت میں نہ بوئے، تو اس شخص پر مقدمہ قائم کیا جائے، اور وہ (۱۰) "گر" فی "گن" کے حساب سے غلّہ ادا کرے۔

۲۵۶۔ اگر وہ مزارع اتنا تاوان ادا کرنے کے قابل نہیں، تو اسے بھی مویشیوں کے ساتھ کھیت میں کام پر لگا دیا جائے۔

مزدور

۲۵۷۔ اگر کوئی شخص کھیت میں کام کرنے کے لیے مزدور ملازم رکھے، تو اسے (۸) "گر" غلّہ سالانہ مزدوری دے۔

چرواہا

۲۵۸۔ اگر کوئی شخص کسی چرواہے کو ملازم رکھے تو اسے (۶) "گر" غلّہ سالانہ مزدوری دے۔

زرعی سامان کی چوری

۲۵۹۔ اگر کوئی شخص کسی کے علاقے سے پن چرخی چرا لے تو وہ چرخی کے مالک کو پانچ شیکل چاندی ہرجانہ دے۔
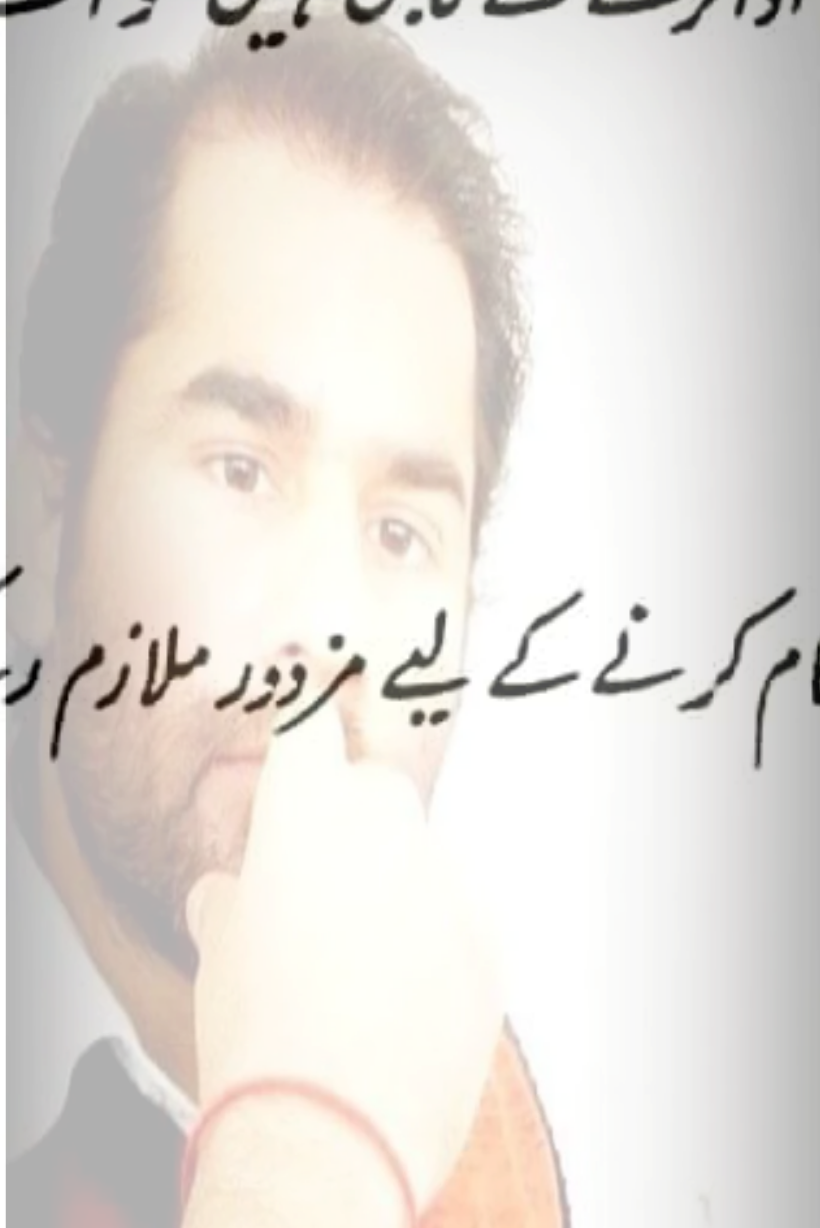
۲۶۰۔ اگر اس نے پرسایا سراون چُرایا ہو، تو وہ تین شیکل چاندی دے۔

گھسیارا

۲۶۱۔ اگر کوئی شخص مویشی اور بھیڑوں کے لیے گھسیارا ملازم رکھے، تو وہ اسے (۸) "گر" غلّہ سالانہ اُجرت ادا کرے۔

۲۶۲۔ اگر کوئی بیل یا بھیڑ ... (باقی حصّہ مٹا ہوا ہے)

چرواہے کی ذمّہ داری

۲۶۳۔ اگر کوئی شخص بیل یا بھیڑ، جو اس کے سپرد کی گئی تھی، گم کردے، تو وہ مالک کو بیل کی جگہ بیل اور بھیڑ کی جگہ بھیڑ پوری کر کے دے۔

۲۶۴۔ اگر کوئی چرواہا، جس کے سپرد مویشی یا بھیڑیں چرانے کے لیے کی گئی تھیں، اور اس کی مقرّر کردہ اُجرت اسے ادا کردی گئی ہے اور وہ اس پر رضامند تھا، ان مویشیوں کو گھٹا دے یا بھیڑوں کو گھٹا دے اور ان کی نسل کم ہو جائے، تو وہ معاہدہ کے مطابق گنتی اور نسل پوری کر کے دے۔

۲۶۵۔ اگر کوئی چرواہا، جس کے سپرد مویشی اور بھیڑیں چرانے کے لیے کی گئی تھیں، جھوٹ سے کام لے اور معاہدے کو بدل ڈالے اور (جانوروں کو) چاندی کے عوض میں بیچ دے، تو اس پر مقدمہ قائم کیا جائے۔ جتنے مویشی یا بھیڑیں، اس نے چوری کی ہیں، وہ ان سے دس گنی مالک کو واپس دے۔

۲۶۶۔ اگر باڑے پر خدا کا غضب نازل ہو، یا (جانوروں کو) کوئی شیر ہلاک کردے، تو اس صورت میں چرواہا، اپنے آپ کو خدا کے سامنے (قسم کھا کر) بیگناہ ثابت کرے اور باڑے کا مالک باڑے پر آمدہ مصیبت خود برداشت کرے۔

۲۶۷۔ اگر قصور چرواہے کا ہے اور اس کی غفلت سے باڑے کا نقصان ہوا ہے، تو اس صورت میں چرواہا نقصان شدہ مویشی اور بھیڑیں پوری کر کے مالک کو واپس کرے۔

جانوروں کا کرایہ

۲۶۸۔ اگر کوئی شخص گاہنے کے لیے بیل کرایے پر لے، تو اس کا کرایہ دس قاع غلّہ ہے۔

۲۶۹۔ اگر گاہنے کے لیے گدھا کرایے پر لیا جائے، تو اس کا کرایہ دس قاع غلّہ ہے۔

۲۷۰۔ اگر گاہنے کے لیے کسی اور جانور کا چھوٹا بچہ کرایے پر لیا جائے، تو کرایہ ایک قاع غلّہ ہے۔

۲۷۱۔ اگر کوئی شخص، مویشی اور چھکڑا اور گاڑیبان، سب کرایے پر لے، تو وہ (۱۸۰) قاع غلّہ روزانہ کے حساب سے کرایہ ادا کرے۔

۲۷۲۔ اگر کوئی شخص صرف چھکڑا کرایے پر لے، تو وہ (۴۰) قاع غلّہ دن کے حساب سے ادا کرے۔

کاریگروں اور پیشہ وروں کی اُجرت

۲۷۳۔ اگر کوئی شخص کسی کاریگر کو ملازم رکھے، تو سال کے شروع سے لے کر پانچویں مہینے تک اسے (۶) گرین چاندی روزانہ کے حساب سے اُجرت ادا کرے۔ پھر چھٹے مہینے سے لے کر سال کے آخر تک (۵) گرین روزانہ کے حساب سے دے۔

۲۷۴۔ اگر کوئی شخص طبقۂ عوام کے کسی فرد کو ملازم رکھے، تو

(ا)	...... کی اُجرت	۵۔ گرین چاندی
(ب)	کمہار کی اُجرت	۵۔ گرین چاندی
(پ)	جُلاہے کی اُجرت	۵۔ گرین چاندی
(ت)	راج کی اُجرت	... گرین چاندی
(ث)	... کی اُجرت	...... چاندی
(ج)	... کی اُجرت	...... چاندی
(چ)	بڑھئی کی اُجرت	۴۔ گرین چاندی
(ح)	چمار کی اُجرت	۴۔ گرین چاندی
(خ)	کشتی ساز کی اُجرت	.. گرین چاندی

(د) معمار کی اُجرت ۴ گرین چاندی
روزانہ کے حساب سے ادا کرے۔

کشتی کا کرایہ

۲۷۵۔ اگر کوئی شخص کشتی (؟) کرایے پر لے، تو اس کا کرایہ (۳) گرین چاندی روزانہ ہے۔
۲۷۶۔ اگر کوئی شخص سیلانی کشتی کرایے پر لے، تو وہ اس کا کرایہ ڈھائی گرین چاندی کے حساب سے ادا کرے۔
۲۷۷۔ اگر کوئی شخص (۶۰) ٹن کی کشتی کرایے پر لے، تو ۱/۶ شیکل چاندی روزانہ کرایہ ادا کرے۔

غلام اور لونڈی

۲۷۸۔ اگر کوئی شخص غلام یا لونڈی خریدے اور مہینہ پورا ہونے سے پہلے پہلے اس میں مرگی کے آثار پائے جائیں، تو وہ اسے بائع کے پاس لے جائے اور خریدار ادا کردہ قیمت کے دام واپس لے لے۔
۲۷۹۔ اگر کوئی شخص غلام یا لونڈی خریدے اور ان کے خلاف کسی قسم کا مطالبہ ہو، تو اس کے لیے بائع جوابدہ ہے۔
۲۸۰۔ اگر کوئی شخص کسی دوسرے کے غلام یا لونڈی کو پردیس میں خرید لے، اور جب وہ واپس اپنے وطن آئے اور غلام یا لونڈی کا مالک اسے پہچان لے، تو اگر وہ اس ملک کے باشندے ہوں، تو وہ انھیں قیمت وصول کیے بغیر آزاد کر دے۔
۲۸۱۔ اگر وہ کسی دوسرے ملک کے باشندے ہوں، تو خریدار خدا کے سامنے قسم کھائے کہ میں نے ان کے لیے اتنی چاندی ادا کی تھی اور جتنی چاندی اس نے ادا کی تھی، غلام یا لونڈی کا مالک خریدار کے حوالے کرے اور اپنا غلام یا لونڈی واپس لے لے۔

۲۸۲۔ اگر کوئی غلام اپنے مالک سے کہے کہ "تم میرے مالک نہیں"، تو اس پر غلام کی حیثیت میں مقدمہ چلایا جائے اور اس کا مالک اس کے کان کاٹ دے۔

خاتمہ

صاحبِ عظمت وجلال بادشاہ حموربی نے یہ قانون نافذ کیے ہیں، تاکہ ان سے دنیا کو پوری پوری ہدایت ملے اور مہربان اور عادل حکومت قائم کی جائے۔

میں ہوں حموربی، رعایا کا محافظ۔ میں نے اس کالے سر کی قوم سے اپنا ہاتھ نہیں اٹھایا، جسے بعل نے میری سرپرستی میں دیا تھا اور جس کا مردوخ نے مجھے گلہ بان مقرر کیا تھا۔ میں نے خود کبھی چین نہیں لیا، جب تک ان کے لیے امن کا دور دورہ نہیں ہوگیا۔ میں نے مشکلوں کو آسان کیا اور چاروں طرف نور سے اجالا کر دیا ہے۔ ان زبردست ہتھیاروں سے، جو زکامہ اور عشتار نے مجھے دیے، اور اس عقل اور معاملہ فہمی کی قوت سے، جو ایا نے مجھے بخشی اور اس شجاعت سے، جو مردوخ نے مجھے عطا فرمائی، میں نے پہاڑی اور میدانی تمام دشمنوں کا قلع قمع کر دیا اور تمام وادیوں کو فتح کر لیا ہے۔ ملک خوشحال ہے اور باشندے امن سے مالا مال ہیں۔ میں نے پوری پوری کوشش کی، کہ ان کے لیے خوف کا کوئی سبب باقی نہ رہے۔ برگزیدہ دیوتاؤں نے مجھے "نجات دہندہ" مقرر کیا۔ میرا عصائے شاہی انصاف کا نشان ہے۔ میرا مبارک سایا، میری سرزمین پر ہے۔ سومر اور اکد کے باشندے میرے جگر گوشہ ہیں۔ امن کے زمانے میں میری فطری صلاحیتیں، ان کے بھائی بندوں کی رہنما ہیں، اور میری عقل ان کی محافظ ہے، تاکہ طاقتور، کمزور پر ظلم نہ کر سکے، یتیموں اور بیواؤں کو صحیح مشورہ میسر آسکے۔ بابل میں، جسے انو اور بعل نے سربلند کیا ہے، اور ای سجیلہ کے مندر میں، جس کی بنیادیں آسمان اور زمین کی طرح پایدار ہیں، قانون کے اعلان اور ملک کی ہدایت اور زیردست کی حمایت کے لیے، میں نے یہ اپنے قیمتی ارشادات اس کھمبے پر کندہ کروا دیے ہیں، اور عدل و انصاف کے بادشاہ کی حیثیت سے، اسے اپنی تمثال کے سامنے گڑوا دیا ہے۔

میں ہی وہ شاہنشاہ ہوں، جو دوسرے شہروں کے بادشاہوں سے سربلند ہے۔ میرے الفاظ کانٹے کے تول ہیں اور میری شجاعت بےنظیر ہے۔ شمس کے حکم سے، جو آسمان اور زمین کا عادل اعظم ہے، زمین میں میرے انصاف کا پرچا ہوگا۔ مردوخ کی نگرانی سے، جو میرا آقا ہے، میری یہ بارگاہ کبھی تباہی یا بربادی کا منہ نہیں دیکھیگی۔ ای سجیلہ کے مندر میں، جس سے مجھے عقیدت ہے۔ میرا نام ہمیشہ

زندہ رہیگا۔ جو مظلوم بھی انصاف کا طلبگار ہوگا، وہ میری تمثال کے حضور آئیگا کیونکہ میں عدل و انصاف کی مورتی ہوں۔ وہ اس کھمبے کے کتبے کو پڑھیگا اور میرے قیمتی احکام سے آگاہ ہوگا۔ کتبے کے لفظ، اس کے مطالبے میں اس کے رہنما ہونگے اور وہ اپنا حق حاصل کرسکیگا۔ اس کا دل باغ باغ ہوجائیگا اور وہ پکار اُٹھیگا "حمورابی بادشاہ، واقعی اپنی رعایا کا سچا باپ ثابت ہوا ہے۔ اس نے اپنے خداوند مردوخ کا حکم سب پر مسلط کردیا ہے اور بلندیوں میں اور پستیوں میں ہر جگہ اس نے مردوخ کا بول بالا کردیا ہے۔ اس نے اپنے آقا مردوخ کا دل خوش کیا اور مخلوق کو ابدی اطمینان بخشا ہے اور ملک میں امن قائم کردیا ہے"۔ یہ احکام پڑھ کر وہ میرے آقا مردوخ اور میری مالکہ زربانیت کے سامنے تہِ دل سے سربسجود ہوجائیگا، اور پوجا کے لائق محافظ روحیں جو ای سجیلہ کے مندر میں براجمان ہیں، میرے آقا مردوخ اور میری مالکہ زربانیت کے حضور روزانہ میری شفاعت کرینگی۔

مستقبل میں اور رہتی دنیا تک، ملک پر جو حکمران بھی ہوگا وہ اس منصفانہ قانون پر قائم رہیگا، جو میرے اس کھمبے پر کندہ ہے۔ وہ سلطنت کے قانون کو نہیں بدلیگا، جو میں نے بنایا ہے۔ نہ وہ اس ملک کے آہین کو جو میں نے نافذ کیا ہے، تبدیل کریگا۔ نہ وہ عمارتی یادگاروں کو خراب کریگا۔ اگر اس شخص میں عقل ہے اور وہ اپنے ملک میں امن قائم رکھنے کا خواہشمند ہے، تو وہ ان الفاظ پر عمل کریگا، جو میرے کھمبے پر لکھے ہیں۔ فتاویٰ اور اصول اور ملک کا قانون جو میں نے وضع کیے ہیں اور آہین و ضوابط جو میں نے بنائے ہیں، یہ کھمبا اسے بتائیگا۔ وہ کالے سر کے لوگوں پر حکومت کرے۔ وہ ان کے لیے ہدایتیں جاری کرے اور ان کے مقدمے فیصل کرے۔ وہ گمراہوں اور شریروں کو ملک بدر کردے اور اپنی رعایا کو خوش اور مطمئن رکھے۔

میں شاہِ عدل حمورابی ہوں، جسے شمس نے راستی عطا فرمائی ہے۔ میرا ہر قول جچا تلا ہے اور میرا عمل لاثانی۔ بلندی اور پستی ہیں، مَیں ہی وہ بگولا ہوں، جو چوٹیوں اور گھاٹیوں پر یکساں چھایا ہوا ہے۔ اگر وہ شخص ان الفاظ پر کاربند رہیگا، جو میں نے اس کھمبے پر کندہ کردیے ہیں اور میرے قانون سے رُوگردان نہیں ہوگا، نہ میرے احکام بدلیگا، نہ میری یادگاریں ڈھائیگا، تو میری دعا ہے کہ شمس اس شخص کی حکومت کو بھی میرے جتنا لمبا کردے، تاکہ وہ اپنی رعایا کی انصاف سے رہنمائی کرسکے۔

لیکن اگر وہ شخص میرے ان الفاظ پر توجہ نہ کرے، جو میں نے اس کھمبے پر لکھے ہیں، نہ میری بد دعا کی پروا کرے، نہ خدا کی لعنت سے ڈرے اور میرا نافذ کردہ قانون منسوخ کر دے، یا میرے الفاظ میں تحریف کرے، یا میری یادگاروں کو بدل ڈالے، یا اپنا نام کندہ کرنے کے لیے میرا نام مٹا دے، یا خود میری بد دعاؤں سے ڈر کے مارے وہ یہ کام کسی اور کے سپرد کر دے، تو دیوتاؤں کا باپ اور سب سے بڑا دیوتا، انوؔ جس نے میری حکومت کی بنیاد قائم کی ہے، اس شخص کے، خواہ وہ کوئی بادشاہ ہو یا رئیس، نائب ہو یا کوئی اور عہدیدار، تخت اور مسند کا چراغ گل کر دے۔ اس کے عصائے شاہی کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے اور اس کے انجام پر لعنت برسائے۔

میری دعا ہے کہ بعلؔ دیوتا، جو قسمتوں کا فیصلہ کرتا ہے، جس کی بات اٹل ہے، اور جس نے میری سلطنت وسیع کی ہے، اس کی قسمت میں ایک ایسی بغاوت لکھ دے، جسے اس کی طاقت دبا نہ سکے، اور وہ اپنی تباہی اور ویرانی کی آندھی اس کے تخت پر چلائے۔ آہوں سے پرسال، زندگی کے قلیل دن، قحط کا زمانہ، روشنی سے خالی اندھیرا، پھٹی پھٹی آنکھوں والی موت (اس شخص کو نصیب ہوں)۔ دیوتا کا دہنِ مبارک، اس کے شہر کی تباہی، اس کی رعایا کی بربادی، اس کی حکومت کے خاتمے اور دنیا سے اس کے نام اور یاد کو نیست و نابود کر دینے کا حکم صادر فرمائے۔

میری دعا ہے کہ بلطیسؔ، وہ مقدس ماں، جس کا ای کور میں بول بالا ہے اور جو بعلؔ کے حضور عدل اور آئین کے موقع پر میری عرضداشت غور سے سنتی ہے، وہ بعلؔ کے سامنے، اس شخص کی شفاعت نہ کرے! وہ خداوند بعلؔ کو اس کی سلطنت کی خرابی، اس کی رعایا کی تباہی اور اس کی روح کو پانی کی طرح بہا دینے پر آمادہ کرے!

میری دعا ہے کہ ایاؔ، وہ شہزادۂ اعظم، جس کے فیصلے ہمیشہ چوٹی کے ہوتے ہیں، وہ الٰہی مفکر، وہ علیم، جس نے میری زندگی کے دنوں کو لمبا کر دیا ہے، وہ اس شخص سے اس کی عقل اور اس کا ادراک چھین لے، وہ اسے نسیان کی گہرائیوں میں ڈھکیل دے! وہ اس کے دریاؤں کے منبع خشک کر دے اور اس کے کھیتوں کی پیداوار بند کر دے اور اس کے ملک کے باشندوں کی زندگی گھٹا دے!

میری دعا ہے کہ شمسؔ، وہ آسمان اور زمین کا فیصلہ کرنے والا، جو تمام جانداروں کا رازق ہے، وہ آقا، جو یقین کی روشنی عطا کرتا ہے، وہ اس شخص کی بادشاہی کی مدت تھوڑی کر دے! اس کے

قانون کو ناقص بنا دے! وہ اس کے رستے میں حائل ہو جائے! اس کی فوجوں کا کوچ روک دے۔ اسے اپنی سلطنت کی تباہی اور ملک کی بربادی کے نامبارک نظارے دکھائے! میری دعا ہے کہ شمس کا قہر اس کا پیچھا کرے! دنیا میں اس کی زندگی کے ایام کم ہوں اور پاتال میں روحوں کے درمیان اسے پانی نہ نصیب ہو!

میری دعا ہے کہ سن، وہ آسمانوں کا آقا، وہ میرا مقدس خالق، جس کا ہلال دیوتاؤں کے درمیان چمکتا ہے، اس شخص کا شاہی تاج اور تخت اس سے چھین لے! وہ اس پر ایسے قہر کے ساتھ اپنا عذاب نازل کرے اور اسے ایسی سزا دے، جو کبھی اس کے جسم سے جدا نہ ہو! وہ اپنی حکومت کے مہینوں کے دن اور برسوں کے مہینے، آہوں اور آنسوؤں میں گزارے! اس کی حکومت کی مشکلات اور مسائل میں دن رات اضافہ ہوتا رہے! دیوتا اس کی زندگی کو موت کے ساتھ مستقل آویزش میں تبدیل کر دے!

میری دعا ہے کہ اداد، وہ زرخیزی کا دیوتا، وہ آسمان اور زمین کا شاہزادہ، وہ میری تکیہ گاہ، اس شخص سے آسمان کی بارش روک لے اور اس کے چشموں کا بہاؤ خشک کر دے! اس کی زمین کو کال اور خشکی سے ویران کر دے! وہ اپنے غضب کی بجلی اس کے شہر پر گرائے اور اس کی مملکت کو طوفانِ بادو باراں سے کھنڈروں میں تبدیل کر دے!

میری دعا ہے کہ زامامہ، وہ عظیم الشان سورما، وہ ای کور کا پلوٹھا، جو جنگ کے میدان میں میرا دست راست ہوا کرتا ہے، وہ اس شخص کے ہتھیار توڑ ڈالے۔ اس کے دن کو رات میں بدل دے اور اس کے دشمن کو اس پر غالب کرے۔

میری دعا ہے کہ عشتار، وہ جنگ و جدل کی دیوی، جو میری سلاح بردار اور محافظ ہے جو میری بادشاہی سے محبت رکھتی ہے۔ وہ اپنے جلال اور غضب سے اس شخص کی بادشاہی پر لعنت کرے اور اس پر نوازشوں کی جگہ عتاب نازل کرے۔ وہ جنگ کے میدان میں، اس کے ہتھیار کند کر دے۔ وہ اس کے خلاف بغاوت اور شورش برپا کر دے۔ وہ اس کے سپاہیوں کو پچھاڑ دے حتیٰ کہ زمین ان کے خون سے لال ہو جائے۔ وہ میدان میں اس کی فوج کے کشتوں کے پشتے لگا دے اور ان پر ہرگز رحم نہ کرے۔ وہ خود اسے بھی دشمنوں کے ہاتھوں میں گرفتار کروا دے اور وہ دشمن کی سرزمین میں قیدی

بن کر رہے۔

میری دعا ہے کہ نرجل، وہ دیوتاؤں میں ساونت ہیں، جس کے حملے کی کوئی تاب نہیں لا سکتا۔ جس نے مجھے فتح عطا فرمائی ہے، وہ اپنی فوجوں کے ساتھ آئے اور اس کی رعایا کو خس و خاشاک کی طرح جلا کر خاک سیاہ کر دے۔ وہ اپنے مضبوط ہتھیاروں سے اس کے جسم کے پرزے اڑا دے اور اسے مٹی کے بت کی طرح پاش پاش کر دے۔

میری دعا ہے کہ ننتو، وہ پرتھوی کی مقدس دیوی، وہ میری حیات افروز ماں، اسے اولاد سے محروم رکھے تاکہ اس کا نام لیوا تک باقی نہ رہے اور اس کی رعایا کے گھروں میں افزائشِ نسل بند کر دے۔

میری دعا ہے کہ نن کراشہ، وہ انو کی بیٹی، وہ ای کور میں مجھ پر رحم کی بارش کرنے والی، اس کے جوڑ جوڑ میں خطرناک مرض اور بدبودار بیماری اور نہ بھرنے والا گہرا زخم پیدا کر دے جس کی نہ کوئی طبیب تشخیص کر سکے اور جو نہ مرہم پٹی سے ٹھیک ہو سکے اور پنجۂ موت کی طرح اس سے کوئی راہِ گریز نہ ہو، حتیٰ کہ دیوی اس کی روح پر قبضہ کر لے اور وہ اپنی قوتِ حیات کے زوال پر آٹھ آٹھ آنسو روئے۔

میری دعا ہے کہ آسمان اور زمین کے تمام بزرگ دیوتا۔ انوناکی۔ ای بیرہ مندر کے صحن میں، اپنی بھری سبھا کے اندر، سب مل کر اس پر، اس کی نسل پر، اس کے ملک پر، اس کی فوج پر، اس کی رعایا پر، اس کے خادموں پر، اپنی مہلک ترین بددعاؤں کی بوچھاڑ کریں۔

میری دعا ہے کہ بعل دیوتا، جس کی بات اٹل ہے، وہ اس پر اپنا زبردست عتاب نازل کرے، جو فوراً اپنا اثر دکھائے!

حواشی

۱۔ اکدی زبان میں روح اور دیوتا کے لیے ایک ہی لفظ ہے۔ بابلیوں نے روحوں اور دیوتاؤں کو دو گروہوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ ایک زمینی، دوسرا آسمانی۔ ارواح یا دیوتاؤں کے مسکن کا نام انوناکی تھا۔ انو

بابلی دیوتاؤں میں سب سے قدیم تھا اور عقیدہ یہ تھا کہ تمام دیوتا اسی کی نسل سے ہیں۔ آسمانی روحوں اور دیوتاؤں کے رہنے کا مقام انجی کہلاتا تھا۔

۲۔ حویلی۔ اگرچہ اس کی پوری تفصیل بعد کو دی جائیگی، لیکن مختصر طور پر یہاں بھی لکھ دینا چاہیے تاکہ مضمون واضح ہوجائے کہ بابلی سماج تین طبقوں میں تقسیم تھا، آزاد شہری، عامی اور غلام۔ آزاد شہری کا مکان حویلی کہلاتا تھا۔

۳۔ شیکل وزن کا پیمانہ۔ یہ (۱۸۰) گرین کے برابر تھا۔

۴۔ منَ (مکسور الاوّل اور مفتوح الثانی) یہ بھی وزن کا پیمانہ تھا۔ ایک منَ میں ساٹھ شیکل ہوتے تھے۔ آج کل کے حساب سے اس کا وزن ساڑھے بائیس پاؤنڈ یا گیارہ سیر اور ڈیڑھ چھٹانک کے مساوی ہوگا۔

۵۔ گن (کاف فارسی مفتوح) رقبہ۔ سولہ ایکڑ کے برابر تھا: ایک ایکڑ، ایک بیگھ سمجھیے۔

۶۔ گر (کاف فارسی مضموم) وزن۔ ایک گر میں (۳۰۰) قاع ہوتے تھے۔ ایک گر کا وزن ایک من سات سیر کے برابر ہوگا۔

۷۔ قاع۔ تقریباً آدھ سیر کے برابر تھا۔

۸۔ دیوداسی۔ عورتوں کا ایک طبقہ تھا، جنھیں پیدائش سے مندر کی نذر کردیا جاتا تھا۔ ان کی حیثیت کم وبیش وہی تھی، جو جنوبی ہندستان کے مندروں میں دیوداسی کی تھی۔

۹۔ سَر (سین مفتوح) رقبے کا پیمانہ تھا۔ ایک سَر میں ۳۶ مربع گز تھے۔

(1) The First of Emperors, W.St. Chad Boscawen, (1903).
(2) La Loi de Hammurabi - V. Scheil,, (1904).
(3) Babylonian and Assyrian Laws, Contracts and Letters - C.H.W. Johns, (1904).
(4) Cuneiform Parallels to the Old Testament - R.W. Rogers, (1912).

(5) The World's Earliest Laws - Chilperic Edwards, (1934).

ان سب کتابوں میں دوسرے مضامین کے علاوہ قانونِ حمورابی کا مکمل ترجمہ بھی دیا گیا ہے۔ میں نے اس اردو ترجمے کی بنیاد چلپرک ایڈورڈ کی کتاب (۵) پر رکھی ہے اور دوسرے ترجموں کو حسبِ ضرورت مقابلے کے لیے استعمال کیا ہے۔ بحیثیت مجموعی چلپرک ایڈورڈ کا ترجمہ بہت صاف، رواں اور قابلِ اعتماد ہے۔

دوسرا باب

حموربی کون تھا؟

سُومر اور اکّد

جو ملک آج عراق کہلاتا ہے، اُسے یونانی اپنے عہدِ عروج میں میسوپوٹیمیا کہتے تھے۔ اس سے پہلے اس کا شمالی حصّہ اسیریا کہلاتا تھا اور جنوبی بابل۔ اور اس سے بھی پہلے زمانے میں یہی بابل کا خطّہ دو حصّوں میں منقسم تھا۔ شمالی اکّد کے نام سے مشہور تھا اور جنوبی کو سُومر کہتے تھے۔ یہ حضرت مسیح ناصری علیہ السّلام سے پانچ چھ ہزار سال پہلے کی بات ہے۔

دراصل اکّد اور سُومر دریائے دجلہ اور دریائے فرات کے درمیانی دوآبے کا نام تھا۔ دجلہ اور فرات، دونوں آرمینیا کی پہاڑیوں سے نکلتے ہیں۔ جہاں یہ پہاڑی علاقے سے نکل کر میدان میں داخل ہوتے ہیں، یوں سمجھ لیجیے کہ یہیں سے اکّد کی سرزمین شروع ہوجاتی تھی۔ دوسرے لفظوں میں جہاں شط ادھم، دریائے دجلہ میں گرتا ہے، اس سے کچھ اوپر اور سامرّہ سے تھوڑا نیچے یعنی جہاں آج کل بلد کا قریہ ہے، یہاں سے ایک خط کھینچیں اور مغرب کی طرف دریائے فرات کے کنارے حیت تک چلے جائیں تو کم و بیش یہ اکّد کی شمالی سرحد ہوگی۔ خود اکّد اور سُومر کی درمیانی سرحد کی ٹھیک نشاندہی کرنا مشکل ہے کیوں کہ یہ کسی زمانے میں بھی متعیّن نہیں رہی۔ البتّہ اس میں شبہہ نہیں کہ سُومر کا علاقہ جنوب میں خلیج فارس تک پھیلا

ہوا تھا۔ لیکن یہاں ایک بات کی وضاحت کردینا ضروری ہے کہ ان ایام میں خلیج فارس کا شمالی کنارہ بہت اوپر کی طرف تھا کیوں کہ شہر اریدو (موجودہ ابو شہرین) اس کے ساحل پر واقعہ تھا اور یہ اِس وقت تقریباً ایک سوتیس میل ملک کے اندر ہے۔ اس کے علاوہ دجلہ اور فرات، دونوں دریا خلیج فارس میں الگ الگ آکے گرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے موجودہ سنگم القرنہ سے جنوب کا سارا علاقہ جہاں آج کل شط العرب بہتا ہے، سمندر تھا اور یہ خشکی بعد کو پیدا ہوئی ہے۔

یہ دونوں باتیں اس ملک کی تاریخ کی قدامت کی صریح دلیل ہیں۔ ہمارا تجربہ ہے کہ ان دونوں دریاؤں کی لائی ہوئی مٹی سے ہر سال اوسطاً نوفٹ نئی زمین بن جاتی ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ ابو شہرین (اریدو) سے خلیج فارس کے موجودہ ساحل تک ایک سوتیس میل کا علاقہ بننے میں تقریباً سات ہزار برس لگے ہوں گے۔ گویا اس ملک کی تاریخ حضرت عیسیٰ مسیح علیہ السّلام سے کم از کم پانچ ہزار برس پہلے تک چلی جاتی ہے۔

گذشتہ صدی میں جو آثارِ قدیمہ یہاں دریافت ہوئے ہیں اور عہد نامۂ قدیم کی کتاب پیدائش وغیرہ میں جو حالات ملتے ہیں، انھیں یکجا کرنے کے بعد کئی مؤرّخ تو اس بات کے مدّعی ہیں کہ تہذیب و تمدّنِ انسانی کا ابتدائی گہوارہ یہی خطۂ زمین تھا۔

نہایت قدیم زمانے سے متعلق ہماری تمام معلومات انھی آثار پر مبنی ہیں جو یہاں سے کھدائی میں نکلے ہیں۔ اگرچہ تمدّن اور حضارت سے متعلق بہت سی اشیا دستیاب ہوئی ہیں لیکن ابھی تک کوئی ایسی چیز نہیں ملی، جس سے اس نہایت قدیم عہد کی سیاسی تاریخ پر روشنی پڑتی ہو۔ البتہ جب ہم حضرت مسیح سے لگ بھگ چار ہزار سال پہلے کے زمانے کے قریب پہنچتے ہیں تو ہمیں بعض ایسی تحریری دستاویزیں بھی ہاتھ لگتی ہیں، جن سے ہم اپنی اثری معلومات میں اضافہ کرسکتے ہیں۔

بعض پرانے شہروں کے کھنڈروں کی کھدائی کرتے ہوئے وہاں سے مختصر

تحریروں کے ٹکڑے ملے ہیں جن میں اس زمانے کی تاریخ کی طرف اشارے ہیں۔ ان کے علاوہ اسکندر اعظم مقدونی (م۔ ۳۲۳ ق۔م) کے ہم عصر مصنّف بیروسوس نامی کی لکھی ہوئی ایک کتاب کے کچھ حصّے بھی ملتے ہیں، جو حضرت مسیح سے تقریباً دو ہزار سال پہلے کی پرانی بابلی اور سُومری تحریروں پر مبنی تھی۔ یہ اصلی تحریریں جن میں غالباً یہاں کے بادشاہوں کے حالات اور ان کے زمانۂ حکومت کے واقعات ہونگے، ضائع ہوگئی ہیں۔ بیروسوس کی تحریر میں ان کے صرف مختصر اقتباس ہیں۔

طوفانِ نوح (۱؟)

ان سب تحریروں کے دیکھنے سے ایک بات واضح ہوجاتی ہے کہ بہت قدیم زمانے میں اس سرزمین میں ایک بہت بڑا طوفان آیا تھا۔ مثلاً شاہی خاندانوں کی تاریخ بیان کرنے کا عام انداز یہ ہے کہ یہ بادشاہ طوفان سے پہلے ہوا ہے یا فلاں واقعہ طوفان سے اتنے برس بعد ہوا۔ آج بھی عراق میں طوفان اور سیلاب وغیرہ عام طور پر آتے رہتے ہیں، خصوصاً گرمیوں کے زمانے میں۔ جب شمالی پہاڑوں کی برف پگھلتی ہے، تو اس ملک کے جنوبی علاقے کے لوگوں کو دن رات سیلاب کا دھڑکا لگا رہتا ہے۔ اور یہ خیال کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ پانچ سات ہزار برس پہلے بھی یہاں ایسے طوفان کیوں نہ آتے رہے ہونگے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ طوفان جس کا ذکر ان تحریروں میں ہے۔ کوئی ایسا وسیع اور تباہی خیز اور نتائج کے لحاظ سے دوررس طوفان تھا کہ مؤرخوں نے اسے گویا ایک دَور کے خاتمے اور دوسرے دَور کے آغاز کا نقطۂ اتصال قرار دے دیا۔

عہد نامہ قدیم کی کتاب پیدائش (۱) (۶ تا ۹/ ۱۷) اور قرآن (ہود: ۲۵ - ۴۹) دونوں

---

(۱) کتاب پیدائش میں اس واقعہ سے متعلق جو کچھ بیان ہوا ہے، وہ دو ماخذوں پر مبنی معلوم ہوتا ہے۔ اور لطیفہ یہ ہے کہ جامع نے دونوں بیانوں کو ایسا گڈمڈ کر دیا ہے کہ ان کی متضاد بیانوں میں تطابق دینے کی تکلیف بھی گوارا نہیں کی۔ اگر ناظرین کتاب پیدائش کے محوّلہ ابواب غور سے ملاحظہ فرمائینگے، تو انھیں خود بخود معلوم ہوجائے گا کہ کہاں کہاں متضاد باتیں ہیں۔

میں ایک ایسے ہی طوفان کا ذکر ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسی واقعے کی طرف اشارہ ہے۔

شہری ریاستیں

بہرحال ان ماخذوں اور دستاویزوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پورے ملک میں شہری ریاستیں قائم تھیں۔ ہر ایک شہر میں کسی مستقل اور آزاد خاندان کی حکومت تھی اور ان میں آپس میں کسی قسم کا تعلق نہیں تھا، سوائے اس کے کہ ایک دوسرے کو نیچا دکھانے اور اس کے علاقے پر قبضہ جمالینے کے لیے وہ ہمیشہ باہم لڑتے جھگڑتے رہتے تھے۔

ان میں سے زیادہ اہم اور طاقت ور ریاستیں یہ ہیں۔

۱۔ لاغائش۔ اس کا دوسرا نام "شرپور لا" تھا۔ یہ شہر اس جگہ آباد تھا جہاں آج کل "تل لوخ" ہے۔

۲۔ کِش۔ یہ موجودہ بغداد سے کوئی ۳۵۔۴۰ میل جنوب مغرب اور بابل سے پندرہ میل مشرق میں واقع تھا۔ اب اس جگہ الاُہیمر (اُہیمر) کے ٹیلے ہیں۔

۳۔ اَریخ۔ یہ جنوب میں اس جگہ تھا جہاں اب "وُرکا" ہے۔

۴۔ لارسہ۔ یہ بھی جنوب میں تھا۔ اس جگہ آج کل "سنکرہ" کا گاؤں ہے۔

۵۔ اُور۔ یہ مقیّر کی جگہ پر تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السّلام یہیں کے رہنے والے تھے۔ (اُور کے معنی ہیں شہر۔ یورشلم میں یور در اصل اُور ہی کا قائم مقام ہے۔ اور اس کے معنی ہیں سلامتی کا شہر۔ ہمارے متعدد شہروں میں بھی اُور بطور لاحقہ استعمال ہوا ہے مثلاً پشاور لاہور، بنگلور، چتوڑ وغیرہ۔)

۶۔ اَریدو۔ موجودہ "ابوشہرین" اسی پرانے شہر کے کھنڈروں پر آباد ہے۔

۷۔ شروبک۔ یہ "فرح" کے قریب تھا۔ روایات پر اعتبار کیا جائے تو طوفان کی ابتدا یہیں سے ہوئی تھی۔

۸۔ ادب۔ بسمیا، اسی کی جگہ آباد ہے۔

۹۔ نِی سِن۔ (یا ای سن) یہ جنوب میں خلیج فارس کے کنارے کی اہم ترین ریاستوں

میل سے تھی۔

۱۰۔ نِفّر۔ یہ وسطی بابل کا بہت اہم شہر تھا۔ اس کا محل وقوع فرات کے مغربی کنارے پر موجودہ "دیوانیہ" کے جنوب مغرب میں تقریباً بیس میل کے فاصلے پر تھا، سوق العفج کے تھوڑا شمال میں سمجھ لیجیے۔

۱۱۔ کشترہ۔ ابو حطب کے نواح میں تھا۔

۱۲۔ بورسپا۔ یہ اس جگہ تھا جہاں آج کل بابل کے شمال میں بیرس نمرود ہے۔

۱۳۔ کوتہ۔ اس مقام پر اس وقت تل ابراہیم ہے۔

۱۴۔ سپارہ۔ آج کل ابو حبّہ گاؤں یہاں آباد ہے۔

۱۵۔ بابل۔ یہ ملک کے وسط میں تھا۔ موجودہ بغداد سے تقریباً ۵۵۔۶۰ میل جنوب مغرب میں فرات کے بائیں کنارے پر۔

ان میں سے آخری یعنی بابل ہمارا موضوعِ سخن ہے۔

بابل

تورات میں ہے:

اور تمام زمین پر ایک ہی بولی تھی اور ایسا ہوا کہ مشرق کی طرف سفر کرتے کرتے نوح کی اولاد کو ایک میدان ملا اور وہ وہاں بس گئے۔ اور انھوں نے آپس میں کہا، آؤ ہم اینٹیں بنائیں اور ان کو آگ میں خوب پکائیں۔ سو انھوں نے پتھر کی جگہ اینٹ سے اور چونے کی جگہ گارے سے کام لیا۔ پھر وہ کہنے لگے کہ آؤ ہم اپنے واسطے ایک شہر اور ایک برج، جس کی چوٹی آسمان تک پہنچ جائے، بنائیں اور یہاں اپنا نام کریں۔ ایسا نہ ہو کہ ہم روے زمین میں پراگندہ ہو جائیں۔ اور خداوند اس شہر اور برج کو جسے بنی آدم بنانے لگے، دیکھنے کو اترا اور خداوند نے کہا: دیکھو، یہ لوگ سب ایک ہیں اور ان سبھوں کی ایک ہی زبان ہے۔ وہ جو یہ کرنے لگے ہیں، تو اب کچھ بھی جس کا وہ ارادہ کریں، ان سے باقی نہ چھوٹیگا۔ سو

آؤ ہم جاکر ان کی زبان میں اختلاف ڈالیں، تاکہ وہ ایک دوسرے کی بات نہ سمجھ سکیں۔ پس خداوند نے ان کو وہاں سے تمام روے زمین میں پراگندہ کیا۔ سو وہ اس شہر کے بنانے سے باز آئے۔ اس لیے اس کا نام بابل ہوا، کیونکہ خداوند نے وہاں ساری زمین کی زبان میں اختلاف ڈالا اور وہاں سے ان کو تمام روے زمین پر پراگندہ کیا (کتاب پیدائش ۱۱: ۱-۹)

اس جگہ بابل اور برجِ بابل کی تعمیر کا ذکر کیا گیا ہے اور آخری دو خط زدہ آیتوں میں بابل کے تسمیہ کا سبب بیان کیا ہے۔ پہلے حصے میں جو کچھ لکھا ہے۔ اس کی معقولیت (یا نامعقولیت) پر بحث کرنا ہمارے موضوع سے بے تعلق ہے۔ اس لیے اس بارے میں کچھ لکھنا غیر ضروری ہے۔ البتہ بابل کے تسمیہ سے متعلق جو کچھ لکھا ہے، وہ یقیناً ٹھیک نہیں۔

عبرانی زبان میں بلل کے معنی ہیں، درہم برہم کرنا، گڈمڈ کرنا وغیرہ۔ اسی سے کتاب پیدائش کے مرتّب کو دھوکا ہوا۔ چوں کہ وہ یہاں دعوا کر رہا تھا کہ خداوند نے اس جگہ لوگوں کی زبانوں کو گڈمڈ کر دیا، اس لیے شہر کے نام بابل سے اس کا ذہن عبرانی کے لفظ بلل کی طرف منتقل ہوگیا، جیسے یہ اس سے مشتق ہو۔ حال آں کہ بابل کا عبرانی لفظ بلل سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ یہ لفظ اصل میں مرکّب ہے، باب اور ایل سے۔ اس جگہ کا قدیمی نام باب ایلی تھا، جس کے آخر میں یونانیوں نے نون کے اضافے سے بابیلون (Babylon) بنالیا۔ باب عربی میں دروازے کو کہتے ہیں اور ایل کے معنی خدا یا معبود کے ہیں۔ سُومری اور اکدی اور عبرانی تینوں زبانوں میں یہ لفظ انھیں معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ ایلی اور عبرانی کا الوہیم اس کی جمع ہیں۔ پس باب ایلی کے معنی ہونگے: "خداؤں یا دیوتاؤں کا دروازہ"

جیسا کہ عہد نامۂ قدیم کے بعض مقامات سے بھی ثابت ہوتا ہے۔ پرانے وقتوں میں

ے مثلاً کتاب استثناء ۲۱: ۱۹، کتاب روت ۴: ۱ وغیرہ

شہر کا پھاٹک بہت اہم جگہ ہوا کرتی تھی۔ یہیں آ کے دوسرے شہروں کے ایلچی اپنی سفارت اور پیغام پہنچاتے تھے۔ یہیں اجنبیوں سے ملاقات کی جاتی تھی۔ یہ عدالت گاہ کا کام بھی دیتا تھا اور پنچایت گھر کا بھی۔ پنچ یہیں اپنا اجلاس کرنے اور شہر کے باشندے اسی جگہ ان کے پاس آ کے اپنی شکایتیں اور مقدمے پیش کرتے تھے۔ اس لیے دوسرے لفظوں میں بابل کے معنی ہوں گے "دیوتاؤں کے اجلاس کا مقام"

یہ شہر دریائے فرات کے بائیں کنارے پر آباد تھا۔ اس کے کھنڈر آج بھی بغداد کے جنوب مغرب میں تقریباً ۵۵-۶۰ میل کے فاصلے پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ لیکن یہ اس شہر کے نہیں جو حمورابی یا پہلی بادشاہی کے زمانے میں تھا کیوں کہ جب حتیّوں نے اس گھرانے کے آخری بادشاہ شمس دیتانا کو ۱۸۰۷ ق م میں شکست دے کر اس خاندان کا چراغ گُل کر دیا، تو انھوں نے پرانا شہر بھی جلا کر خاک سیاہ کر ڈالا تھا۔ یہ موجودہ کھنڈر اس شہر کے ہیں جو اسی جگہ پر مشہور بابلی بادشاہ نو بخت نصر نے حضرت مسیح علیہ السّلام سے چھے صدی قبل تعمیر کیا تھا۔

محل وقوع کے اعتبار سے بابل نہایت اہم اور موزوں مقام پر آباد تھا۔ مشرق اور مغرب کی تین تین شاہراہوں کے تجارتی کاروان یہاں سے ہو کر گزرتے تھے۔ مشرقی ممالک یعنی ایران اور عیلام سے مغرب کی طرف جانے والے تمام قافلوں کی یہ گذرگاہ تھا۔ پھر یہاں سے شمال میں طرسوس اور دیار بکر سے ہو کر ترکی اور ایشیائے کوچک تک آمد و رفت عام بھی تھی اور آسان بھی۔ اور تیسرا رستہ مغرب کے لیے شام اور بحیرۂ روم سے ہو کر مصر وغیرہ تک جاتا تھا۔ تاجر لوگ مال اسباب پہلے فرات کی کشتیوں کے ذریعے شمالی شام میں لے جاتے، اور وہاں سے بحیرۂ روم میں جہازوں پر بار کر کے منزلِ مقصود تک پہنچا دیتے تھے۔

ظاہر ہے کہ ایسی اہم تجارتی منڈی ہونے کے باعث یہ شہر بھی بہت عظیم الشان اور خوشحال ہو گیا ہوگا۔ لیکن اس سے بھی بڑھ کر اس شہر کے محلِ وقوع کی سیاسی اہمیّت تھی۔ امویوں نے بیشک اپنا دارالحکومت کوفہ میں

بنایا[1]۔ لیکن ان کے علاوہ تین بڑی سلطنتوں نے بابل اور اس کے نواح کو سیاسی لحاظ سے اتنا اہم خیال کیا کہ انھوں نے اپنا صدر مقام اس کے آس پاس ہی رکھا۔ اسکندر مقدونی کے جانشین سیلوکس فاتح نے دجلہ کے دائیں کنارے پر سیلوکیا بسایا جو موجودہ بغداد سے بیس میل جنوب میں تھا۔ ساسانیوں نے اس کے بالمقابل دریا کے دوسری طرف طیسیفون آباد کیا[2]۔ اس کے بعد عباسیوں نے شمال میں بغداد آباد کیا[3] جو دجلہ کے دونوں کناروں پر آباد تھا۔ یہ سب شہر تیس میل کے دائرے کے اندر واقعہ ہیں اور ان سب خاندانوں کا پورے ملک کے لیے مرکزی حکومت اس علاقے میں رکھنا ثابت کرتا ہے کہ بابل نہایت موزوں مقام پر واقعہ تھا۔ دراصل یہاں سے پورے ملک پر آسانی سے حکومت ہو سکتی ہے اور نفسیاتی اور فوجی لحاظ سے بھی دونوں دریاؤں کے درمیان میں ہونے سے یہ جگہ بہت محفوظ تھی۔

عربی پیش قدمیاں

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ عرب لوگ جزیرۃ العرب سے چار مرتبہ نکل کر بیرونی دنیا پر سیلاب کی طرح چھا گئے۔ پہلا خروج وہ ہے، جب وہ دجلہ اور فرات کی وادی میں اپنے قدم جمانے میں کامیاب ہو گئے اور جس کے نتیجے میں گویا شمالی بابل میں ریاست اکّد کی بنیاد پڑی۔ یہ حضرت مسیح سے کم از کم تین ساڑھے تین ہزار برس پہلے کا

---

[1] حجاج بن یوسف ثقفی نے اپنی گورنری کے زمانے میں اپنے لیے بصرہ اور کوفہ کے درمیان ایک نیا شہر بسایا تھا اور اسی لیے اس کا نام واسط رکھا۔

[2] حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد میں مسلمانوں نے یہ دونوں شہر فتح کیے (۶۳۳ء) تو انھیں المدین کا مشترکہ نام دے دیا۔

[3] خاندانِ عباسیہ کے آٹھویں حکمران معتصم نے بغداد سے ۷۰ میل شمال میں اپنا دارالخلافہ سامرّہ (سُرَّ مَن رائی) کے مقام پر بنایا تھا۔ لیکن یہ مشکل سے ۵۶ برس دارالحکومت رہا اور خاندان واپس بغداد چلا آیا۔

واقعہ ہے۔ دوسرا خروج وہ ہے جب کنعانی یا اموری ریاست وجود میں آئی۔ ان پہلی دونوں پیش قدمیوں میں زمانے کے لحاظ سے کتنا فرق تھا اس کا فیصلہ کرنا مشکل ہے بلکہ عین ممکن ہے کہ دوسری پیش قدمی پہلی کا حصّہ یا اس کے سلسلے کی آخری کڑی ہو۔ تیسری چودھویں صدی ق م کی وہ حرکت تھی، جب شام میں ارامی حکومت قائم ہوئی، جس کا صدر مقام دمشق میں تھا۔ اور سب سے آخری وہ عظیم الشّان تحریک تھی، جب ساتویں صدی عیسوی میں اسلامی فوجیں یکا یک اپنے مرکز سے نکل کر پورے مغربی ایشیا کو فتح کرنے کے بعد مشرق میں چین کی سرحدوں تک پہنچ گئیں، اور مغرب میں تمام شمالی افریقہ طے کرنے کے بعد یورپ کے جنوب مغربی ممالک پر قابض ہوگئیں۔ اس میں شمّہ بھر شبہ کی گنجائش نہیں کہ اگر چارلس مارٹل نے انھیں فرانس میں روک نہ دیا ہوتا تو آج دنیا کی تاریخ کسی اور ڈھنگ سے لکھی گئی ہوتی۔ ان میں سے پہلی تین پیش قدمیوں کی تفصیل ہمیں معلوم نہیں تھی، لیکن چوں کہ اسلامی فتوحات کا حال پوری شرح و بسط سے ہمارے سامنے ہے، ہم ان سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ پہلی تحریکوں کے موقع پر بھی اس قوم نے کچھ اسی طریقے پر کام کیا ہوگا۔ اس وقت ہمیں ان میں سے صرف پہلی دو سے سروکار ہے۔

بابل کا پہلا شاہی خاندان

یہ وہ زمانہ ہے، جب کنعانی تحریک ختم ہو چکی تھی۔ یعنی حضرت مسیح ناصری سے تقریباً دو ہزار سال پہلے، بابل میں ایک خاندان نے حکومت قائم کی، جسے مؤرخ سہولت کے لیے "بابل کا پہلا شاہی خاندان" کہتے ہیں۔ اس پر سب کا اتّفاق ہے کہ یہ خاندان سامی الاصل تھا اور عام طور پر شام کے جنوبی علاقے کو اس کا مسقط الرّاس مانا جاتا ہے۔ اس خاندان میں مندرجہ ذیل گیارہ بادشاہ ہوئے ہیں ؎۔

؎ جس بادشاہ کے نام کے بعد + کا نشان ہے یہ اس بات کی علامت ہے کہ اس کا بیٹا اس کا جانشین ہوا تھا۔

(۱) سَمُوابُوم (۲) سموُلا اِیلَم + (۳) زَابیُوم + (۴) اِبیل سِن + (۵) سِن مُبلّت + (۶) حمُورَبی + (۷) شمس اِیلُنا + (۸) اَبی اِیشُو + (۹) اَمّی دِیتَنا + (۱۰) اَمّی صَدوق + (۱۱) شمس دِیتَنا۔
ہم یہاں حموربی سے متعلّق گفت گو کرینگے، جو اس خاندان کا چھٹا حکمران تھا۔

حموربی کا زمانہ

سب سے پہلے ہمیں اس خاندان اور خاص کر حموربی کا زمانہ معلوم کرنا چاہیے۔ خوش قسمتی سے ہمیں بعض ایسی شہادتیں دستیاب ہوگئی ہیں، جن سے کم و بیش یقینی طور پر اس خاندان کا عہدِ حکومت متعیّن کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ علم ہیئت کی شہادت

(۱) دو ایسی دستاویزیں ملی ہیں جن میں ۲۲ سال کی لمبی مدّت کے لیے زُہرہ ستارے کے طلوع و غروب کے اوقات درج ہیں۔ ان میں ایک جگہ کاتب نے اشارہ کیا ہے کہ زُہرہ کے چڑھنے اور ڈوبنے کے یہ اوقات، اس خاندان کے دسویں بادشاہ اَمّی صَدوق کے آٹھویں سالِ جلوس میں ہیں۔ چوں کہ ہمیں بعض اور ذرائع سے ہر ایک بادشاہ کی حکومت کا زمانہ پہلے سے معلوم تھا، اس لیے جب علمِ ہیئت کی رُو سے حساب لگایا گیا، کہ زہرہ، اس خاص شکل میں کب تھی تا کہ اس کے چڑھنے اور ڈوبنے کے اوقات مندرجہ بالا دستاویز کے مطابق ہو جائیں، تو ہمیں نہ صرف اُمّی صدوق کے اکیس سالہ دورِ حکومت کا زمانہ معلوم ہوگیا، بلکہ اس سے پورے خاندان کا زمانہ اور ہر ایک بادشاہ کی حکومت کے آغاز و اختتام کی حسبِ ذیل تاریخیں معلوم ہوگئیں

(۱)	سَمُوابُوم	۲۱۶۹ — ۲۱۵۶ ق م	(۱۴ سال)
(۲)	سمولا ایلم	۲۱۵۵ — ۲۱۲۰ ق م	(۳۶ سال)
(۳)	زابیوم	۲۱۱۹ — ۲۱۰۶ ق م	(۱۴ سال)
(۴)	ابیل سِن	۲۱۰۵ — ۲۰۸۸ ق م	(۱۸ سال)
(۵)	سِن مُبلّت	۲۰۸۷ — ۲۰۶۸ ق م	(۲۰ سال)
(۶)	حموربی	۲۰۶۷ — ۲۰۲۵ ق م	(۴۳ سال)

(۷) شمس ایلنا	۲۰۲۴ — ۱۹۸۷	ق،م	(۳۸ سال)
(۸) ابی الیشو	۱۹۸۶ — ۱۹۵۹	ق،م	(۲۸ سال)
(۹) امّی دیتنا	۱۹۵۸ — ۱۹۲۲	ق،م	(۳۷ سال)
(۱۰) امّی صدوق	۱۹۲۱ — ۱۹۰۱	ق،م	(۲۱ سال)
(۱۱) شمس دیتنا	۱۹۰۰ — ۱۸۷۰	ق،م	(۳۱ سال)

اس سے معلوم ہوا کہ یہ خاندان تین صدی تک سریر آرائے سلطنت رہا۔ اور دوسرے یہ کہ حمورابی، حضرت مسیح سے پہلے ۲۰۶۷ سے لے کر ۲۰۲۵ تک (۴۳) برس کے لیے بابل کے تخت پر متمکن رہا۔

۲۔ تورات کی شہادت

(۲) دوسری شہادت تورات کی مندرجہ ذیل عبارت سے ملتی ہے:

اور سنعار کے بادشاہ امرافیل اور الاسر کے بادشاہ اریوک اور عیلام کے بادشاہ کدرلاعمر اور جوئیم کے بادشاہ تدعال کے ایام میں یوں ہوا کہ انھوں نے سدوم کے بادشاہ برع اور عمورہ کے بادشاہ برشع اور ادمہ کے بادشاہ سنی اب اور ضبوئیم کے بادشاہ شمیبر اور بالع یعنی ضغر کے بادشاہ سے جنگ کی،، (کتاب پیدائش ۱۴: ۱-۲)

یہ عبارت اس مقام کی ہے، جب حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے چچازاد بھائی حضرت لوط علیہ السلام کو بچانے کے لیے نکلے۔ یہ جو لڑائی ہے مولانا کا واقعہ ہے جس کی طرف ان آیتوں میں اشارہ ہے۔ مؤرخین میں سے اکثریت کا یہ نظریہ ہے کہ اس عبارت میں امرافیل سے مراد حمورابی ہے۔

ہمارے ہاں عام طور پر اس بادشاہ کا نام حمورابی لکھا جاتا ہے، لیکن اس کا صحیح املا حمور بی ہے۔ (یعنی الف کے بغیر) اس زمانے کی تحریروں میں بعض اوقات یہ امور بی (بلکہ امورپی) بھی لکھا ملا ہے۔ نام کا پہلا جزو حمو یا امو دیوتا کا نام ہے۔ عہد نامۂ قدیم

(تورات) میں عبرانی کے متعدد ناموں کے شروع یا آخر میں امو جزو کلمہ ہے۔ مثلاً امی ندب (خروج، ۶: ۲۳)، رحو بوام (سلاطین الاوّل، ۱۱: ۴۳)، یو بوام، (سلاطین الاول، ۱۱: ۲۸) بنی امی (پیدائش، ۱۹: ۳۸) وغیرہ۔ امون (مصری دیوتا) کا نام غالباً اسی سے مشتق ہے۔ بابلیوں کے ہاں اس کی تین شکلیں ملتی ہیں۔ حمو، امو، امی۔ پس حموربی کے معنی ہوئے۔ "امو یا حمو میرا خدا ہے۔"

بابلیوں کی یہ عام عادت تھی کہ وہ اپنے جن بادشاہوں کو ان کی عظمت (یا تملق) کے باعث الوہیت کی صفات سے متصف کرنا چاہتے تھے، ان کے نام کے آخر میں ایل یا ایلو کا لاحقہ لگا دیتے تھے۔ چنانچہ بعض تحریروں میں حموربی کا نام امورپی ایل لکھا ملا ہے۔ یہ بعینہٖ وہی امرافیل ہے، جو تورات کے مندرجہ صدر اقتباس میں ہے۔

تورات کی اس عبارت سے دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ حموربی اور حضرت ابراہیم علیہ السّلام ایک دوسرے کے معاصر ہیں۔ ہمیں دیکھنا چاہیے کہ حضرت ابراہیم علیہ السّلام کا زمانہ کونسا ہے۔

پروفیسر گارسٹرنگ نے فلسطین کے آثارِ قدیمہ میں کھدائی کرنے اور تمام شہادتوں کا معائنہ کرنے کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے کہ حضرت یوشع علیہ السّلام نے تقریباً ۱۴۰۰ ق،م میں اَریحہ (Jericho) فتح کیا تھا۔ اگرچہ چند سال کی کمی بیشی کی گنجائش سے مفر نہیں، لیکن عام طور پر محققین نے اس تاریخ سے اتفاق کر لیا ہے اس تاریخ کو تورات میں بیان کردہ واقعات سے ملانے سے مندرجۂ ذیل نتائج برآمد ہوتے ہیں۔

۱۔ اریحہ کی فتح (بقول گارسٹرنگ) ۱۴۰۰ ق م

۲۔ اس سے پہلے اسرائیلی ۴۰ سال تک موسیٰ کے ساتھ صحرائے سینا میں سرگرداں رہے، (استثنا ۲: ۷، یوشع، ۵: ۷ وغیرہ) یعنی مصر سے تاریخ خروج ۱۴۴۰ ق م ہوگی) ۱۴۴۰ ق م

۳۔ اس سے پہلے اسرائیلی مصر میں رہے۔ (خروج ۱۲: ۴۰-۴۱) ۴۳۰ ق م

۴۔ اس سے پہلے جب حضرت یعقوب علیہ السّلام مصر گئے، تو وہ ۱۳۰ برس

کے تھے، (پیدائش، ۷،۴: ۹، ۱۳۰

۵۔ اس سے پہلے حضرت یعقوب علیہ السلام کی پیدائش کے وقت حضرت اسحاق علیہ السلام ۶۰ برس کے تھے۔ (پیدائش: ۲۵ : ۲۶) ۶۰

۶۔ اس سے پہلے حضرت اسحاق کی پیدائش کے وقت حضرت ابراہیم سو سال کے تھے (پیدائش، ۲۱ : ۵)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پیدائش کی تاریخ ۲۱۶۰ ق،م ہوگی ۱۰۰

اس تاریخ پیدائش سے ہم حضرت ابراہیم کی زندگی کے اہم واقعات معلوم کرسکتے ہیں۔

۱۔ حضرت ابراہیم کی ولادت ۲۱۶۰ ق،م

۲۔ حضرت ابراہیم کی کنعان کو ہجرت، ۷۵ سال کی عمر میں۔ (پیدائش، ۱۲: ۴) ۲۰۸۵ ق،م

۳۔ حضرت اسماعیل کی پیدائش، ان کی ۸۶ برس کی عمر میں (پیدائش، ۱۶: ۱۶) ۲۰۷۴ ق،م

۴۔ بادشاہ امرافیل کے عہد میں سدوم اور عمرہ کو شکست (پیدائش ۱۴)

۵۔ سدوم اور عمرہ کی آگ سے تباہی، حضرت ابراہیم ۹۹ برس کے تھے۔ (پیدائش، ۱۷: ۱) ۲۰۶۱ ق،م

۶۔ حضرت اسحاق کی پیدائش کے وقت، ۱۰۰ برس کے تھے۔ (پیدائش، ۲۱: ۵) ۲۰۶۰ ق،م

۷۔ حضرت ابراہیم کی وفات ۱۷۵ برس کی عمر میں (پیدائش، ۲۵: ۷) ۱۹۸۵ ق،م

آپ دیکھیں گے کہ حمورابی کو حضرت ابراہیم کا ہم عصر ماننے سے کوئی اشکال پیدا نہیں ہوتا، دونوں کا زمانہ ایک ہے۔ ایک اور بات۔ ان تاریخوں کی رُو سے سدُوم اور عمرہ ۲۰۶۱ ق م میں تباہ ہوئے اور ہم نے اوپر لکھا ہے کہ حمورابی ۲۰۶۷ ق م میں تخت نشین ہوا تھا، تو اس سے معلوم ہوا کہ حمورابی (امرافیل) کی حکومت کے بہت ابتدائی زمانے یعنی پہلے چھے برس (۲۰۶۷-۲۰۶۱ ق م) میں فوجکشی کا وہ واقعہ پیش آیا ہوگا جس میں اس نے عیلامی بادشاہ کے ساتھ مل کر سدُوم اور عمرہ پر چڑھائی کی۔ حقیقت میں یہی وہ زمانہ ہے جب حمورابی کسی عیلامی بادشاہ کے حلیف کے طور پر ایک طرح کی ماتحتی قبول کرنے پر تیار ہو سکتا تھا۔ کیوں کہ جیسا کہ ہم ابھی بیان کرینگے بعد کو

وہ خود اتنا طاقتور ہوگیا تھا کہ کسی کا حلیف ہونا تو درکنار وہ اپنے آپ کو عیلام کا سب سے بڑا حریف خیال کرنے لگا۔ اور آخر کار اس نے بڑی جدوجہد کے بعد عیلام کو شکست دی اور ایک زمانے تک عیلامی حکومت اسے خراج ادا کرتی رہی۔

غرض کہ حتمی طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ حموربی ۲۰۶۷ ق م سے لے کر ۲۰۲۵ ق م تک حکومت کرتا رہا۔

واقعاتِ حکومت

قدیم عربوں کے ہاں کوئی خاص تقویم رائج نہیں تھی اس لیے ان کا یہ عام طریقہ تھا کہ وہ کسی مشہور واقعے سے اس سال کو منسوب کر دیتے تھے، جس میں وہ پیش آتا۔ مثلاً حضرت رسول کریم صلعم کی پیدائش کے سال (۵۷۱ء) یمن کے عیسائی حاکم ابرہہ نے خانۂ کعبہ کو مسمار کرنے کے لیے مکہ پر چڑھائی کر دی۔ چوں کہ اس کی فوج میں ہاتھی بھی تھا، جو عرب میں ایک نادر اور عجوبہ چیز تھی اس لیے اس سال کو عام الفیل (ہاتھی کا سال) کہنے لگے۔ قرآن کی سورۂ فیل میں اسی واقعے کی طرف اشارہ ہے۔

یا مثلاً جس سال (۶۲۰ء) آنحضرت صلعم کے چچا ابو طالب اور ام المومنین حضرت خدیجہ رضہ نے یکے بعد دیگرے انتقال کیا تو ان افسوسناک واقعات کی مناسبت سے اس سال کو عام الحزن (غم کا سال) کہنے لگے۔ اور بھی کئی مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ خود اسلامی ہجری تقویم کی ابتدا بھی اسی بنیاد پر ہے یعنی یہ عام الہجرت (ہجرت کے سال) سے شروع ہوتی ہے۔

حسنِ اتفاق سے ہمیں ایک ایسی دستاویز دستیاب ہوئی ہے، جس میں اسی اصول پر اس خاندان کے تمام بادشاہوں کے عہدِ حکومت کے واقعات کی فہرست دی گئی ہے، اس میں حموربی کی ۴۳ سالہ حکومت کا ہر ایک سال بھی کسی خاص واقعے سے منسوب ہے۔ اسی حصّہ کی نقل ذیل میں درج ہے۔ افسوس کہ متن کا کچھ حصّہ ضائع ہوگیا ہے بہرحال جو کچھ ملا ہے، وہ بھی کچھ کم اہم نہیں۔ (دواوین کے اندر کا حصّہ

ضائع ہوگیا تھا لیکن بعض مقامات پر اسے دوسرے ذرائع یا قرینے سے مکمل کیا گیا ہے)

۱۔ جس سال حمورابی بادشاہ بنا
۲۔ جس سال انصاف (قائم کیا گیا)
۳۔ جس سال ننار کا تخت (بنا)
۴۔ جس سال ملجا کی فصیل مسمار کی گئی
۵۔ جس سال .... دیوتا کا
۶۔ جس سال .... دیوتا کا محل (تعمیر ہوا)
۷۔ جس سال اِسین (اور اریخ فتح ہوئے)
۸۔ جس سال نخس لِسی نہر کے کنارے پر ...
۹۔ جس سال حمورابی نہر .....
۱۰۔ جس سال ملجا کے باشندے (رعایا بنائے گئے)
۱۱۔ جس سال (دبیکو اور شلیبی) فتح ہوئے
۱۲۔ جس سال شرپینی تم کا تخت (بنا تھا)
۱۳۔ جس سال حد درجہ ....
۱۴۔ جس سال بابل کی دیوی) عشتار کا تخت (تعمیر ہوا)
۱۵۔ جس سال سات مورتیاں (بنائی گئیں)
۱۶۔ جس سال نبو (دیوتا) کا تخت (تعمیر ہوا)
۱۷۔ جس سال .... کی مورتی ....
۱۸۔ جس سال بعل دیوتا کے لیے ....
۱۹۔ جس سال پہاڑی کی ....
۲۰۔ جس سال رمان دیوتا کا تخت (تعمیر ہوا)
۲۱۔ جس سال بشو کی فصیل
۲۲۔ جس سال حمورابی ....
۲۳۔ جس سال شہر .... کی
۲۴۔ جس سال بعل دیوتا کے لیے ....
۲۵۔ جس سال سبار مندر کی چار دیواری تعمیر ہوئی
۲۶۔ جس سال .... طوفان سے (تباہ ہوا)
۲۷۔ جس سال .....
۲۸۔ جس سال ای نمحہ کا مندر تعمیر ہوا
۲۹۔ جس سال شال دیوی کی مورتی تیار ہوئی
۳۰۔ جس سال عیلام کی فوج (کو شکست دی گئی)
۳۱۔ جس سال امتبل کا (علاقہ فتح ہوا)
۳۲۔ جس سال (من کیتو) کا لشکر تلوار سے (تباہ کیا گیا)
۳۳۔ جس سال حمورابی نہر ....
۳۴۔ جس سال (نو، عشتار اور ننا ...
۳۵۔ جس سال .... کی دیوار ....
۳۶۔ جس سال ...

۳۷۔ جس سال ۔ ۔ ۔ ۔
۳۸۔ جس سال اُلیاس شہر طوفان سے (تباہ ہوا)
۳۹۔ جس سال (اسیریا فتح ہوا)
۴۰۔ غائب
۴۱۔ غائب
۴۲۔ جس سال شہر ۔ ۔ ۔ ۔
۴۳۔ جس سال ــــــــــ حمورابی بادشاہ کے ۴۳ سال

افسوس کہ متن کے ناتمام ہونے کے باعث ہم اس عظیم الشّان بادشاہ کے زمانے کے بہت سے واقعات کے پورے علم سے محروم رہ گئے۔ لیکن جو کچھ ہم تک پہنچا ہے اس سے بھی ایک بات بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ اس نے اپنی حکومت کا زیادہ زمانہ مذہبی اور رفاہِ عام کے کاموں میں صرف کیا اور بدامنی اور جنگوں میں بہت کم وقت ضائع ہوا۔

فتوحات

حمورابی کے دادا اَپیل سِن کی حکومت کے اواخر میں (۲۰۸۹ ق م) مغربی عیلام (یعنی اَمَتبل) کے تخت پر بادشاہ "قدر معبوق" متمکّن تھا۔ اُس نے اس سال جنوبی بابل کی ساحلی شہری ریاست لارسہ پر حملہ کردیا۔ لارسہ والوں کو شکست ہوئی۔ "قدر معبوق" نے یہاں کے بادشاہ کو معزول کر کے اس کی جگہ اپنے بیٹے وَردسِن کو گدّی پر بٹھا دیا۔

وردسِن بارہ برس تک حکمران رہا، اور اس کے بعد اس کے چھوٹے بھائی رِم سِن نے ۶۱ برس کے لمبے زمانے تک لارسہ پر حکومت کی۔ وَردسِن نے اپنے زمانۂ حکومت میں اُور اور حلآبو اور اُریدو اور لاغاش کے مشہور شہر فتح کر کے انھیں بھی اپنی سلطنت میں شامل کر لیا اور پورے جنوبی علاقے کا مالک بن گیا۔

جب اس کی وفات کے بعد، رِم سِن تخت نشین ہوا تو اس نے سلطنت کو مزید وسعت دی اور شمال میں نِفر کا اہم شہر فتح کر کے، اپنے سُومر اور اکّد کا بادشاہ ہونے کا اعلان کر دیا۔ اپنی حکومت کے تیسویں سال اس نے جنوب کی آخری طاقتور شہری ریاست اِسِین کو شکست دی، جو وردسِن کے چنگل سے بچ رہی تھی اور اس کے بعد وہ گویا سُومر اور وسط بابل کا بلا شرکتِ غیرے حکمران بن گیا۔

یہ وہ زمانہ ہے جب اپیل سن کی وفات کے بعد، بابل پر حموربی کا والد سن مبلت حکمران تھا۔ جب تک اسین فتح نہیں ہوا تھا، سن مبلت کو توقع تھی کہ شاید عیلامی طاقت اس سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے۔ اس لیے اس نے ان دونوں کی باہمی کشمکش میں کوئی حصہ نہیں لیا اور نتیجے کا منتظر رہا۔ حال آنکہ زیادہ دانشمندی کا طریقہ یہ تھا کہ وہ اسین سے مل کر اس مشترکہ بیرونی دشمن کا خاتمہ کر دیتا۔ لیکن اس نے یہ نہیں کیا۔ جب آخر کار عیلامی فوجیں اسین پر بھی قابض ہو گئیں، تو اب ناممکن تھا کہ بابل کی عیلامیوں سے مڈبھیڑ نہ ہو۔ ایسے دو طاقتور پڑوسیوں کا زیادہ دیر تک ایک دوسرے کے ساتھ صلح صفائی سے رہنا ناممکن تھا۔ لازمی تھا کہ کسی نہ کسی وقت ان کے درمیان چل جائے۔ خاص طور پر جبکہ خود سن مبلت کا بھی جنوب کی انھی شہری ریاستوں پر دانت تھا جو رم سن کے قبضے میں تھیں۔ ادھر رم سن کی متواتر فتوحات نے اس کے حوصلے بڑھا دیے تھے۔ جب ایک مرتبہ فتح کا خون کسی کے منھ لگ جائے، تو اس کے بعد اس کے لیے قناعت کر کے چین سے بیٹھ رہنا محال ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ رم سن یہ بھی خوب جانتا تھا کہ جب تک بابل اور سن مبلت کا کانٹا راستے میں ہے وہ نہ اطمینان سے جنوب میں حکمران رہ سکتا ہے نہ شمال ہی کی طرف پیش قدمی کر سکتا ہے۔ آخر کار اس نے سن مبلت کی حکومت کے آخری سال یعنی ۲۰۶۸ ق م میں بابل پر چڑھائی کر دی۔ بہت گھمسان کا رن پڑا۔ دونوں طرف کشتوں کے پشتے لگ گئے، لیکن کوئی فیصلہ نہ ہو سکا کہ کون ہارا اور کون جیتا۔ اگرچہ رم سن کو خالی ہاتھ واپس جانا پڑا، لیکن اس کے بعد چند برس کے لیے بابل کی حکومت عیلام کے خلاف کوئی کارروائی کرنے کے ناقابل ہو گئی۔

اسی سال (۲۰۶۸ ق م) سن مبلت کا انتقال ہو گیا۔ اور حموربی اس کی جگہ تخت نشین ہوا۔ ممکن ہے، اس تبدیلی کا بھی کچھ اثر ہوا ہو، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ واقعی ان ایام میں بابل کی حکومت میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ وہ حملہ آوروں کا تعاقب کر سکتی یا انتقام لینے کے لیے لارسہ اور عیلام پر حملہ کر دیتی۔ اس لیے اسے مجبوراً خاموشی اختیار کرنا

پڑی اور جیسا کہ بیان ہو چکا ہے، اگر تورات کی محوّلہ بالا (کتاب پیدائش، ۱۴: ۱-۲) شہادت پر اعتبار کیا جائے، تو ماننا پڑیگا کہ اس کے بعد کچھ زمانے تک حمورابی عیلامیوں کے حلیف کی حیثیت سے ان کی لڑائیوں میں حصّہ لیتا رہا۔

بابل میں اس عیلامی حملے اور جنگ کے اثرات دو برس تک رہے۔ سارے ملک میں بدامنی اور بےچینی کا راج تھا۔ دوسرے سالِ جلوس کا نام "جس سال حمورابی نے ملک میں انصاف قائم کیا"، اسی طرف اشارہ کرتا ہے کہ بادشاہِ وقت نے کوشش کرکے ملک میں نئے سرے سے امن وامان قائم کردیا اور لوگ دوبارہ اطمینان سے اپنا کاروبار کرنے لگے۔

حمورابی کے ساتویں سالِ جلوس میں ہمیں اس کے اِسین فتح کرنے کی خبر ملتی ہے۔ یہ شہر سُومر کے انتہائی جنوب میں سمندر کے کنارے پر تھا۔ جب سِن مُبلّت کی حکومت کے اواخر میں عیلامیوں نے رِم سِن کی سرکردگی میں مغرب کی طرف پیش قدمی شروع کی، تو انھوں نے پہلے اِسین ہی پر ہاتھ صاف کیا تھا اور اس کے بعد سے یہ علاقہ عیلامی سلطنت میں شامل ہوگیا۔ جب حمورابی نے اپنی طاقت بڑھالی اور اسے عیلامیوں کی طرف سے کسی قسم کا کھٹکا نہ رہا، تو اب اس نے ہاتھ پاؤں نکالنے شروع کیے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ اس نے ساتویں برس اِسین اُن سے چھین لیا اور اس کے ساتھ ہی اُریخ (موجودہ ورکا) پر بھی قبضہ جمالیا۔

دسویں برس مَلگیا اور اس سے اگلے برس رَبیکو اور شلیبی یکے بعد دیگرے فتح ہوئے۔

اس کے بعد ۱۹ برس تک ہر طرف امن وامان اور خوشحالی کا دور دورہ رہا۔ اس اثنا میں حمورابی برابر اپنی طاقت بڑھاتا رہا۔ مختلف جگہ مندر تعمیر کیے اور ان میں مُورتیاں نصب کیں۔ پرانے مندروں کی مرمت کی اور وہاں نئے بُت چڑھائے۔ اہم اور بڑے شہروں کی فصیلوں کو مستحکم کیا۔ نہریں کھودیں اور اس طرح کھیتی باڑی کے کام میں لوگوں کو سہولت مہیّا کرکے ملک کی خوشحالی میں اضافہ کیا۔

جب اس نے دیکھا کہ اب کوئی قریبی طاقت اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی، تو اس نے ۳۰ سال جلوس میں اپنے گرد و نواح کی ریاستوں کا رخ کیا۔ سب سے پہلے اس نے عیلام سے پرانا حساب چکانے کی ٹھانی اور اس دیرینہ دشمن پر دھاوا بول دیا۔ لارسہ میں ابھی رِم سِن ہی حکمران تھا، اگرچہ اب وہ بہت بوڑھا ہو چکا تھا۔ اب کے میدان بابلیوں کے ہاتھ رہا اور عیلامیوں کو شکست فاش ہوئی۔ رِم سِن خود گرفتار ہو گیا اور آخر اس نے باج گذاری کا اقرار کر کے گلو خلاصی کرائی۔

اس فتح نے حمورابی کے حوصلے اور بھی بڑھا دیے۔ اگلے برس اس نے خاص اَمتبل یعنی مغربی عیلام سے ٹکّر لی اور اسے نیچا دکھایا۔ اس سے اگلے سال مَن کیتو کو اس کی تلوار کا مزہ چکھنا پڑا۔ اس کے بعد پھر چند برس خاموشی رہتی ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ اپنی حکومت کے آخری زمانے یعنی ۳۹ سالِ جلوس میں وہ پھر نکلتا ہے اور اب کے انتہائے شمال میں اسیریا فتح کر کے ملک کی تاریخ میں پہلی مرتبہ اسیریا اور بابل یعنی شمال اور جنوب کا تمام علاقہ ایک حکمران کے زیرِ نگین لانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

نظم و نسقِ سلطنت

لیکن اس سے یہ خیال نہ کیا جائے کہ حمورابی صرف جنگ کرنا اور اپنے دشمنوں کو شکست دینا ہی جانتا تھا۔ اگر وہ اپنے زمانے کا سب سے بڑا فاتح اور جرنیل تھا، تو وہ اتنا ہی بڑا بیدار مغز منتظم اور مقنّن بھی تھا۔ ہمیں اس کے (۵۵) ایسے خط ملے ہیں جو اس نے اپنے ایک والی (گورنر) کے نام لکھے تھے۔ ان کے مطالعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ ملک کے ہر ایک حصّے کے نظم و نسق میں بذاتِ خود بہت گہری دلچسپی لیتا تھا۔ ہر ایک معاملے کی جزئیات تک پر اس کی نگاہ تھی اور حکومت کا کوئی معمولی سے معمولی شعبہ بھی ایسا نہیں تھا، جس پر اسے خود توجّہ دینے میں عار ہو۔

احکام کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں :

۱۔ عیلام کے علاقے سے جو دیوی دیوتاؤں کی مُورتیاں مالِ غنیمت میں آئی ہیں انھیں نہایت عزّت اور احترام کے ساتھ ان کے پُجاریوں اور پُجارنوں سمیت ایک حفاظتی دستے

کی نگرانی میں بابل بھیج دیا جائے۔

۲۔ اب کے سال میں ایک نیا مہینا (ایلول ثانی) اضافہ کر دیا جائے تاکہ جنتری میں باقاعدگی پیدا ہو جائے۔

۳۔ دَمنوُم نہر کے کنارے جن زمینداروں کی زمین ہے انھیں لگا کر نہر صاف کرائی جائے۔ اور اس کی تہ کی مٹی نکلوائی جائے۔ یہ کام اس مہینے کے اندر اندر مکمل ہو جانا چاہیے۔

۴۔ خبر ملی ہے کہ فلاں شہر میں فلاں سرکاری ملازم نے رشوت لی ہے۔ فوراً تحقیقات کی جائے۔ اگر جرم ثابت ہو جائے، تو رشوت کا مال سربمہر کر دو اور مرتشی ملازم اور گواہوں کو یہاں بھیج دو۔

۵۔ فلاں شخص نے شکایت کی ہے کہ میں نے قرض لیا تھا اور اپنی زمین قرضخواہ کے پاس رہن رکھ دی تھی۔ اب قرضخواہ نے نہ صرف میری فصل پر قبضہ کر لیا ہے، بلکہ زمین بھی واپس نہیں دیتا۔ یہاں بابل کے دفتر سے تحقیقات پر معلوم ہوا کہ یہ زمین واقعی اس شخص کی ملکیت ہے۔ پس قرضخواہ سے اس شخص کی زمین واپس دلوائی جائے اور مجرم کو سزا دی جائے۔

۶۔ فلاں شخص نے دعویٰ کیا ہے کہ آج تین برس ہو گئے ہیں، میں نے فلاں عامل کو تین گُر غلّہ قرض پر دیا تھا۔ لیکن متعدّد مطالبوں کے باوجود عامل غلّہ واپس نہیں کرتا۔ ہم نے عاملِ مذکور کی دستخطی رسید مدّعی کے پاس ملاحظہ کی ہے۔ فوراً اصل مع سود اس عامل سے وصول کر کے قرضخواہ کے حوالے کیا جائے۔

۷۔ فلاں شخص نے تمھارے پاس زمین کا مقدمہ دائر کر رکھا ہے اور مقدّمے کی سماعت فلاں دن ہے۔ لیکن ہم نے مدّعی کو اُور کے مندر کے لیے چڑھاوا تیار کرنے اور وہاں جا کے اسے بھینٹ کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس لیے وہ سماعت کے دن حاضر نہیں ہو سکیگا۔ جب اُور کا تیوہار ختم ہو جائے، تو مدّعی اور دونوں مدّعا علیہوں کو بابل روانہ کر دو، تاکہ ان کے مقدّمے کا فیصلہ کیا جا سکے۔

۸- ہتھیار بنانے والے کاریگروں کو ابا لکڑی کے (۲۰۰۱) ٹکڑے درکار ہیں۔ لکڑی ٹھوس ہو۔ ہر ایک ٹکڑا وزن میں تہائی یا نصف قاع سے زیادہ نہ ہو۔ اور لمبائی میں دو یا تین بالشت سے لے کر چار بالشت تک ہو۔ اس بات کا خیال رکھا جائے کہ جنگل سے جو درخت کاٹے جائیں وہ گھن کے کھائے ہوئے نہ ہوں بلکہ مضبوط اور ٹھوس ہوں مزید یہ کہ یہ کام فوراً سرانجام ہو جانا چاہیے۔ تاکہ کاریگر بیکار نہ بیٹھے رہیں۔

۹- اس خط کے پہنچنے پر مندرجہ ذیل تین آدمیوں کو اپنے پاس بلواؤ۔ یہ تینوں شخص بابِ قصر کے ملازم ہیں۔ ان تینوں کو گرفتار کر کے میرے پاس بھیج دو۔

۱۰- مندرجہ ذیل آٹھ آدمی، جو تمھارے علاقے میں ہیں، اپنے اپنے کام پر حاضر نہیں ہوئے۔ تم انھیں اپنے پاس بلواؤ اور پوری کوشش کرو، کہ وہ ضرور تمھارے سامنے حاضر ہوں۔ جب وہ پیش ہو جائیں تو انھیں زیرِ حراست کر لو اور ہمارے پاس بھیج دو۔

غالباً یہ مثالیں کافی ہونگی۔

اس سے معلوم ہوگا کہ حمورابی اپنی وسیع سلطنت کے معاملات سے کس حد تک باخبر تھا اور انتظامِ حکومت درست اور مضبوط رکھنے کے لیے بظاہر کیسی بہت معمولی معمولی باتوں میں بھی ذاتی دلچسپی لیتا تھا۔

حمورابی سے پہلے جو قانون سُومر اور اکّد میں رائج تھا، اس کا بھی کچھ حصّہ مل گیا ہے لیکن حمورابی نے اسے مکمل طور پر مدوّن کر کے ملک میں نافذ کر دیا۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک آدھ برس کا کام نہیں تھا۔ اسے جمع کرنے میں بہت وقت لگا ہوگا۔ ہم نے قانون کی تمہید میں یہ الفاظ دیکھے ہیں:

"عدل و انصاف پھیلانے والا، رعایا کا رہنما، جس نے اَشُور کے سرپرست معبود کو پھر سے وہاں قائم کیا۔

دشمنوں کا قلع قمع کرنے والا، جس نے نینوا کے ای شمش مندر میں عِشتار دیوی کا نام چمکایا ہے۔"

اُشور اور (اس کا دارالخلافہ) نینوا، جیسا کہ بیان ہوا، حمورابی نے اپنے ۳۹ سالِ جلوس میں فتح کیے تھے۔ قانون میں ان کے ذکر سے ثابت ہوتا ہے کہ اس نے یہ قانون اپنی حکومت کے بالکل آخری زمانے (۲۰۲۸ قم) کے درمیانی چار برسوں میں نافذ کیا۔

بیشک، بابل کے پہلے شاہی خاندان کی بنیاد سُمو ابُوم نے رکھی اور اس کے جانشینوں نے اپنی تلوار کے زور سے اس کے استحکام میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا۔ لیکن اس سے بھی انکار ممکن نہیں کہ اس "گھرانے کا فخر" حمورابی ہی تھا۔ نہ صرف اس نے وسیع فتوحات کے ذریعے اس کی عظمت و طاقت میں بہتم بالشّان اضافہ کیا بلکہ اپنی انتظامی قابلیت اور دُور دست علاقوں کے جزو و کل میں ذاتی دلچسپی لے کر سارے خطّے کو منتشر شہری ریاستوں کی جگہ ایک ملک بنا دیا۔ اور پھر اس ملک کے انتظام کے لیے اس نے جو قانون مرتّب کیا، وہ آپ دیکھ ہی چکے ہیں۔ اس قانون کی زد سے کوئی شخص یا طبقہ نہیں بچا۔ یہ حاکم اور محکوم، خواجہ اور غلام، امیر اور فقیر، سب کے معاملات پر یکساں حاوی تھا۔ اور اُس طبقاتی عدم مساوات اور اختلاف کے دَور میں یہ حمورابی کا اتنا بڑا کارنامہ ہے کہ یہ رہتی دنیا تک اس کا نام زندہ رکھنے کو کافی ہے۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ یہ قانون پورے کا پورا، اس کے دماغ کی اختراع ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ اُس نے اِس کی تالیف میں پہلے سُومری قانون سے مدد لی ہے۔ اس کے علاوہ اس میں ملک کے رسم و رواج کو بھی شامل کر کے اسے مستقل قانون کی حیثیت دے دی گئی ہے۔ لیکن اس میں بھی شبہہ نہیں، کہ اس سارے منتشر مواد کو یکجا مرتّب کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ جہاں اسے سُومری قانون یا رواج میں کوئی نظیر نہیں ملی، اس نے اپنے تجربے سے فائدہ اٹھایا۔ اور جب ایک مرتبہ یہ مجموعہ تیّار ہو گیا، تو پھر اس پر پوری پابندی اور قوت سے بے رُو رعایت عمل در آمد کیا۔ ہمیں ہزاروں قانونی دستاویزیں دستیاب ہوئی ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ قانون محض کاغذی اور برائے نام چیز نہیں تھی، بلکہ سلطنت کے طول و عرض میں، روزمرّہ کے کاروبار کے لیے، بنیادی پتھر کی حیثیت رکھتا ہے۔ خود حمورابی کے چند خطوط جو حسنِ اتّفاق سے دست بُردِ زمانہ سے

محفوظ رہ گئے ہیں، اور جن کی طرف اوپر اشارہ ہو چکا ہے، ان سے بھی اس امر کی ناقابلِ انکار شہادت ملتی ہے کہ خود بادشاہ کو اس کی تعمیل میں کس درجہ شغف تھا۔

حمورابی نے ۴۳ سال تک داد و دہش سے حکومت کرنے کے بعد ۲۰۲۵ ق م میں وفات پائی اور اس کے بعد اس کا بیٹا شمس ایلنا بابل کے تخت پر بیٹھا۔

کتابیات

1. A History of SUMER and AKKAD---
L.W.KING, London (1923).

یہ بابل کے نمایاں شہرت حاصل کرنے سے پہلے کی تاریخ ہے

2. The Babylonian Story of the Deluge--
(British Museum, London (1929).

اس کتاب میں طوفانِ عظیم کے واقعے کی وہ تفصیلات ہیں، جو اس ملک کی پرانی روایات میں ملتی ہیں۔

3. The VENUS Tablets of Ammi Zaduga--
FORTHERINGHAM and LANGDON, London (1938).

4. The Bible comes Alive--
Sir Charles Marston, London (1947).

ان دونوں کتابوں میں یہ بحث ہے، کہ بابل کے اس شاہی خاندان کا زمانہ کونسا ہے، جس میں حمورابی تھا۔

5. The Bible and Archaeology--
Sir F.KENYON, London (1949).

اس میں بھی چوتھی کتاب کی طرح مصنف نے جدید اثری تحقیقات کو عہد نامۂ قدیم میں مندرج واقعات

پر منطبق کرنے کی کوشش کی ہے۔ قدرتی طور پر اس سلسلے میں حمورابی کا ذکر بھی آگیا ہے اس کے بعد ہمارے علم میں جو اضافہ ہوا ہے اس کے حالات عراق کے محکمۂ آثار قدیمہ کے چھ ماہی رسالے شومر (عربی و انگریزی) میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

6. A History of Babylon--
L.W. KING, London (1919).
7. The Letters and Inscriptions of Hammurabi
L.W.KING, London (1900).

ان دونوں کا موضوع ان کے نام سے ظاہر ہے۔ اس مضمون پر مزید اور مفصل واقفیت حاصل کرنے کے لیے ان کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

تیسرا باب

بابلی تہذیب و تمدن

قانونِ حمورابی کم و بیش ڈیڑھ دو ہزار برس تک نہ صرف بابل (سُومر اور اکدّ) ہی میں، بلکہ ایشیائے کوچک اور وسط ایشیا کے بہت بڑے خطے میں بھی نافذ رہا۔ اس لیے ہم یہ خیال کرنے میں حق بجانب ہیں، کہ اس طویل زمانے میں، ہر طرح کے سماجی کاروبار اور معاملات انہی اصول کے مطابق طے پاتے رہے ہونگے، جو اس میں مندرج ہیں۔ اس خیال کی تائید ان آثار سے بھی ہوتی ہے، جو شہر نینوا کی کھدائی سے دستیاب ہوئے ہیں۔

ساتویں صدی قبلِ مسیح میں اسیریا کے تخت پر ایک بادشاہ اشور بنی پال (۶۶۸-۶۲۶ ق م) نامی متمکّن تھا۔ عہد نامۂ قدیم میں اس کا ذکر اسناپر کے نام سے آیا ہے (عذرا ۴-۱۰) اور یونانی مؤرخوں نے سر دنا پالس لکھا ہے۔ یہ بہت بڑا علم دوست بادشاہ تھا۔ اس نے اپنے دارالخلافے نینوا میں ایک عظیم الشّان کتابخانہ جمع کیا، جس میں تمام قدیم مذہبی اور علمی و ادبی کتابوں اور دستاویزوں کی نقلیں یکجا کر دی گئی تھیں۔ اس کتابخانے کا جتنا حصّہ دست بُردِ زمانہ سے بچ رہا، وہ خوش قسمتی سے ۱۸۵۲ء سے ۱۸۷۶ء تک کی رُبع صدی میں کھدائی کرتے ہوئے ماہرینِ اِسثوریات کے ہاتھ لگ گیا۔ اس طرح ہمیں قانونِ حمورابی سے

حاشیہ ۔ اس مضمون میں جہاں کوئی اور قرینہ نہ ہو، وہاں قانون سے مراد قانونِ حمورابی ہے، جس کا ترجمہ پہلے باب میں چھپا ہے۔ قوسین کے اندر کے ہندسوں سے اسی قانون کی دفعہ کی طرف اشارہ ہے۔

ماقبل و ما بعد کے زمانے میں بابل کے تہذیب و تمدن سے متعلق اتنا وافر مواد دستیاب ہوگیا ہے، کہ ممکن ہے، سیاسی تاریخ اور شاہی خاندانوں اور مختلف بادشاہوں کے زمانۂ حکومت کے بارے میں کوئی گوشہ ابھی تک تاریکی میں رہ گیا ہو، لیکن جہاں تک لوگوں کے رہنے سہنے، ان کے رسم و رواج، شادی و غمی کے مواقع، مذہب اور معتقدات، تجارت اور صنعت و حرفت، علمی اور ادبی سرگرمیوں اور زندگی کے اور بیسیوں مسائل کا تعلق ہے، کوئی چیز اب ہماری نظروں سے اوجھل نہیں رہی۔

ان دستاویزوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حموربی کے بعد بھی اس کا نافذ کردہ قانون انتظامِ ملک کا بنیادی پتھر رہا۔ چنانچہ ہم آیندہ صفحات میں اسی قانون کو متن قرار دینگے اور دوسری اضافی معلومات کو اس کی شرح اور حاشیہ۔ اور ان دونوں کی روشنی میں بابل کے تہذیب و تمدن سے متعلق بحث کرینگے۔

ا۔ نظامِ حکومت

شاہی اختیارات

ہیئتِ اجتماعی کا محور بادشاہ تھا۔ معاشرے کے ہر ایک شعبے کی سرگرمیاں، اس کی ذات سے وابستہ اور اسی کے دم قدم سے زندہ تھیں۔ بادشاہ دین و دنیا کے تمام اختیارات کا جامع تھا۔ وہ بیک وقت امامِ دین بھی تھا اور سلطانِ دنیا بھی۔ مندر میں پوجا کے وقت وہ پجاری تھا اور عدالت کی کرسی پر قاضی القضاۃ۔ وہی واضعِ قانون تھا اور وہی اس کا نفاذ کرنے والا۔ بزمِ امن کی شمع اسی سے کسبِ نور کرتی تھی اور میدانِ جنگ میں فوجوں کی کمان اسی کے ہاتھ میں ہوتی تھی۔ جہاں حکمران کو اتنے وسیع اختیارات حاصل ہوں، ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں مکمل اور مطلق العنان شخصی حکومت کے سوائے اور کسی طرح کا نظامِ حکومت خیال میں بھی نہیں آسکتا۔ عام انتظامِ سلطنت میں کس حد تک عوام کے جذبات اور آرام و آسایش کا خیال رکھا جاتا ہے، یہ محض بادشاہ کی مرضی پر منحصر تھا۔ اگر بادشاہ خدا ترس اور عادل ہوا، تو رعایا خوشحال اور آزاد

ہوگی۔ اگر بادشاہ ظالم اور مستبد ہوا، تو رعایا بھی تباہ حال اور غلامانہ زندگی بسر کریگی۔

مذہبی حکومت

بابل میں نہ صرف شخصی حکومت ہی قائم تھی، بلکہ یہ مذہبی حکومت تھی اور بادشاہت کا نظریہ یہ تھا کہ بادشاہ زمین پر ظلِ الٰہی ہے اور اسے تمام حقوق اور اختیارات براہِ راست دیوتاؤں کی نیابت سے حاصل ہوئے ہیں۔ حمورابی جب اپنے قانون کی تمہید یا خاتمے میں دعویٰ کرتا ہے کہ مجھے انو اور بعل نے مخلوق کا حکمران بنایا ہے اور مردوخ نے مجھے بابل کی سرداری سپرد کی ہے اور شمس نے مجھے قانون عطا کیا ہے، تو وہ خودستائی نہیں کر رہا، نہ ڈون کی لے رہا ہے۔ بلکہ یہ اُن لوگوں کا بنیادی عقیدہ تھا کہ بادشاہی کے تمام شعبے اسے مختلف دیوتاؤں سے ملے ہیں۔

مذہبی حکومت کا یہ نظریہ کچھ بابل ہی سے مخصوص نہیں تھا، بلکہ قدیم مصریوں کا بھی یہی عقیدہ تھا۔ وہاں بھی خدائی حکومت ہی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ مصر میں فرعون، خدا یا اِلٰہ کا اوتار تسلیم کیا جاتا تھا اور اس لیے لوگوں کا یہ فرض تھا کہ وہ بادشاہ کے ہر ایک حکم کی بے چُون وچرا تعمیل کریں۔ اس کے برعکس بابل میں بادشاہ کسی خاص دیوتا یا معبود کا نمائندہ نہیں مانا جاتا تھا، بلکہ واقع یہ ہے کہ بابلی عقیدے کے مطابق دیوی دیوتاؤں کی دنیا اور عام انسانوں کی دنیا الگ تھلگ ہیں اور ان کے ڈانڈے تک آپس میں نہیں ملتے۔ غالباً ان عقیدوں ہی کے تفاوت سے دونوں ملکوں میں شاہی نظامِ حکومت کی کامیابی اور ناکامی کے اسباب معلوم کیے جا سکتے ہیں۔

بہرحال اس کے باوجود بابل میں یہ عام اعتقاد تھا کہ کوئی خاص دیوتا، شہر اور اس کے باشندوں کا آقا اور اُن کا نگہبان ہے۔ شہر کا سب سے بڑا مندر "دیوتا کا مسکن" کہلاتا تھا۔ اور شہر کے لوگ اس کی رعایا تھے۔ اس پہلو سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ بادشاہِ وقت بھی دراصل کسی نہ کسی دیوتا کی نمائندگی ہی میں ملک پر حکمران تھا۔

صوبائی نظام

کہیں سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ بادشاہ کے مشورے کے لیے کوئی

وزیروں کی مجلس بھی تھی یا نہیں۔ البتہ یہ یقینی امر ہے کہ تمام بڑے بڑے شہر، جو کسی زمانے میں آزاد اور مستقل ریاستیں تھیں، حمورابی کے زمانے میں ان کی حیثیت مقامی یا صوبائی حکومت کی ہو گئی تھی۔ یہاں کے لیے مرکزی حکومت کی طرف سے عامل یا گورنر مقرر کیے جاتے تھے اور قرب وجوار کا علاقہ ان کے ماتحت ہوتا تھا۔ عامل اس علاقے میں امن وامان قائم رکھنے کے لیے ذمہ دار تھا۔ اسے تمام دیوانی اور فوجداری اختیارات حاصل تھے۔ انتظامی امور میں اسے مرکزی حکومت یعنی بادشاہ کی طرف سے متواتر احکام موصول ہوتے رہتے تھے، جن پر وہ عمل کرتا تھا۔

صوبائی عامل کے کیا فرائض تھے، ان کا کچھ اندازہ ان ہدایات سے کیا جا سکتا ہے، جو حمورابی اور اس کے جانشینوں نے وقتاً فوقتاً اپنے خطوط میں مختلف عاملوں اور دوسرے حکام کو دی تھیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ منجملہ اور باتوں کے صوبے کی حکومت کو مندرجۂ ذیل انتظام کرنا پڑتے تھے:

(۱) شاہی فوج جس علاقے سے بھی گزرے، اس کی نقل وحرکت اور خورد ونوش کا انتظام اس صوبے کی حکومت کو کرنا پڑتا تھا۔

(۲) (الف) صوبے کو کچھ رقم بطور خراج یا مالیہ ہر مہینے مرکز میں بھیجنا پڑتی تھی۔

(ب) یہ مرکزی مالیہ پورا کرنے کے لیے تمام بڑے بڑے شہر صوبائی حکومت کو ایک مقررہ رقم ادا کرتے تھے، جس کے جمع کرنے کا فرض اس شہر کے مندر یا کسی اور انتظامی ادارے پر عاید ہوتا تھا۔ یہ رقم پوری کرنے کے لیے سب باشندے اپنی اپنی حیثیت کے مطابق ٹیکس دیتے تھے۔ اگر کوئی شخص ایک جگہ سے نقلِ مکان کر کے کسی دوسرے شہر جانا چاہتا، تو جانے سے پہلے اسے وہاں کے جملہ مطالبات ادا کرنے پڑتے تھے۔

(۳) (الف) محصول اور مالیہ، نقد وجنس دونوں شکلوں میں وصول کیا جاتا تھا۔ صوبائی حکومت کا فرض تھا کہ وہ وقت پر اسے وصول کر کے مرکز کے حساب میں اپنے ہاں جمع رکھے۔

(ب) سلطنت کے مختلف حصّوں میں کھجوروں کے وسیع باغ اور جاگیریں، مرکزی حکومت کی ملکیت تھیں۔ ان کی دیکھ بھال کا کام صوبے کی حکومت ہی کو کرنا پڑتا تھا۔ فصل کے موقع پر تمام غلّہ اور اناج اور کھجوریں جمع کر لی جاتی تھیں، جنھیں محفوظ رکھنے کے لیے تمام بڑے بڑے شہروں میں گودام تعمیر کیے گئے تھے۔ جب دارالخلافہ سے طلبی ہوتی، تو نجومیوں سے شُبھ گھڑی پوچھ کے یہ محصول وغیرہ وہاں بھیج دیا جاتا تھا۔

(ج) شاہی خزانے کی ایک بڑی مد، بھیڑ بکریوں کے ریوڑ اور جانوروں کے گلّے بھی تھے۔ اطرافِ ملک میں جہاں جہاں سرسبز چراگاہیں تھیں، وہاں ان کی پرورش ہوتی تھی۔ مختلف مندروں کی جاگیروں پر بھی جانوروں کی بہت بڑی تعداد پرورش پاتی تھی۔ ان سب کی حفاظت اور دیکھ بھال اور ان کی تعداد میں اضافے کی ذمّہ داری، صوبے کی حکومت کے سر پر تھی۔ وقتاً فوقتاً مرکز سے جانوروں کے معائنے کے لیے افسر بھیجے جاتے تھے، جو بادشاہ کی خدمت میں، ان کی صحت، تعداد، خوراک اور دوسرے امور سے متعلق باقاعدہ رپورٹ پیش کرتے تھے۔

(د) شاہی آمدنی کا ایک اہم ذریعہ وہ اُون تھی، جو اُن بھیڑوں سے حاصل ہوتی تھی۔ یہ صوبے کی حکومت کا فرض تھا کہ وہ مناسب وقت پر آدمی مہیا کرے اور ان بھیڑوں کو مونڈوا کر اُن کی اُون دارالخلافہ میں پہنچائے۔

(۴) (الف) زراعت اور کشت زاری کے لیے ملک میں نہروں کا جال بچھا ہوا تھا، جو دونوں دریاؤں سے نکالی گئی تھیں۔ ظاہر ہے کہ ان میں گاد جمع ہو جاتی اور گھاس پھوس اُگ آتی ہو گی۔ اگر اس طرف سے غفلت برتی جاتی، تو بہت مشکل کا سامنا کرنا پڑتا۔ نیز سیلاب کے زمانے میں ہمیشہ اس بات کا اندیشہ رہتا کہ کہیں نہروں کے کنارے یا بند ٹوٹ نہ جائیں۔ اس لیے ان کی صفائی کرانے اور اُنھیں قابلِ استعمال حالت میں رکھنے کے لیے ان شہروں اور

گانو کے باشندے ذمہ دار تھے، جن کی زمینیں ان کے کنارے پر ہوتی تھیں۔ بظاہر یہ کام اُنھیں کسی معاوضے کے بغیر مفت کرنا پڑتا تھا۔ یہی حال دونوں دریاؤں کا تھا۔ یہ صوبائی حکومت کا فرض تھا کہ وہ نہروں اور دریاؤں کی نگرانی رکھّے اور لوگوں سے وقت پر ان کی صفائی کرائے، تاکہ رسل و رسائل میں کسی طرح کا حرج نہ واقع ہو۔

(ب) اس بیگار کے عوض میں ان شہروں کے باشندوں کو اپنے اپنے شہر کے برابر کے دریا اور نہر کے پانی میں ماہی گیری کا کامل حق حاصل تھا۔ کسی دور افتادہ شہر کے لوگ وہاں مچھلیاں نہیں پکڑ سکتے تھے۔ صوبائی حکومت کا فرض تھا کہ وہ ان کے اِس حق کی حفاظت کرے اور کسی دوسرے شہر کے مچھیروں کو وہاں جال نہ ڈالنے دے۔

(۵) جو صوبائی شہر دریاؤں کے کنارے پر واقع تھے، وہاں ہمیشہ کچھ جہاز بھی لنگر انداز رہتے تھے۔ ان جہازوں کا انتظام، ان کی نگہداشت، ان کے لیے ملّاحوں اور خلاصیوں کا تقرر وغیرہ تمام امور بھی صوبے کے حاکم کے فرائض میں شامل تھے۔

(۶) عام طور پر تمام مقدّمے صوبائی عدالت میں پیش ہوتے تھے۔ لیکن اگر فریقین میں سے کسی کو اندیشہ ہوتا کہ یہاں میرا انصاف نہیں ہوگا، یا مقدّمے کے فیصلے میں غیر معمولی تاخیر ہو جائیگی، تو اس صورت میں اُسے یہ حق حاصل تھا کہ وہ براہِ راست بادشاہ یا مرکزی عدالت کے رُوبرو درخواست پیش کردے کہ میرا مقدمہ صوبائی عدالت سے بابل منتقل کر دیا جائے۔ اور اس کی یہ درخواست بالعموم منظور ہو جاتی تھی۔

(۷) اگرچہ مقامی حکومت کو ملازموں کے تقرر اور انھیں ایک جگہ سے دوسری جگہ تبدیل کرنے کا اختیار حاصل تھا، لیکن اس کی منظوری بادشاہ سے حاصل کرنا پڑتی تھی۔

(۸) بادشاہ ذاتی طور پر بھی لونڈی غلاموں کی بہت بڑی تعداد کا مالک ہوتا تھا لیکن یہ سب ہمیشہ دارالخلافے میں نہیں رہتے تھے۔ ممکن ہے اس کی تہ میں ان کی پرورش کا بوجھ ہلکا کرنے کے علاوہ، کوئی سیاسی مصلحت بھی ہو۔ بہر حال یہ مختلف شاہی جاگیروں، مندروں اور مقامی حکومتوں میں تقسیم کر دیے جاتے تھے اور عند الطلب صوبے کی حکومت انھیں مرکز

میں بھیج دیتی تھی۔

فوج :

ابتدا میں جب شہری ریاستوں کی باہمی رقابت اپنے شباب پر تھی، تو یہ آئے دن آپس میں لڑتی رہتی تھیں۔ آج ایک کا پلہ بھاری رہا، تو کل دوسرے نے اپنے حریف کو مار گرایا۔ اس مقامی کشمکش کے علاوہ بیرونی دشمنوں کے حملے کا خطرہ بھی ہمیشہ موجود رہتا تھا۔ خاص طور پر مشرق میں عیلام کو جب بھی موقع ملتا، وہ چڑھائی کرنے سے نہیں چُوکتا تھا۔ ان روزمرہ کی لڑائیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں کی جنگی تربیت خاصی وسیع پیمانے پر ہوگئی، اور ہر ایک شہری ریاست کے پاس مستقلاً کم و بیش ایک منظّم اور مسلّح فوج رہنے لگی۔

سُومری عہد میں چوپہیہ جنگی رتھ کا عام رواج تھا۔ ان ایام میں گھوڑے کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ یہ بہت بعد میدان میں آیا۔ ہر ایک رتھ میں کم از کم دو گدھے جوتے جاتے تھے۔ کوچبان کے عقب میں نیزہ بردار سپاہی سوار ہوتا۔ رتھ کے تختے کے ساتھ ایک بڑے خانے میں نیزوں کا ذخیرہ رہتا تھا جنھیں وہ حسبِ ضرورت استعمال کرسکتا تھا۔ نیزے دو قسم کے تھے۔ ایک وہ جس کا پھل نرشُول کی شکل کا شاخدار ہوتا تھا۔ یہ عام طور پر پھینکنے کے کام آتا تھا۔ دوسرا لمبائی میں چھوٹا اور سادہ پھل کا ہوتا تھا۔ اسے دست بدست لڑائی میں استعمال کرتے تھے۔

پیادہ فوج کی وردی تھی، تانبے کا مخروطی خود، بدن پر بھاری اُونی لبادہ، اور نیچے بھیڑ کے چمڑے کا گھاگرا۔ ان میں ہر ایک سپاہی کے پاس حملہ کرنے کے لیے تین ہتھیار ہوا کرتے تھے۔ چھوٹا نیزہ، تبر اور خنجر (اک دھاری اور دو دھاری)۔ اگرچہ اس عہد کی تصویروں میں تیر کمان کا کہیں نشان نہیں، لیکن آثار میں تیروں کے سوفار کی بہت بڑی تعداد ملی ہے۔ کچھ زمانے بعد پیدل فوج کو مستطیل شکل کی ڈھالیں بھی مہیّا کردی گئی تھیں۔ یہ مدافعت کے کام آتی تھیں۔

حمورابی کے زمانے میں فوج دو قسم کی تھی۔ ایک باقاعدہ، یعنی وہ جو مستقل طور پر

حکومت کی ملازمت میں تھی۔ اسے سرکاری خزانہ سے تنخواہ ملتی تھی، اور یہ ملک کے نظم و نسق اور امن وامان قائم رکھنے کے لیے ایک علاقے سے دوسرے میں منتقل ہوتی رہتی تھی۔ اس کے علاوہ فوج کا ایک حصّہ ایسا تھا، جو جاگیردار مہیّا کرتے تھے۔ بادشاہ ملک کی ساری زمین کا مالک تھا۔ اس لیے وہ اسے بطور جاگیر جسے چاہے، دے سکتا تھا۔ البتہ ہر ایک جاگیر کے ساتھ یہ شرط عائد کردی جاتی تھی، کہ جاگیردار عندالطلب مسلّح سپاہیوں کی ایک مقرّرہ تعداد ساتھ لے کر بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوجائیگا۔ امن کے زمانے میں اس سپاہ کی تنخواہ یا کھانے پینے اور رہنے سہنے کا انتظام جاگیردار خود اپنی آمدنی سے کرتا تھا۔ یہ بالکل وہی نظام ہے، جو سلطنتِ مغلیہ کے زمانے میں ہندستان میں رائج تھا اور جسے ہم منصبداری طریقہ کے نام سے موسوم کرتے تھے۔ یورپ کے بعض ممالک خصوصاً انگلستان کے عہدِ متوسطہ کی تاریخ میں بھی یہی طریقہ مروّج تھا۔

عہدِ حمورابی میں فوج کا صرف یہی فرض نہیں تھا، کہ وہ میدانِ جنگ میں لڑے، بلکہ امن کے زمانے میں ان ہی فوجیوں سے کتنے عام غیر فوجی اور دیوانی کام بھی لیے جاتے تھے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ فوجی اور غیر فوجی کام کی ٹھیک ٹھیک حدود متعیّن ہی نہیں ہوئی تھیں، جیساکہ دفعہ (۲۶) سے (۴۱) تک کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے۔

فوج کی وردی میں تانبے کا زرہ بکتر ہوتا تھا۔ سر پہ خود اب نوکدار شکل کا ملتا ہے۔ فوجیوں کی ڈھال اب مربّع تھی، اور اس پر دھات کی بڑی بڑی میخیں جڑی ہوتی تھیں۔ حملہ کرنے کا ہتھیار اب بھی نیزہ تھا۔ فوج کی ترتیب قطاروں میں ہوتی تھی اور ان کی ڈھالیں ایک دوسرے سے یوں ملی ہوتی تھیں کہ درمیان میں کوئی خلا نہ رہے، بلکہ ڈھالیں ایک دوسرے کے اوپر تک رکھی جاتی تھیں۔ دوسرا ہتھیار تیر کمان تھا۔

جاگیری نظام میں سپاہی کے لیے احکام کی تعمیل لازمی تھی۔ اگر وہ حکم عدولی کرے، تو اسے سزائے موت دی جاتی تھی (۲۶)۔ اگر وہ اپنی جاگیر کا خود انتظام نہ کرے، تو جو چاہے اس پر قبضہ جما لے۔ اور اگر تین برس تک اصلی مالک اس کی واپسی کا مطالبہ نہ کرے تو اس کا حقِ ملکیت زائل ہوجاتا تھا (۳۰)۔ اگر کوئی سپاہی اسیر ہوجاتا تو اسے اپنے فدیہ

کا خود انتظام کرنا پڑتا تھا (۳۲)۔ جاگیر کی وراثت، صرف لڑکے کے نام منتقل ہو سکتی تھی، بیوی یا بیٹی کا اس پر کوئی حق نہیں تھا (۲۸، ۲۹، ۳۸)۔ اس کی علتِ غائی یہ ہے، کہ جاگیر کے ساتھ فوجی خدمت وابستہ تھی، جو عورتیں سر انجام نہیں دے سکتی تھیں۔ اس لیے انھیں جاگیر پر قبضہ دینے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ جاگیر کسی صورت میں بھی بیچی یا رہن نہیں رکھی جا سکتی تھی اور اگر کوئی شخص اسے خریدتا، تو زرِ قیمت بحقِ سرکار ضبط کر لیا جاتا تھا (۳۶، ۳۸)۔ ہاں، اگر کسی جاگیردار نے، سرکاری جاگیر کے علاوہ کوئی اور جائیداد اپنی ذاتی آمدنی سے پیدا کر لی ہے، تو یہ اس کی بیوی اور بیٹی کو مل سکتی ہے۔ یہ فروخت بھی کی جا سکتی ہے اور وہ اسے رہن بھی رکھ سکتا ہے (۳۹)

عدالتیں

عدالتیں تین قسم کی تھیں:

(۱) مذہبی عدالتیں

(۲) سرکاری عدالتیں

(۳) پنچایتیں

ان میں سے ہر ایک پر علیحدہ علیحدہ تفصیل سے لکھنے کی ضرورت ہے۔

(۱) مذہبی عدالتیں:

یہ سب سے قدیم تھیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں مذہبی رسوم کے علاوہ تمام عدالتی کاروبار بھی مندر ہی کے ذمّہ تھا اور کاہن یا پجاری ہی تمام معاملات کا مذہبی قانون کی رُو سے فیصلہ کرتے تھے۔

امرِ واقع یہ ہے کہ تمام پرانی قوموں میں بادشاہ اور دینی پیشوا، شخص واحد ہوا کرتا تھا۔ اس لیے جہاں ایک وقت میں وہ پوجا پاٹ اور مذہبی رسوم کی ادائی میں مہا پجاری اور کاہنِ اعظم کے فرائض سر انجام دیتا تھا، وہیں دوسرے وقت میں وہ اپنی رعایا کے قضیے فیصل کرنے کے لیے سب سے بڑا قاضی بھی ہوتا تھا۔ کچھ زمانہ بعد، کام بڑھ جانے کے باعث، اگرچہ اس نے مذہبی کام کے لیے الگ کاہن اور پجاری مقرر

کردیے، جو اس شعبے میں گویا اس کا ہاتھ بٹاتے تھے لیکن اصولاً اب بھی کاہنِ اعظم اور مہا پُجاری وہ خود ہی تھا۔

یہی وجہ ہے، کہ قانون میں مذہبی رسوم (اور خرافیات تک) کے باقیات ملتے ہیں۔ مثلاً اس کے آغاز ہی میں بددعا اور جادو ٹونے کا ذکر ہے اور حکم ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کے خلاف جادو کرنے کا الزام لگائے، تو اس سے اس کا ثبوت طلب کیا جائے کیوں کہ یہ بہت خطرناک الزام تھا۔ اس کی حیثیت آج کل کے "ازالۂ حیثیتِ عرفی" اور "ہتکِ عزّت" کی سمجھ لیجیے۔ جادوگر، سماج میں بہت حقارت اور خوف کی نظر سے دیکھا جاتا تھا اور لوگ اس کے سائے سے بھاگتے تھے، اس لیے اس کا حق تھا کہ وہ الزام لگانے والے سے ثبوت طلب کرے۔ اس کا طریقہ یہ تھا کہ وہ شخص مقدّس دریا (فرات) میں غوطہ لگائے اور وہاں سے زندہ بچ کر نکل آئے (اس کا مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں میں تیرنے کا رواج نہیں ہوگا) بہرحال یہاں دریا سے "دریا کا دیوتا" مراد ہے اور واضع کا مقصد یہ ہے، کہ اگر اس شخص نے دوسرے پر جادو کرنے کا جھوٹا الزام لگایا ہے، تو دیوتا اسے بطور سزا ڈبو دینگے۔ دوسرے لفظوں میں اس شخص کی موت اس کے جھوٹا ہونے کا قطعی ثبوت ہوگی۔ اس صورت میں ملزم اس کی جایداد پر بھی قبضہ کریگا۔ لیکن اس کے برعکس اگر دریا دیوتا اسے بیگناہ قرار دیں یعنی وہ ڈوبنے سے بچ نکلے تو ثابت ہوا کہ دوسرے شخص نے واقعی اس پر جادو کیا ہے، جادوگر کی سزا قتل ہے۔ اور اس کے علاوہ اس کی جایداد بھی مدّعی کے حوالے کردی جائیگی (۲) بابل میں دیوتا سے استمداد صرف پانی (دریا) کی شکل میں کی جاتی تھی۔ بعض دوسرے ملکوں میں آگ کا بھی رواج تھا۔ مثلاً ہندوستان میں جب رام چندر جی نے اپنی بیوی سیتا کو اپنی عصمت و عفّت کا ثبوت مہیّا کرنے کو کہا تو انھوں نے آگ میں سے گذر کر اور زندہ سلامت باہر آکے اپنی بیگناہی ثابت کی۔ گویا اگنی دیوتا نے ان کے باعصمت ہونے کی شہادت دی تھی۔

زمانۂ حال کے نظریاتِ قانون و عدل کی رُو سے، اس سے زیادہ بیمعنی قانون اور وحشیانہ طریقۂ انصاف خیال میں نہیں آسکتا۔ لیکن پرانے لوگوں کا یہی عقیدہ تھا۔

کہ دیوتا انسان کی زندگی کے ہر ایک شعبے پر حاوی ہیں۔ ان کے ہاں فریقین اپنے تمام معاملات دیوتاؤں کے حضور پیش کرتے تھے، جس پر دیوتا کسی نشان یا آواز یا اور طریقے سے اپنا فیصلہ سنا دیتے۔ مندروں ہی میں عدالتوں کا ہونا اور کاہنوں اور پجاریوں کا مقدموں کے فیصلے کرنا، اسی قدیم عقیدے اور نظریئے کے مطابق ہے۔ یہ کاہن اور پجاری، دیوتا کے نمایندے مانے جاتے تھے۔ اور لوگوں کا یہ ایمان تھا کہ دیوتا ان سے ہمکلام ہوتے اور انھیں کے ذریعے اپنے احکام صادر کرتے ہیں۔

اس کے ساتھ ہی یہ بھی حکم ہے، کہ اگر کوئی شخص کسی کے خلاف جھوٹی گواہی دے اور اگر اس مقدمے میں سزائے موت دی جا سکتی ہے، تو تاوقتیکہ وہ گواہ اپنے بیان اور خیال کے لیے کوئی معقول عذر نہ پیش کرے، اسے موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔ یہ بھی وہی پرانا قانون ہے "العین بالعین والسن بالسن"، آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت۔ اس کی علتِ غائی یہ ہے کہ چونکہ اس مقدمے میں جرم ثابت ہوجانے کی صورت میں، ملزم کو سزائے موت دی جا سکتی تھی۔ اس لیے گویا جھوٹے گواہ نے عدالت کے سامنے غلط بیانی کرکے، قاضی کو اس کی بنا پر غلط فیصلہ صادر کرنے کی ترغیب دی ہے۔ اسے ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ اس نے ملزم کے قتل کی کوشش کی ہے، اس لیے وہ خود اسی سزا کا مستحق ہے، جو وہ ملزم کو دلوانے کی کوشش کر رہا تھا (۳)۔ اسی اصول کو دیوانی معاملات میں بھی استعمال کیا گیا ہے، یعنی اگر مقدمہ جنس یا نقد سے متعلق ہوگا، تو جھوٹے گواہ کو اتنا ہی بطور ہرجانہ مدعا علیہ کے حوالے کرنا پڑے گا (۴)۔

پانچواں حکم عام اصول کا درجہ رکھتا ہے۔ اگر کوئی قاضی کسی مقدمے میں اپنا فیصلہ لکھ کے اپنی مہر لگا دے اور اس کے بعد یہ ثابت ہوجائے، کہ اس نے جان بوجھ کر غلط فیصلہ دیا تھا۔ تو خود وہ قاضی عدالت کے سامنے پیش کیا جائے۔ وہ مقدمے کی متعلقہ رقم کا بارہ گنا بطور جرمانہ ادا کرے اور آیندہ اسے کسی عدالتی عہدے پر مقرر نہ کیا جائے (۵)۔ بظاہر یہ قانون بہت سخت اور غیر معقول نظر آتا ہے، لیکن اس کی تہ میں بھی مندرجہ صدر

اصول کام کر رہا ہے، قاضی، دیوتا کا نمایندہ مانا جاتا تھا۔ دیوتا نہ غلطی کر سکتے ہیں، نہ غلط فیصلہ دے سکتے ہیں۔ وہ جب بھی کسی مقدّمے سے متعلق اپنی رائے اور فیصلہ دینگے، وہ حرفِ آخر ہوگا اور ہمیشہ درست ہوگا، جسے کبھی تبدیل کرنے کی ضرورت نہیں پیش آسکتی۔ پس اگر کسی قاضی نے غلط فیصلہ کیا ہے، تو یہ کسی عنوان دیوتا کا فیصلہ نہیں ہوسکتا۔ یہ قاضی نے اپنی طرف سے دیا تھا۔ ایسا قاضی، دیوتا کا نمایندہ بننے کا مستحق نہیں۔ وہ ٹھگ ہے، بہروپیا ہے، اسے فوراً اپنی جگہ سے الگ کر دینا چاہیے۔

اسی اصول کی یہ فرع ہے، کہ کسی فیصلے کے خلاف اپیل نہیں ہوسکتی۔ کیوں کہ جب کسی قاضی نے مقدّمے کا فیصلہ کر دیا، تو اسے تبدیل کروانے کی سعی کرنا بیکار ہے۔ دیوتا اپنا کلام نہیں بدلا کرتے۔

یہ مندر نہ صرف عدالت گاہیں ہی تھیں بلکہ آخری زمانے تک مقدّمات کے فیصلوں کی نقلیں، بیع و شرا کی دستاویزیں، نکاح نامے اور دوسرے تمام دفاتر بھی اسی جگہ رکھے جاتے تھے۔ آج تک جتنا تحریری مواد ان امور سے متعلق مہیّا ہوا ہے، وہ بیشتر ان مندروں ہی کی کھدائی سے ملا ہے۔

(۲) سرکاری عدالتیں:

یہ عدالتیں بعد کو قائم ہوئیں۔ شروع میں ان کا وجود نہیں تھا۔ یہاں ہر قسم کے دیوانی اور فوجداری مقدّموں کی سماعت ہوتی تھی، اور یہاں کے قاضی، حکمرانِ وقت کی طرف سے مقرر ہوتے اور اسی کے نمایندے تسلیم کیے جاتے تھے۔ اب مذہبی عدالتوں میں صرف وہی مقدّمے بھیجے جانے لگے، جہاں قسم اٹھانے یا دیوتا کی طرف سے کسی اشارے کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔

ان عدالتوں کا وجود میں آنا، دلیل ہے اس امر کی، کہ مذہبی طبقے کی گرفت نظامِ حکومت اور عوام پر کمزور ہو رہی ہے، اور لوگ یہ محسوس کرنے لگے ہیں کہ زندگی میں ایسے معاملات بھی پیش آسکتے ہیں، جن کا فیصلہ دیوتاؤں سے رجوع کرنے کے بغیر بھی کیا جاسکتا ہے۔

مدّعی، ان عدالتوں کے سامنے، اپنا دعویٰ اصالتاً پیش کرتے، کوئی وکیل وغیرہ نہیں ہوتا تھا۔ اس کے بعد قاضی مدّعا علیہ کو اور حسبِ ضرورت گواہوں کو طلب کرتا۔ کسی مکان یا کھیت یا زمین کے بابت دعویٰ ہونے کی صورت میں قاضی موقع کا معائنہ کرنے کا مجاز تھا۔ اگر کوئی گواہ نہ ہوتا اور مدّعی یا مدّعا علیہ کے پاس کوئی تحریری شہادت بھی نہ ہوتی، تو ان سے قسم لی جاتی تھی۔ اور اس کے بعد قاضی اپنا فیصلہ لکھ دیتا۔ اگر فریقین ایک مرتبہ فیصلے سے متعلق اپنی رضامندی کا اظہار کر دیتے، تو اس کے بعد اس کی خلاف ورزی قابلِ تعزیر تھی۔

تمام قانون میں قید کی سزا کا کہیں ذکر نہیں اور غالباً قید خانے تھے بھی نہیں۔ قانون میں صرف ان سزاؤں کا ذکر ہے: جرمانہ، داغ لگانا، شہر بدر (یا ملک بدر) کرنا، غلام بنا لینا، موت۔

ان عدالتوں کے فیصلے، عام انسانوں کے فیصلے تھے۔ ان کے قاضی، کسی دیوتا کے نہیں، بلکہ ایک انسان (بادشاہ) کے نمائندے تھے اور وہ بھی عام انسانوں کی طرح غلطی کر سکتے تھے۔ اس لیے اجازت دی گئی کہ ان فیصلوں کے خلاف اپیل کی جا سکتی ہے۔ قدرتی طور پر سب سے پہلی اپیل، صوبائی عامل یا اس کی عدالت ہی میں ہوتی ہوگی لیکن اگر اس سے کسی مدّعی کا اطمینان نہ ہوتا تو اسے حق حاصل تھا، کہ وہ اپنا معاملہ مرکزی حکومت اور بادشاہ کے سامنے پیش کر دے۔

اس کے علاوہ حمورابی کے خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ملک میں عدل قائم رکھنے کا خاص خیال رکھتا تھا۔ جو شخص بھی چاہتا، اپنا قضیہ اس کے سامنے رکھ سکتا تھا، اس بات کی ضرورت نہیں تھی کہ اسے ضرور پہلے صوبائی یا ماتحت عدالت ہی میں دائر کیا جائے۔ بادشاہ بحدِّ امکان فوراً اس کا فیصلہ کر دیتا اور متعلّقہ افسر کو اس پر عمل درآمد کرنے کے لیے فیصلے کی اطلاع بھیج دی جاتی تھی۔ اگر مرکز میں تمام معلومات مہیا نہ ہوتیں، تو بادشاہ اسے اپنی رائے کے ساتھ افسرِ متعلّقہ کے پاس بھیج دیتا۔ اسی طرح وہ صوبائی عدالتوں اور عاملوں کے فیصلوں کی بھی نگرانی اور نظرِ ثانی کرتا رہتا تھا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ملک میں عدل و انصاف کا معیار بہت بلند ہو گیا کیوں کہ ہر ایک ماتحت عدالت کو معلوم تھا کہ اگر ہمارے فیصلے کے خلاف اپیل کی گئی تو بادشاہ سلامت خود اس پر غور کریں گے اور ہمارا فیصلہ

غلط ہونے کی صورت میں ہم عتابِ شاہی سے نہیں بچ سکتے۔

(۳۱) پنچایتیں:

یہ بھی نہایت قدیم نظام ہے، بلکہ عین ممکن ہے کہ یہ مذہبی عدالتوں سے بھی پہلے وجود میں آیا ہو۔ آج ہمارا نظریہ یہ ہے کہ جب کوئی شخص کسی جرم کا ارتکاب کرتا ہے تو وہ کسی فردِ واحد کو نقصان نہیں پہنچاتا بلکہ اس کی یہ حرکت پورے سماج یا معاشرے کے خلاف ہے۔ اسی لیے ہم اسے گرفتار کر کے اس پر مقدمہ چلاتے اور اُسے سزا دیتے ہیں۔

یہ بہت قدیم اصول ہے۔ شروع میں آبادی بہت کم تھی۔ ان ابتدائی ایام میں اگر کسی آدمی سے کوئی جرم سرزد ہو جاتا تو پوری برادری کا یہ حق تھا کہ وہ بحیثیتِ مجموعی اس سے باز پرس کرے اور معاملے پر غور کر کے اسے مناسب سزا دے۔ چنانچہ مجرم، قبیلے کے تمام لوگوں کے سامنے پیش کیا جاتا اور وہ غور و خوض کے بعد اسے جو سزا دینا چاہتے، دے دیتے۔ آج بھی سرحدی علاقے میں "جرگہ" کا اصول موجود ہے۔ یہ وہی پرانا طریقہ ہے۔ کہ ہر ایک شخص اپنے افعال کے لیے ساری قوم کے سامنے جوابدہ ہے۔ لیکن جب آبادی بڑھنے لگی، تو تعداد کے علاوہ یہ مشکل بھی تھی کہ لوگ ادھر اُدھر منتشر ہو گئے تھے۔ اب ہر ایک معاملے کے لیے پوری قوم کا جمع کرنا آسان کام نہیں تھا۔ اس لیے طے پایا کہ پوری برادری کی جگہ ان کے قابلِ اعتماد اور تجربہ کار بڑے بوڑھے وقتاً فوقتاً اکٹھے ہو کر ان معاملات کا فیصلہ کر دیا کریں اور ان کا فیصلہ پوری برادری کا فیصلہ متصوّر ہو۔ یہ پنچایت کہلاتی تھی۔ اور ممکن ہے کہ شروع میں یہ صرف پانچ ہی اعضا پر مشتمل بھی رہی ہو۔ پانچ کے عدد کے ساتھ کچھ مذہبی خوش عقیدگی بھی وابستہ ہے۔ کہاوت بھی موجود ہے "پانچ میں پرمیشر" یعنی جب پانچ آدمی کوئی فیصلہ کرنے بیٹھتے ہیں تو ان میں چھٹا، ان کا مشیر، خدا ہوتا ہے اور وہ انھیں سیدھے راستے کی طرف ہدایت کرتا ہے۔ اس لیے ان کا فیصلہ سب کے لیے قابلِ قبول ہے۔

اس پنچایت کے اجتماع عام طور پر شہر کی فصیل اور پھاٹک پر ہوتے تھے بلکہ بابل کی پرانی دستاویزوں میں تو پنچایت کا لفظ بھی موجود نہیں، صرف پھاٹک یا فصیل ہی کا ذکر ہے۔ "فلاں شخص سبارہ کی فصیل کے سامنے پیش کیا گیا"، یا "فلاں شخص نفر

کے پھاٹک پر حاضر ہوا، جس سے مراد یہ ہے کہ وہ شخص پنچایت کے روبرو حاضر ہوا۔

اس سے معلوم ہوگا کہ سلطنتِ بابل میں عدالتوں کا بہت وسیع نظام موجود تھا اور ہمیں جو دستاویزیں ملی ہیں، ان سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ سارے ملک میں عدالتوں کی بہت بڑی تعداد تھی۔ مقامی اور صوبائی عدالتیں تھیں اور ان سب سے اوپر عدالتِ اعلیٰ حکومت کے مرکز بابل میں تھی۔

مہریں:

قدیم زمانے کی تمام قانونی دستاویزوں کے آخر میں مہریں موجود ہیں مثلاً خرید و فروخت کے اقرار نامے پر بائع کی مہر ہوتی تھی۔ ٹھیکے یا پٹے کی صورت میں ٹھیکے دار یا پٹے دار کی، قرض کی صورت میں، مقروض کی، وصیت اور تقسیم وراثت کی دستاویز میں، موصی اور مورث کی۔ عام اصول یہ تھا کہ جو شخص کسی حق سے دست بردار ہو رہا ہے یا کوئی ذمہ داری اختیار کر رہا ہے، وہ اپنی مہر لگائے، تاکہ بعد کو وہ اس سے انکار نہ کر سکے۔ اگر دونوں فریق کوئی حق چھوڑ رہے ہیں یا کوئی ذمہ داری اٹھا رہے ہیں، تو دونوں کو مہر لگانا پڑتی تھی۔ نکاحناموں میں عام طور پر ایسا کیا جاتا تھا یعنی خاوند اور بیوی دونوں کی مہریں لگائی جاتی تھیں۔ تجارتی شراکت ناموں میں بھی یہی صورت تھی یا جہاں دو شخص جائداد تقسیم کرتے یا تبادلہ کرتے۔

یہ مہریں دو طرح کی ہیں۔ بعض اوقات یہ محض دستخط کی جگہ لگی ہیں مثلاً کسی شخص نے کوئی چیز فروخت کی، وہ دستخط نہیں کرتا (یا نہیں کر سکتا) اور دستاویز کے اصلی ہونے اور اس کی قانونی حیثیت کے ثبوت میں اپنی مہر کر دیتا ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ مہر محض کسی دستاویز کی تحریر کے متن کی تعیین کے لیے لگائی گئی ہے۔ آج کل ہماری عدالتوں میں بعض رجسٹری دستاویزوں میں اس خطرے کا سدِ باب یوں کرتے ہیں کہ پوری تحریر کی سطریں گن لی جاتی ہیں اور دستاویز کے آخر میں سطروں کی تعداد درج کر دی جاتی ہے۔ تاکہ بعد کو کسی کے لیے اس میں دست اندازی کا موقع نہ رہے۔ اس زمانے میں سطروں کی تعداد نہیں گنی جاتی تھی۔ بلکہ یہی کام ان مہروں

سے لیا جاتا تھا۔ یہ مُہر، تحریر کے اختتام پر لگا دی جاتی تھی، تاکہ اس کے بعد اس میں کسی حذف و اضافہ یا رَدّ و بدل کا احتمال نہ رہے۔ بعض اوقات یہ مُہریں اس طرح لگائی گئی ہیں کہ تحریر کے آخری الفاظ تک اس کے نیچے آگئے ہیں۔ یا اگر تختی پر جگہ خالی رہ گئی ہے۔ تو اس تمام جگہ کو مُہروں سے ناقابلِ استعمال بنا دیا گیا ہے۔

جن لوگوں کے درمیان معاہدہ ہوتا تھا، دستاویز پر اُن کی مُہروں کے علاوہ گواہوں کی مُہریں بھی لگا کرتی تھی۔ گواہوں کی تعداد عام طور پر معاملہ کی اہمیت پر منحصر تھی۔

یہ مُہریں سخت پتھر کی بنی ہوئی ہیں اور اُن کی شکل مدوّر نلکی کی ہے۔ ان کی بہت بڑی تعداد مختلف مقامات سے ملی ہے۔ ان کے بیرونی گھیر پر کوئی تصویر اور نقش کندہ کر دیا جاتا تھا۔ بالعموم اس کا تعلق کسی مذہبی روایت یا دیو مالا کے قصّے سے ہوتا۔ اِس کے علاوہ صاحبِ مُہر کا نام ہوتا۔ ہمیں بلا مبالغہ ہزاروں مُہریں ملی ہیں، لیکن ان میں سے کوئی ایک دوسرے سے نہیں ملتی۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مُہر کن کی قوتِ ایجاد و تخیل کس بلا کی تھی اور یہ پیشہ کتنا اہم اور سُود مند رہا ہو گا۔

بعض دستاویزوں پر ناخنوں کے نشان بھی ملے ہیں۔ اگر یہ محض اتفاقی اَمر نہیں تو غالباً اس کی ابتدا یوں ہوئی ہو گی کہ اگر کسی شخص کے پاس مُہر نہیں ہوتی تھی، تو وہ ناخن کا نشان کر دیتا، بالکل اسی طرح جیسے آج بھی ان پڑھ لوگ انگوٹھے کا نشان کر دیتے ہیں۔ بعد کو یہ رسم عام ہو گئی۔

قسم: ان قانونی دستاویزوں کا ایک اور اہم جُزو قسم ہے۔ مُہر کی طرح یہ بھی وہی شخص کھاتا تھا جو اس دستاویز کے ذریعے کوئی حق چھوڑتا یا ذمّہ داری اٹھاتا تھا۔

شروع میں یہ قسم صرف بادشاہ کے نام کی اٹھائی جاتی تھی۔ بادشاہ چوں کہ دیوتا کا نمائندہ تھا اور خود بھی مقدس ہستی تھی، اس لیے اس کے نام کی قسم گویا دیوتا یا اِلٰہ کی قسم تھی۔ حمورابی کے زمانے میں بادشاہ کے نام کے ساتھ دیوتا کا نام بھی لیا جانے

لگا۔ بعض اوقات صرف دیوتا ہی کے نام پر اکتفا کی جاتی تھی۔ بعد کو دیوتا اور بادشاہ کے ساتھ اس شہر اور مندر کے نام کا بھی اضافہ کر دیا گیا، جہاں فریقین معاہدہ کرتے تھے۔ بظاہر یہ تبدیلی اس لیے ہوئی کہ بتدریج، بادشاہ کا مذہبی اقتدار کم ہوتا گیا اور اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی، کہ دستاویز کو زیادہ مضبوط اور اہم بنانے کے لیے اس کے نام کے ساتھ دیوتا اور مندر کا نام بھی لینا چاہیے۔

قسم اٹھاتے وقت دایاں ہاتھ اٹھاتے تھے اور یہ صرف مندر کے اندر اٹھائی جاتی تھی، اگر کسی غیر مذہبی عدالت کے سامنے بھی قسم اٹھانے کی ضرورت پیش آجاتی، تو عدالت کو مندر کی حدود کے اندر منتقل کر دیا جاتا تھا، یا مقدمہ ہی مندر کی عدالت کے پاس بھیج دیا جاتا۔

عرائض نویس: ان سب باتوں کا یہ نتیجہ ہوا کہ خاص قانونی زبان وجود میں آگئی اور ہر ایک دستاویز ایک خاص طریقے پر لکھی جانے لگی۔ دیوانی قانون کے بیسیوں مسائل تھے اور ان کی اصطلاحات مختلف تھیں جن کے قلمبند کرنے کا طریقہ مختلف تھا۔ اس لیے ایک ایسا پیشہ ور طبقہ پیدا ہو گیا جو محض یہ دستاویزیں ہی لکھتا تھا۔ ممکن ہے کہ اس کے لیے حکومت کی طرف سے کوئی معیار اور امتحان بھی مقرر ہو اور اس میں پورا اترنے کے بعد ہی اس شخص کو یہ پیشہ اختیار کرنے کی اجازت ملتی ہو۔ انھیں ہمارے ہاں کے "عرائض نویس" کا مورثِ اعلیٰ سمجھیے۔

۲۔ سماج کے تین طبقے

قانون میں بابل کی آبادی کو تین جماعتوں یا طبقوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

(۱) عمیل — یہ آزاد شہری طبقہ تھا۔ جنھیں ہم اشراف کہہ سکتے ہیں۔ (بعض نے اسے اوّل پڑھا ہے)

(۲) مشکینس۔ یہ عوام پر مشتمل تھا۔ متوسط الحال لوگ، ملازم پیشہ، تاجر، صنّاع، کاریگر وغیرہ اسی طبقے سے متعلّق تھے۔

(۳) وَرد۔ یہ غلام تھے۔

۱۔ آزاد شہری: بابلی زبان میں عمیل کے معنی صرف آدمی ہیں۔ اس لیے قانون میں جہاں کہیں یہ لفظ آیا ہے، بالعموم یہ فیصلہ کرنے میں مشکل پیش آتی ہے، کہ آیا یہاں یہ اپنے لغوی معنوں (آدمی) میں ہے یا اس سے اصطلاحی معنیٰ (یعنی خاص طبقے کا فرد) مراد ہیں۔ کیونکہ جب اس کے اصطلاحی معنیٰ مقصود ہونگے یعنی "آزاد شہری"، تو اس صورت میں اگر اس کے خلاف کوئی شخص کسی مجرمانہ فعل کا مرتکب ہو، تو قانوناً مجرم زیادہ سخت سزا کا مستوجب قرار دیا جائیگا اور اگر آزاد شہری خود کسی جرم کا ارتکاب کرے، تو اس کی سزا بھی نسبتاً زیادہ ہوگی۔ پس ہمیں قانون کے مطالعہ میں اس امر پر خاص نگاہ رکھنا پڑیگی، کہ جہاں کہیں "عمیل" کا لفظ آیا ہے، اس سے کون شخص مراد ہے، عام یا خاص۔

مختلف مترجموں نے یہ فرق ملحوظ رکھتے ہوئے، اس کے لیے نئے نئے لفظ وضع کیے ہیں، لیکن ان سے غلط فہمی پیدا ہوجانے کا اندیشہ ہے۔ ہم مختصراً یوں کہہ سکتے ہیں کہ قانون کی رُو سے سلطنتِ بابل کا "پورا آزاد شہری" (عمیل) ہی سرکاری حفاظت اور عدالتی انصاف حاصل کرنے کا حق رکھتا تھا۔ کسی دوسرے باہر کے آدمی یا پردیسی کو یہ حق حاصل نہیں تھا۔ اگر کوئی قضیہ کھڑا ہوجاتا، تو ملک میں نہ اس کے رشتہ دار تھے، نہ قبیلے والے، جو اس کی مدد کرتے۔ اور حکومت تو اسے کسی طرح کے حقوق دینے کو تیّار ہی نہیں تھی۔ اس لیے ضروری تھا، کہ جب کوئی شخص کسی دوسرے ملک میں جائے، تو وہ اپنے آپ کو وہاں کے کسی آزاد شہری کی پناہ میں دے دے، ورنہ اس کا مال خوانِ یغما تھا اور خون حلال۔ جاہلیت کے عربوں میں بھی یہی رسم تھی۔ چوں کہ ان دنوں عرب میں کوئی مرکزی حکومت نہیں تھی اس لیے اگر ایک قبیلے کا شخص کسی دوسرے قبیلے کے خیموں میں جانا چاہتا، تو اس کے لیے لابُدّ تھا، کہ وہ پہلے وہاں کے کسی صاحب

رسوخ اور با اثر شخص کی حمایت حاصل کر لے، ورنہ نقصان کی صورت میں وہ کسی سے معاوضے کا مطالبہ نہیں کر سکتا تھا۔ یوں سمجھیے کہ بابل میں ، یہ صاحبِ رسوخ اور با اثر شخص عمیل کہلاتا تھا۔ دوسرے لفظوں میں یہ طبقۂ اشراف کے لوگ تھے۔ قانونِ حمورابی کے ترجمے میں جہاں کہیں آزاد شہری کا لفظ آیا ہے، اس سے یہی عمیل مراد ہے۔

میرے خیال میں یہ عربی کا لفظ عامل ہے جس کے معنی حکمران یا حاکم ہیں۔ غالباً یہ تقسیم نسلی بنیادوں پر قائم تھی۔ اس طبقے میں اوّل تو سامی یا اموری قوم کے فاتح ہونگے اور ان کے بعد مقامی آبادی کے وہ بڑے لوگ، جنھوں نے سامی امراء کی مدد کی یا کوئی سیاسی اور فوجی خدمت سر انجام دی یا ان سے روٹی بیٹی کا رشتہ قائم کر کے ان ہی میں شمار ہونے کا حق حاصل کر لیا۔ چنانچہ بعض دستاویزوں میں ایسے نام ملتے ہیں جو سامی نہیں، بلکہ مقامی لوگوں کے ہیں اور اس کے باوجود انھیں "عمیل" کہا گیا ہے۔ گمانِ غالب ہے کہ یہ لوگ کچھ ایسے ہی اسباب کے نتیجے میں، یہ نام پانے کے مستحق قرار دیے گئے ہونگے۔ لازماً یہی لوگ حکومت میں نفوذ رکھتے اور سلطنت کے اعلیٰ عہدوں پر بھی قابض ہونگے۔ فوجکشی کے وقت سپاہ کی کمان بھی اسی جماعت کے کسی فرد کے ہاتھوں میں ہوتی ہوگی، اگرچہ فوج میں دوسرے طبقوں کے لوگ بھی ضرور ہوتے ہونگے۔

غرض کہ صورتِ حالات کم و بیش وہی رہی ہوگی، جو ہندوستان میں اسلامی حکومت قائم ہونے کے بعد اور خاص طور پر مغلیہ سلطنت کے ایام میں تھی، جب راجپوت امراء حکومت کے وزیر بھی تھے اور سپہ سالار اور منصبدار بھی۔ انھوں نے حکومتِ وقت سے اس حد تک تعاون کیا اور اس کی ایسی بیش بہا خدمت سر انجام دیں کہ وہ مغلوں کے دست و بازو بن گئے اور ان میں اور غیر ملکی فاتحوں میں کوئی فرق ہی نہیں رہا۔ بابل میں بھی ایسا ہی کچھ پیش آیا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ قانون میں اس اوپر کے طبقے کو من حیث الجماعت عمیل یا عامل کہہ دیا گیا ہے۔

زمانہ گزر جانے کے بعد یہ لفظ محض ایک عزّت کا خطاب یا کلمہ بن کے رہ گیا جیسا کہ انگریزی کے لفظ ماسٹر یا اسکوائر یا جنٹلمین، یا فارسی کا خان اور ترکی کا بک ہیں کہ پہلے

یہ خاص خطاب اور صرف خاص طبقوں سے متعلق آتے تھے لیکن آج ان کا استعمال عام ہے اور ان اصطلاحی معنوں کے علاوہ یہ عزت اور تعظیم کے مقام پر بھی بولے جاتے ہیں۔

حویلی :

عمیل کے سکونتی مکان کو قانون میں "ایقل" کہا گیا ہے، جس کے معنی ہیں۔ "مکانِ عظیم" یہ عربی کے لفظ "قلعہ" یا "حقل" سے ملتا جلتا ہے اور غالباً ان میں سے کسی ایک کی بگڑی ہوئی یا ابتدائی شکل ہے۔ بعض مصنفوں نے اس کا ترجمہ محل (قصر) کیا ہے، لیکن یہ بھی غلط ہے۔ چوں کہ عمیل پورا آزاد شہری تھا اور اسے حکومت کی طرف سے خاص حقوق اور مراعات حاصل تھیں، اس لیے اس کی جائے سکونت کو امتیاز پیدا کرنے کے لئے "ایقل" (مکانِ عظیم) کا نام دیا گیا، ورنہ اس سے یہ مراد نہیں کہ وہ کوئی عظیم الشان یا وسیع پُرشکوہ عمارت ہوتی تھی، بلکہ اس وقت کے تمدن کو مدّنظر رکھتے ہوئے ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں، کہ بالعموم یہ کچی دیواروں اور چٹائی کی لپی ہوئی چھت پر مشتمل ہوتی ہوگی۔ میں نے قانون کے ترجمے میں جہاں کہیں لفظ "حویلی" استعمال کیا ہے، اس سے یہی ایقل مراد ہے یعنی طبقۂ اشراف کے فرد یا کسی آزاد شہری کی جائے سکونت۔

آزاد شہری کے فرائض :

عمیل سماج کی ناک تھا (۱۸، ۳۲، ۱۰۹) وہ ایک طرح سے حکومت کی نظر میں، اپنے حلقہ میں امن و امان قائم رکھنے کے لیے ذمّہ دار تھا اور اس نواح کے لوگ بھی اسے اپنا سربراہ مانتے تھے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ کوئی سرمایہ دار یا متموّل شخص تھا، کیوں کہ ممکن ہے کہ کاروبار میں گھاٹا اٹھانے یا کسی جرم کے لیے بھاری جرمانہ ادا کرنے یا کوئی اور مصیبت درپیش آجانے کے نتیجے میں وہ مفلس اور قلّاش ہوجائے۔ اس کے باوجود، حکمران طبقے کا فرد ہونے کی وجہ سے سماج میں اس کا مقام محفوظ رہیگا۔ اس کے رتبے اور اثر کی وجہ سے نچلے طبقے کے لوگ اس کی عزّت کرتے تھے لیکن اسی وجہ سے یہ بھی امید کی جاتی تھی، کہ وہ اپنے اخلاق اور کردار سے دوسروں کے لیے بہترین نمونہ پیش کریگا اور اگر وہ کسی جرم کا مرتکب ہوتا، تو اس کی سزا بھی نسبتاً زیادہ سخت تھی۔

قانون کی متعدد دفعات سے ثابت ہوتا ہے کہ مجرم ہونے کی صورت میں اس کی سزا "آنکھ کے بدلے آنکھ" کے توراتی حکم پر مبنی تھی، حال آں کہ اس سے نچلے طبقے (مشکین) کا مجرم بالعموم جرمانہ دے کر چھوٹ جاتا تھا۔ اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے، کہ دونوں طبقوں میں حدِ فاصل بہت گہری تھی۔

۲۔ عام شہری :

دوسرا طبقہ "مشکین" کہلاتا تھا۔ یہ وہی لفظ ہے جو عربی میں مسکین (۱) ہے اور یہ نام ہی اس طبقے کی عام حیثیت بتانے کے لیے کافی ہے۔ یہ طبقہ اشراف سے دوسرے درجہ پر تھا۔ غالباً یہ متوسط الحال لوگ تھے جو یا تو مقامی رعایا کے افراد تھے یا وہ سامی باشندے جو باقاعدہ سامی حکومت قائم ہونے سے مدّتوں پہلے بابل میں مقیم اور اس حد تک ان لوگوں میں خلط ملط ہو گئے تھے کہ اپنی امتیازی خصوصیات کھو بیٹھے تھے۔ اور اس لیے حکومت بھی انھیں کوئی خاص حقوق دینے پر تیار نہیں تھی۔

قانون کے ترجمے میں "مشکین" کے لیے عام شہری یا "عامی" کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

عامی کے حقوق :

قانون سے معلوم ہوتا ہے کہ "مشکین" مفلس یا کم حیثیت شخص نہیں تھا۔ اس کے پاس چاندی ہو سکتی ہے (۱۴۰)۔ وہ غلاموں کا مالک ہو سکتا ہے (۱۰، ۱۷۰، ۲۱۹)۔ بعض اوقات اس کے غلام تک اس حیثیت کے ہو سکتے ہیں کہ وہ کسی "آزاد شہری" کی بیٹی سے نکاح کر لیں (۱۷۵، ۱۷۶)۔ لہٰذا ہمارے لیے مشکل ہے کہ ہم صحیح طور پر یہ حکم لگا سکیں کہ "مشکین" کون تھا۔ ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ "مشکین" پیشہ ور یا کاریگر طبقے کا فرد تھا کیوں کہ متعدد دفعات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پوری طرح آزاد تھے (۲۲۹، ۲۰۵، ۲۰۸، ۱۶۰۲)

---

(۱) عربی سے یہ لفظ کتنی دوسری زبانوں میں گیا ہے۔ (عربی) مسکین (عبرانی) Meschino اور Meschinello (اطالوی) Mesquinho (پرتگیزی) (Mesquen)

پھر قانون میں غلاموں کے آزاد ہونے کا تو ذکر ہے، لیکن کسی جگہ اس بات کا ذکر نہیں ملتا کہ "مشکین" کیسے پورا آزاد شہری یعنی "عمیل" بن سکتا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ اس کی حیثیت پیدائش پر منحصر تھی۔ دفعہ (۲۰۸) اور (۲۱۶) اور (۲۲۲) میں "مشکین" کے بیٹے اور دفعہ (۲۱۱) میں اس کی بیٹی کا ذکر ہے۔ اس سے ہم یہ استنباط کرنے پر مجبور ہیں کہ جس طرح ہندستان کے آخری زمانے کی تاریخ میں ورن آشرم کی بنیاد پیدائش پر منحصر ہوگئی تھی، حال آں کہ شروع میں اس کا فیصلہ ہر ایک شخص کے ذاتی پیشے کی بنا پر کیا جاتا تھا، اسی طرح بابل میں "مشکین" بھی اس لیے "مشکین" تھا کیوں کہ اس کے ماں باپ ایسے تھے اور اس کے پیشے یا کام کا اس پر کوئی اثر نہیں پڑتا تھا۔

اگرچہ "مشکین" بھی حکومت کی نظروں میں بالکل آزاد تھا اور اس پر کسی قسم کی پابندی نہیں تھی، تاہم فاتح حکمران قوم میں سے نہ ہونے کے باعث اس کی قانونی حیثیت آزاد شہری سے نیچے (اور غلام سے اوپر تھی) (۱۹۸، ۲۰۱، ۲۰۴)۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ مثلاً اگر کوئی آزاد شہری چوری کرے، تو اسے مالِ مسروقہ کی قیمت کا تیس گنا بطور جرمانہ ادا کرنا پڑتا تھا۔ اس کے مقابلے میں اگر کوئی "مشکین" (عامی) اسی جرم کا مرتکب ہوتا، تو اس سے صرف دس گنا رقم وصول کی جاتی تھی۔ ہاں، اگر اس کے پاس جرمانہ ادا کرنے کو کچھ نہ ہو، تو اسے موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا تھا (۸)۔ عامی کو طلاق میں بھی سہولت تھی (۱۳۹، ۱۴۰)۔ اور وہ علاج کے لیے ڈاکٹر کو فیس بھی کم دیتا تھا (۲۱۵، ۲۱۶، ۲۲۱، ۲۲۲)۔ اسی نسبت سے اگر کوئی اور اس کے خلاف جرم کا ارتکاب کرتا یا اسے زخم پہنچ جاتا، تو اسے ہرجانہ بھی کم ملتا تھا (۲۱۱)۔

اس بات کا ایک اور ثبوت کہ ان دونوں طبقوں کے درمیان قانونی امتیاز کی بنا نسلی امتیاز تھا، اس سے بھی ملتی ہے کہ اگر حکمران جماعت کا کوئی شخص (آزاد شہری) اپنی جماعت ہی کے کسی دوسرے فرد پر حملہ کرتا، تو وہ مجرم کے خلاف "سزا بالمثل" کا مطالبہ کرنے کا مجاز تھا۔ یعنی جس طرح کا نقصان خود اسے پہنچا ہے، وہ عدالت سے کہہ سکتا تھا کہ مجرم کو بھی وہی نقصان بطور سزا پہنچایا جائے (۲۰۰)۔ لیکن اگر مدّعی عام شہری ہوتا،

تو وہ محض جرمانہ ادا کر کے گلو خلاصی کر لے سکتا تھا (۲۰۱)

۳۔ غلام

تیسرا طبقہ "ورد" تھا۔ یہ غلام تھے۔ "ورد" عربی کا لفظ فرد ہے۔ گویا وہ محض "ایک شخص" تھا۔ جیسے ہم کہیں "یک راس گاؤمیش"، یہ اس لیے کیوں کہ اس کے شہری حقوق بہت کم تھے۔

دنیا کی تمام قدیم اقوام میں غلامی کا رواج تھا۔ مختلف زمانوں اور مختلف قوموں میں غلاموں سے جو سلوک کیا گیا ہے، وہ کبھی یکساں نہیں رہا۔ کہیں اس میں نرمی ہوئی اور کہیں سختی برتی گئی۔ لیکن عام طور پر کہا جاسکتا ہے کہ اچھا سلوک مشرقی ملکوں میں اور بُرا مغربی ملکوں میں ہوا۔ اسلام نے اس بارے میں انقلابی اصلاح کی۔ پہلے تو غلامی کو یکسر مٹا دیا۔ پھر جو غلام موجود تھے، انھیں بھی ایسے حقوق عطا کیے جن سے ان کے لیے آزادی اور سماج میں مساویانہ درجہ حاصل کرنے کا موقع پیدا ہوگیا۔ اسلامی قانون کے ماتحت یہ چیز امکان میں تھا کہ غلام صاحبِ مال و دولت ہو جائے اور سماج میں اثر و رسوخ پیدا کرلے۔ ان اصولوں پر عمل کہاں تک ہوا، یہ دوسرا موضوع ہے۔ لیکن اس غلط روش کے باوجود کیا یہ تعجّب کی بات نہیں کہ مسلمانوں کے غلام خود انھیں پر حکومت کرتے رہے۔ ہندستان کا خاندانِ غلاماں (۱۲۰۶ء۔۱۲۹۰ء) اور مصر کے ممالیک (۱۲۵۰ء۔۱۵۱۷ء) مثال کے طور پر پیش کیے جاسکتے ہیں۔ بلکہ یہ امرِ واقع ہے، کہ اسلام کے وسطی زمانے کی تاریخ دراصل ان غلاموں ہی کی سرگرمیوں کی تاریخ ہے، جو حکومتِ وقت کے تمام اداروں پر چھا گئے تھے۔

غلام کے فرائض:

قانونِ حمورابی سے معلوم ہوتا ہے کہ سماج کے دونوں اونچے طبقے غلام رکھتے تھے، اگرچہ یہ قدرتی بات ہے کہ آزاد شہریوں کے قبضے میں ان کی تعداد زیادہ ہوگی۔ غلام کامل طور پر اپنے آقا کی ملکیت اور اس کی جایداد کا حصہ تھا۔ اگر غلام کسی شخص کی غلطی سے زخمی ہوجائے یا اُسے کوئی نقصان پہنچ جائے، تو غلام کا مالک مُجرم سے معاوضہ یا ہرجانہ لینے کا حقدار تھا (۹۹، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۳۱)۔ غلام کی ملکیت بدلتے دیر نہیں لگتی

تھی۔ اُس کا مالک جب چاہتا، اُسے بیچ ڈالتا، یا کسی کو بطور تحفہ دے دیتا، یا قرض میں گروی رکھ دیتا۔ غلام کے لیے ممکن نہیں تھا، کہ وہ اپنے مالک کے حکم کی خلاف ورزی کرے، بلکہ اگر وہ کبھی اس کی خدمت کرنے سے انکار کر دے، تو اس کے کان کاٹ دیے جاتے تھے (۲۸۲) لیکن اس کے مالک کو یہ حق حاصل نہیں تھا، کہ وہ اسے جان سے مار دے۔ ہاں، وہ اسے داغ دے سکتا اور بیڑیاں پہنا سکتا تھا (۲۲۶، ۲۲۷) اس کا آقا اسے اپنے دوسرے مال سامان کی طرح بیچ یا قرض کے عوض میں رہن رکھ سکتا تھا (۱۱۸، ۱۱۹)۔ اور اصولاً غلام کی جمع جتھا اس کے آقا کی ملکیت تھی (۱۷۶)۔ غلام آقا کے مکان ہی میں رہتا ہو، تو اسے مالک کی اجازت کے بغیر کسی قسم کی خرید و فروخت کرنے کی ممانعت تھی (۷) غلام بھاگ جانے کا مجاز نہ تھا۔ اور کسی مفرور غلام کو پناہ دینا جرم تھا (۱۵، ۱۶) مفرور غلام کو گرفتار کرنے کا انعام مقرر تھا (۱۷)

غلاموں کے حقوق:

جو کچھ بیان ہوا ہے، شاید اس سے یہ خیال پیدا ہو، کہ غلاموں کی حالت بہت زبوں تھی۔ یہ غلط فہمی ہو گی۔ جہاں آقا کے غلام پر حقوق تھے، وہیں اس کے ذمّے چند ذمّہ داریاں بھی تھیں۔ اگر غلام بیمار ہو جاتا، تو یہ آقا کا فرض تھا، کہ ڈاکٹر کی فیس ادا کرے اور اس کے علاج معالجے کے اخراجات مہیا کرے (۲۱۷، ۲۲۳) اگر غلام اپنے مالک ہی کی کسی لونڈی سے نکاح کر لے، یا اس کا مالک ایک لونڈی خرید کر اس کے نکاح میں دے دے (جیسا غالباً اکثر ہوتا ہو گا) تو عام طور پر مالک ان کی سکونت کے لیے مکان اور اپنی حیثیت کے مطابق اثاث البیت اور دوسرا سامان بھی دیتا۔ ایسی صورت میں آیندہ کے لیے وہ غلام اپنے اور اپنے بچّوں کے کھانے کپڑے کے لیے خود ذمّہ دار ہوتا تھا۔ بالعموم اس کے بعد مالک اس سے طے کر لیتا کہ اب وہ صرف خاص مقرّرہ اوقات ہی کے لیے روزانہ اس کا کام کاج کریگا، باقی وقت میں غلام آزاد تھا کہ جہاں اس کا جی چاہے، جائے اور جو چاہے، کرے۔ نہ قانون ہی سے معلوم ہوتا ہے اور نہ کسی اور ذریعہ ہی سے یہ واقفیت بہم پہنچتی ہے کہ اگر غلام کسی لونڈی سے خود شادی کر لیتا، تو اس صورت میں اس کی بیوی کی

قانونی حیثیت اس کے آقا کے گھر میں کیا ہوتی تھی۔ کیا وہ بھی اس شخص کی لونڈی اور ملکیت تصوّر کی جاتی تھی، یا اس پر اسے کوئی حق نہیں حاصل ہوتا تھا۔

غلام چاہے، تو کسی شریف آزاد عورت سے نکاح کر سکتا تھا۔ اس صورت میں اگر وہ موت تک غلام ہی رہتا، تو اس کے ترکے میں سے نصف اس کے مالک کو ملتا تھا اور باقی نصف کے وارث اس کے بیوی بچّے ہوتے تھے (۱۷۶)۔ اس کی اولاد البتہ آزاد تھی اور اس کے مالک کی غلام نہیں ہوتی تھی کیوں کہ کسی شہری (مرد یا عورت) کی اولاد پیدائش سے غلام نہیں ہو سکتی تھی (۱۷۵)

جب غلام جوان ہو جاتا، تو اسے آقا کے گھر میں رہنے کی اجازت نہیں ہوتی تھی، لیکن لونڈی کا معاملہ دوسرا تھا۔ وہ ہمیشہ مالک ہی کے مکان میں رہتی تھی اور اکثر اُن میں باہمی زنا شوئی کے تعلقات بھی پیدا ہو جاتے اور وہ اس کے بچّوں کی ماں بن جاتی تھی۔ ایسی صورت میں مالک کا لونڈی کو فروخت کر سکنے کا حق زائل ہو جاتا تھا (۱۱۹)۔ اور اس کی موت کے بعد وہ لونڈی آزاد ہو جاتی تھی (۱۷۱-الف)۔ اگر وہ شخص اس لونڈی سے پیدا شدہ بچّوں کے اپنی اولاد ہونے کا اعلان کر دیتا، تو وہ قانوناً اس کے ترکے میں وارث ہوتے تھے (۱۷۰)۔ لیکن اگر اس نے انھیں اپنی اولاد تسلیم نہ کیا ہو، تو بھی بہر حال یہ بچّے اس کے بعد آزاد رہتے تھے، اس کے وارثوں کا ان پر کوئی حق نہیں ہوتا تھا (۱۷۱-الف)

غلامی کا نشان :

اگرچہ یقین سے نہیں کہا جا سکتا، لیکن دفعہ (۲۲۶) اور (۲۲۷) سے معلوم ہوتا ہے کہ غلام کا کوئی خاص نشان ہوتا جو، جلاب، یعنی حجّام بناتا تھا۔ اب یہ دو صورتوں سے خالی نہیں۔ یا تو غلام کے سر کے بال کسی خاص وضع پر کاٹے جاتے تھے، لیکن یہ کوئی مستقل نشان نہیں ہو سکتا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ غلام کی پیشانی یا جسم کے کسی ظاہری حصّے پر گودنے یا داغنے کا نشان ہو۔ لیکن یہ ایسے نشان ہیں کہ ساری عمر مٹائے مٹ نہیں سکتے اور قانون ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ غلام آزادی بھی حاصل کر سکتا تھا۔ مگر یہ داغ عمر بھر کے لیے رہیگا۔

غلام گھروں میں قید نہیں تھے۔ وہ کام کاج سے منڈی، بازار یا دوسری جگہوں میں کھلے بندوں جا آ سکتے تھے۔ لیکن شہر کی حدود سے باہر جانے کے لیے انھیں اپنے آقا سے اجازت لینا پڑتی تھی۔ غلاموں کی اہمیت جوان کی ضرورت پر مبنی ہے، اس سے ظاہر ہے کہ اگر کوئی غلام اپنے مالک کے گھر سے بھاگ جاتا، تو وہ جس کسی کے ہاتھ آجاتا، اس کا فرض تھا کہ وہ اسے اس کے مالک تک پہنچا دے اور اس کے لیے قانوناً دو شکل چاندی بطور انعام مقرر تھی (۱۷)۔ اگر گرفتار کرنے والا اسے اس کے مالک کے پاس نہ پہنچاتا اور اپنے ہاں روک لیتا یا پناہ دیتا، تو اسے "غلام چور" کی سزا (موت) دی جاتی تھی (۱۵)۔ اگر غلام اتفاق سے اس شخص کے پاس سے بھی کسی طرح بھاگ جائے تو اُسے ثابت کرنا پڑتا تھا کہ اس میں اس کا ہاتھ نہیں اور اس نے غلام کے بھاگنے میں اس کی مدد نہیں کی۔ اگر کوئی مفرور غلام پکڑا جائے اور اپنے مالک کا نام اور پتا نہ بتائے، تو اسے حویلی میں حاضر کرتے اور وہاں پوچھ گچھ ہوتی۔ اگر اب بھی اس کے مالک کا پتا لگانے میں کامیابی نہ ہوتی، تو وہ عام بیگاری غلاموں میں شامل کر دیا جاتا۔ بھاگے ہوئے غلام کے مالک کو یہ حق تھا کہ اس کے واپس آنے پر اُسے بیڑیاں پہنا دے۔

مکاتبت :

اگرچہ قانون سے اس موضوع پر کوئی روشنی نہیں پڑتی، لیکن معاہدوں کی تختیوں سے جو کھدائی پر برآمد ہوئی ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی مکاتبت سے ملتا جلتا طریقہ بابل میں رائج تھا۔ اگر غلام کافی دولت کما لیتا، یا اسے کسی رشتے دار کے ورثے سے کچھ مل جاتا یا وہ کہیں سے قرض ہی لے کر کافی رقم لے آتا، تو وہ اپنی آزادی خرید سکتا تھا۔ اس صورت میں مالک کے لیے یہ سوچنے کا مقام تھا کہ اسے غلام کی موت پر جو کچھ اس کے ترکے میں سے ملیگا، کیا وہ اس رقم سے زیادہ ہے یا کم، جو وہ اس وقت اپنی آزادی کے عوض میں ادا کرنے کو تیار ہے۔ اگر غلام نے کسی لونڈی سے شادی کر لی ہے اور اس کی اولاد بھی ہے تو اسے اپنی اولاد کی آزادی بھی خریدنی پڑتی تھی کیوں کہ غلام کی اولاد بھی غلام ہوتی تھی۔ آزادی حاصل کرنے کے بعد یہ غلام دوسرے

طبقے یعنی "مشکین" کا فرد بن جاتا تھا۔

غلامی سے نجات پانے کا ایک اور طریقہ بھی تھا۔ اشراف میں یہ عام رواج تھا کہ وہ غلاموں کو متبنیٰ بنا لیتے تھے۔ اولاد کا یہ فرض تھا کہ وہ والدین کے بڑھاپے میں ان کی خدمت اور غور پرداخت کریں۔ اگر کسی شخص کے بیٹے بیٹیاں اس پر تیار نہ ہوتے، تو وہ کہہ سکتے تھے کہ ان کے والدین کسی کو متبنیٰ بنالیں۔ اس صورت میں وہ وراثت میں اپنے حصّے سے دست بردار ہوجاتے اور یہی متبنیٰ ترکے کا وارث بن جاتا۔ اگر متبنیٰ کے گھر میں آجانے کے بعد میاں بیوی کی اپنی صُلبی اولاد پیدا ہوجاتی، تو بھی وہ سب سے بڑا لڑکا شمار ہوتا تھا۔

یہ متبنیٰ عام طور پر غلام ہوتا تھا، اگرچہ کسی آزاد شہری کے بیٹے کو متبنیٰ بنا لینے میں بھی کوئی امر مانع نہیں تھا۔ جب کوئی شخص کسی غریب شریف خاندان کا لڑکا تبنیت میں لینا چاہتا تو وہ اس سے کچھ مالی معاوضہ لے کر بچہ اس کے حوالے کر دیتے۔ بہرحال اس لڑکے کے مستقبل کے لیے یہ انتظام بہتر تھا۔

اگر متبنیٰ پہلے غلام تھا تو اس صورت میں ایک رسم ادا کی جاتی تھی، جس کا مقصد اسے غلامی کے داغ سے پاک کرنا ہوتا تھا۔ بعض اوقات مالک خوش ہوکر خود ہی غلام کی "پیشانی دھو ڈالتا" اور اسے غلامی سے آزاد کر دیتا۔

غلامی کی اصلی بنیاد نو لازماً جنگ میں گرفتار شدہ قیدی ہیں۔ قدیم وقتوں میں پڑوسی ملکوں میں اور ایک ہی ملک کے پڑوسی قبیلوں میں آئے دن جنگ کا بازار گرم رہتا تھا۔ آج ایک کا پانسا بھاری ہے، تو کل دوسرے کا۔ قسمت جس کا ساتھ دیتی، وہ دوسرے پر غالب آجاتا۔ اس صورت میں ہزیمت خوردہ گروہ کا مال و دولت اور بیوی بچّے فاتح کے رحم و کرم پر تھے۔ یہ سب مالِ غنیمت، فاتح جتھے کے افراد میں تقسیم کر دیا جاتا۔ یہیں سے غلامی کی بنیاد پڑی اور بابل میں بھی یقیناً پہلے لونڈی غلام اسی طریقے سے داخل ہوئے ہونگے۔ بعد کو باقاعدہ غلاموں کی منڈی قائم ہوگئی۔ جہاں تاجر دوسرے ملکوں سے نوجوان لڑکے لڑکیاں لاکر فروخت کرتے تھے۔ قیمت کا فیصلہ لونڈی اور غلام کی شکل و صورت، صحت، کارگزاری کی صلاحیت اور استعداد اور ایسے ہی دوسرے امور کو مدِّنظر رکھ کر ہوتا ہوگا۔

ممکن ہے، منڈی میں کبھی فروخت کرنے کو ایسا غلام آجائے، جو کسی زمانے میں بابل ہی میں تھا اور بعد کو بھاگ گیا، یا کسی جنگ میں دشمن کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا اور وہاں کسی تاجر نے اسے خرید لیا، یا کوئی اور شخص اسے بھگا لے گیا اور بعد کو اس نے اسے کسی تاجر کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ ممکن ہے کہ وہ شخص غلام نہ رہا ہو بلکہ آزاد باغی ہو اور جنگ میں قیدی پکڑا گیا ہو اور اسے دوسرے ملک میں کسی تاجر نے پایا ہو۔ تو جونہی یہ شخص بابل کی منڈی میں پہنچے، اگر وہ غلام تھا تو اس کے قدیم مالک کا حق تھا کہ تاجر کو صرف اتنی رقم ادا کر کے جو اس نے غلام کے لیے دی تھی، اپنا غلام واپس لے لے۔ اور آزاد بابلی تو اپنے وطن کی سرزمین میں پہنچتے ہی آزاد ہو جائیگا، اگرچہ اس صورت میں بھی اس تاجر کو اتنی رقم ضرور ملیگی، جو اس نے خرچ کی تھی۔ (۲۸۰، ۲۸۱) اگر وہ شخص آزاد شہری تھا، تو اس کی قیمت کی رقم ادا کرنے کا فرض پہلے اس کے خاندان پر عائد ہوتا تھا۔ اگر خاندان مطلوبہ رقم مہیا نہ کر سکتا، تو مقامی مندر ادا کرتا۔ اگر مندر کے پاس بھی اتنا سرمایہ نہ ہوتا، تو حویلی یا پھر حکومت تاجر کے مطالبات پورا کر کے اس شخص کو آزاد کر دیتی (۳۲)۔

قانون سے ایک اور صورت بھی غلام بننے کی معلوم ہوتی ہے۔ اگر کسی پھوہڑ بیوی کا خاوند اس سے تنگ آکر دوسرا نکاح کر لیتا، تو اس کے بعد پہلی بیوی کی حیثیت گھر میں لونڈی کی ہو جاتی تھی (۱۴۱)۔ اگر کوئی متبنیٰ بیٹا اپنی انّا یا انکہ کا اعتراف نہ کرتا، یا ان کا حکم بجالانے سے انکار کرتا، تو اسے بھی غلام کے طور پر بیچا جا سکتا تھا۔ اگر کوئی پجارن بیوی اپنے خاوند کو خادمہ پیش کرتی کہ وہ اس سے اولاد حاصل کرلے، تو اولاد نہ ہونے کی صورت میں وہ خادمہ لونڈی کی طرح فروخت کی جا سکتی تھی، اور اگر اولاد ہو جاتی اور اس کے بعد وہ اپنی مالکن سے برابری کا دعویٰ کرتی، تو وہ دوبارہ کنیز بنائی جا سکتی تھی (۱۴۴)۔

۳ ـــ اہلی زندگی

دختر فروشی: تمام پرانی قوموں کا یہی نظریہ تھا کہ بیٹی اپنے باپ کی جایداد کا

حصّہ ہے اور خاوند نکاح کے لیے بیوی خریدتا ہے اور والد یا (ولی) کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اسے جس قیمت پر چاہے، فروخت کر ڈالے۔ پھر یہ نظریہ یہیں ہی کی حد تک نہیں رہا بعض اقوام میں یہ عام رواج ملتا ہے کہ خاوند بیوی کو خریدنے کے بعد اس کا مجاز ہے، کہ اُسے آگے کسی اور خریدار کے ہاتھ بیچ ڈالے یا رہن رکھ دے یا اپنے وارثوں کے نام منتقل کر دے۔ مثلاً شمالی افریقا کے قبائل میں آج تک نکاح خرید و فروخت کی حدود سے آگے نہیں بڑھا۔ وہاں باپ اپنی بیٹی نکاح میں نہیں دیتا، بلکہ کہتے ہیں کہ "فلاں اپنی بیٹی کھا گیا ہے"، جس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے لڑکی کے عوض میں اپنے ذاتی استعمال کی کوئی چیز یا نقد رقم لے لی ہے۔ اسی طرح جب تورات کی کتاب پیدائش (۱۴۲:۱۵) میں لابن کی دونوں بیٹیاں (لیاہ اور راخل) کہتی ہیں کہ ہمارے باپ نے ہمیں بیچ دیا ہے اور ہماری قیمت ہضم کر گیا ہے، تو ہمیں اس پر تعجب نہیں ہونا چاہیے کیوں کہ یہود میں بھی دختر فروشی کا عام دستور تھا اور ان کے ہاں کنواری لڑکی کی قیمت پچاس مثقال چاندی مقرر تھی۔ ویدوں کے اکثر نکاح کی اساس بھی اسی اصول پر ہے کہ باپ اپنی بیٹی کا اسی طرح مالک ہے جیسے اپنے مکان اور ڈھور ڈنگر کا، اور وہ اسے جب اور جیسے چاہے، کسی کے ہاتھ بیچ ڈالے۔ مہابھارت کا یہ واقعہ مشہور ہے، کہ یدھشٹر نے دریودھن سے جُوا کھیلتے وقت اپنی بیوی دروپدی کو داؤ پر لگا دیا تھا۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ بیوی اس کی ملکیت تھی۔ جب اس کے پاس زر و جواہر نہ رہے، تو اس نے جایداد ہارنا شروع کر دی۔ اور جب کوئی اور چیز نہ رہی، تو سب سے آخر میں بیوی بھی داؤ پر لگا دی، وہ بھی اس کی جایداد ہی کا حصّہ تھی۔ اسلام سے پہلے جاہلیت میں عام رواج تھا کہ جب کسی شخص کو قرض لینے کی ضرورت پڑتی، تو وہ اپنی بیویاں رہن رکھ دیتا اور اس کی وفات پر وہ بھی اس کے وارثوں کے ہاتھ منتقل ہو جاتیں کیوں کہ یہاں بھی عورت متوفی کے ترکے کا جزو متصوّر ہوتی تھی۔ رومنوں کے ہاں بھی نکاح میں باقاعدہ خرید و فروخت کی رسم موجود تھی۔

بابلی رواج: قدیم بابل میں بھی حالت اس سے چنداں مختلف نہیں تھی۔

لڑکے کے نکاح کی ذمہ داری اس کے والدین پر تھی۔ اگر باپ کسی لڑکے کی شادی کرنے سے پہلے فوت ہوجاتا، تو جایداد تقسیم کرنے سے پہلے بڑے بھائیوں یا وارثوں کا فرض تھا کہ وہ اس غیر شادی لڑکے کی شادی کے لیے اتنی رقم الگ کر دیں، جو اسے نکاح کے موقع پر اپنی بیوی کے لیے ادا کرنا ہوگی اور بقیہ جایداد ترکے کے طور پر تقسیم ہوتی تھی۔ (۱۶۶)

دستور یہ تھا، کہ جو شخص نکاح کرنے کا خواہشمند ہوتا، وہ بیوی کی قیمت (جو زرِ عروس کہلاتی تھی) لے کر لڑکی کے والد یا ولی کے پاس جاتا۔ اگرچہ لڑکی کی حیثیت قانون میں بیجان مال اسباب کی تو نہیں، تاہم مختلف دفعات کے پڑھنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے نکاح کے معاملے میں کچھ زیادہ کہنے یا رائے دینے کا حق نہیں رکھتی تھی۔ اس کا باپ یا اس کے بھائی اسے "خاوند کے سپرد کرتے ہیں"، اور جب وہ خود بھی آزادی سے اپنے مستقبل کا فیصلہ کرتی ہے، تو "اس کی پسند کا شخص اسے حبالۂ عقد میں لیتا ہے"، (۱۵۶)۔ بالعموم اس کی طرف سے کسی اعتراض کا گمان نہیں کیا جاتا۔ اسی طرح اگر کوئی بیوی اپنی لونڈی کو خاوند کی نذر کر دے، تو لونڈی کوئی عذر پیش نہیں کر سکتی (۱۴۴-۱۴۶)

نکاح نامہ:

چوں کہ بابلیوں کے ہاں بھی نکاح دوسری خرید و فروخت کی طرح تھا، اس لیے لازم تھا کہ نکاح کی شرائط اور دوسرے متعلقہ امور ایک رسمی معاہدے کی شکل میں قلمبند کر لیے جائیں۔ اس باب میں قانون صراحت سے کہتا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی عورت سے تعلقاتِ زناشوئی قائم کرلے، لیکن باقاعدہ نکاحنامہ نہ لکھا جائے، تو قانون کی نظر میں وہ عورت اس شخص کی بیوی نہیں (۱۲۸)

مثال کے طور پر ایک نکاح نامہ دیکھیے۔

شمس کی پجارن ایلزون بنت اور بتم کی بیٹی بشت کو رمو بن شمحات نے بیوی بنایا ہے۔ وہ اپنا ہدیہ.... بشکل چاندی پہلے ہی لے چکی ہے۔ اس کا دل خوش ہے۔ اگر بشت، رمو سے کہے کہ "تم میرے خاوند نہیں" تو اس کی مشکیں باندھ کر دریا میں پھینک دیا جائے۔ اور اگر رمو بشت

سے کہے کہ "تو میری بیوی نہیں"، تو وہ تول کر دس شکل چاندی زرِ طلاق کی اس کو دے دے۔

"شمس (دیوتا)، مردوخ (دیوتا)، شمس ایلنا (بادشاہ) اور سبارہ شہر کے نام پر انھوں نے قسمیں کھائی ہیں"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حالات تبدیل ہو رہے ہیں۔ اب نکاح کاملاً فروخت نہیں رہا۔ بیوی کی رضامندی اور خوشی بھی ضروری خیال کی جا رہی ہے۔

بابل میں دو سگی بہنوں سے نکاح کی اجازت تھی۔ اس طرح کا ایک نکاح نامہ بھی دستیاب ہوا ہے۔ یہ حمورابی کے والد سِن مُبلت کے عہد میں لکھا گیا تھا:

وردشمس نے سن ابوشمس کی دو بیٹیوں ترام سجل، اور ایلتانی سے نکاح کیا ہے اگر ترام سجل یا ایلتانی، وردشمس سے کہے "تم میرے خاوند نہیں" تو اسے اونچے مینارے سے نیچے گرا دیا جائے۔ اور اگر وردشمس، ترام سجل یا ایلتانی سے کہے "تو میری بیوی نہیں"، تو اسے مکان اور اس کا سامان دینا پڑیگا۔ مزید یہ کہ ایلتانی، اپنی سوت ترام سجل کے پاؤں دھویا کریگی اور مندر میں اس کی کرسی پہنچائیگی۔ ایلتانی، سنگار میں ترام سجل کی مدد کریگی اور کام کاج میں اس کا ہاتھ بٹائیگی۔ وہ اس کی مُہر نہیں استعمال کریگی اور دس قاع غلّہ پیس کر اس کے لیے پکائیگی۔

یہ نکاحنامہ بہت دلچسپ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسری بیوی کا درجہ بڑی سے کمتر تھا۔ اس خیال سے کہ بعد کو دونوں بہنوں میں کسی قسم کا جھگڑا نہ ہو جائے، تمام شرطیں صراحت سے نکاحنامے میں درج کر دی گئی ہیں۔ کہ چھوٹی بہن، بڑی کی خدمت گزار رہیگی، اور اس کے ذاتی اور گھر کے کام کاج میں دریغ نہیں کریگی۔

رسمِ نکاح: شادی کے رسم و رواج اور اس کے متعلّقات کی دھوم دھام قدرتی طور پر دولھا اور دولھن کے گھر والوں کی حیثیت پر منحصر تھی۔ لیکن عام طور پر اس موقع پر

خوب دعوتیں اُڑتی تھیں اور ہر طرح سے جوش و خروش اور خوشی کا اظہار کیا جاتا تھا، اور متعلقین مقروض تک ہو جاتے تھے۔ بیوی کو بھاری جوڑے میں ملبوس کیا جاتا اور اس کے مُنہ پر نقاب ڈال دی جاتی تھی۔ پھر اسے ایک جلوس کی شکل میں اس کے میکے سے سسرال لاتے۔ تحفے تحائف اور جہیز جو اس کو ماں باپ کے گھر سے دیا جاتا تھا، اس کی کھلے تشتوں میں نمایش کی جاتی اور غلام ان چیزوں کو سروں پر اُٹھائے دُولھا کے مکان پر لاتے۔ ہندستان میں اسی طرح بری کی رسم ہے۔ فرق صرف اتنا ہے، کہ بری وہ کھانے پینے کی چیزیں، ملبوسات، زیورات ہیں، جو ساچق کے دن دُولھا کی طرف سے دُلھن کو بھیجے جاتے ہیں اور جنھیں پہن کر وہ سسرال میں آتی ہے۔ اس کے برخلاف بابل میں یہ سب چیزیں دولھن کے میکے والوں کی طرف سے بھیجی جاتی تھیں۔

دولھا اور دولھن، تمام مہمانوں اور رشتے داروں کی موجودگی میں، ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے، گھٹنوں کے بل بیٹھ جاتے، اور دولھا کہتا:

میں ..... کا بیٹا ہوں۔ میں تمھاری گود سونے چاندی سے بھرونگا۔ تم میری بیوی ہو گی اور میں تمھارا شوہر۔ میں اس عورت کو کھجور کے درخت کی طرح باردار بناؤنگا۔

یہ گویا اعلانِ نکاح تھا۔ پھر بخور اور لوبان جلائے جاتے اور نوجوان جوڑا ڈھول تاشوں کے ساتھ حجلۂ عروسی میں داخل کر دیا جاتا۔ جہاں وہ پانچ دن تک بیرونی دنیا سے کاملاً منقطع ہو کر رہتے۔ اس کے بعد دولھا باہر آتا۔ ضیافتیں اڑتیں، اور گانے بجانے اور کھیل تماشے کا دوسرا دور چلتا۔ دولھن ایک خاص طرح کی اوڑھنی اوڑھے اور کمر بند باندھے، عورتوں میں نکلتی۔ اپنے نام کی نئی مُہر دکھاتی۔ یہ گویا نشانی تھی، اس بات کی، کہ وہ آج سے پوری عورت اور اپنے ذاتی حقوق کی مالک ہے۔

قانونِ حمورابی میں نکاح کے سلسلے میں "تین رقوم کا ذکر ملتا ہے"۔

(الف) برخت — زرِ عروس

(ب) شرکت — جہیز

(ج) ندون ـــ ہدیہ نکاح یا مہر

(الف) زرِ عروس : یہ لڑکی کی قیمت تھی، جو دولھا، دولھن کے ولی کو ادا کرتا تھا۔ یہ رقم قسطوں میں بھی ادا کی جا سکتی تھی (۱۵۹ - ۱۶۰)۔ یہ بھی ممکن تھا کہ باپ، بیٹی کا نکاح، قیمت (زرِ عروس) لیے بغیر ہی کر دے۔ وہ خود اتنا امیر ہے، کہ اسے اس کی ضرورت نہیں، یا شاید داماد قریبی رشتے دار یا عزیز دوست ہے۔ اس صورت میں اگر وہ جوڑا حسن و خوبی سے زندگی بسر کرتا، تو کوئی بات نہیں تھی۔ لیکن اگر کسی وقت خاوند، بیوی کو طلاق دینے کا خیال کرتا، تو اب وہ زرِ عروس کی مناسب رقم، اپنی حیثیت اور رواج کے مطابق، ادا کرنے پر مجبور تھا (۱۳۹ - ۱۴۰)۔ اور یہ بھی ہو سکتا تھا، کہ زرِ عروس مقرر ہو جانے کے بعد بھی، خاوند ایک مدت تک ادا نہ کرے (۱۴۸) اس حالت میں یہ گویا اس کے ذمے قرض تھا، جو اسے بہر صورت کسی نہ کسی وقت ادا کرنا پڑتا تھا۔

مثال کے طور پر ایک نکاحنامہ دیکھیے، جو بادشاہ عمروم کے عہد میں لکھا گیا تھا

> لبنی سن کے بیٹے وردسن نے برازم کی بیٹی عِشتارامی کو نکاح میں لیا ہے۔ اس نے زرِ عروس کے عوض میں برازم کو دو تہائی مِن چاندی تول کر ادا کر دی ہے اور ایک غلام بھی دیا ہے۔ اب ہمیشہ کے لیے برازم اور اس کے بیٹوں کا عِشتارامی پر کوئی حق باقی نہیں رہا۔ اگر وردسن کبھی عِشتارامی کو چھوڑ دے، تو وہ اسے ایک مِن چاندی تول کر دیگا۔
>
> اگر عِشتارامی کبھی وردسن کو چھوڑ دے، تو وہ بلند مینار سے گرا کر پاش پاش کر دی جائیگی۔ فریقین نے شمس (دیوتا)، ریا (دیوتا) اور سبارہ (شہر) اور بادشاہ عمروم کے نام کی قسمیں کھائی ہیں۔
>
> (اس کے بعد گیارہ مردوں اور پانچ عورتوں کی گواہیاں ثبت ہیں)

وردسن نے دو تہائی یعنی (۰ بہم) شکل چاندی دی اور اس کے علاوہ ایک غلام

بھی دیا۔ غلام کی اوسط قیمت دس شکل چاندی تھی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس نے پچاس شکل چاندی عشتا رامی کے باپ کو ادا کی اور اس قیمت پر برزام اور اس کی اولاد ترکے میں اپنے تمام حقوق سے دست بردار ہو گئے۔ ظاہر ہے کہ یہاں لڑکی، پچاس شکل چاندی میں بیچی گئی ہے۔ اس معاملے کے قانونی نتائج حسب ذیل ہونگے:

(۱) لڑکی آج سے خریدار کی بیوی ہے۔ خواہ خلوتِ صحیحہ فوراً نہ ہو، اور وہ اپنے باپ ہی کے گھر میں مقیم رہے (۱۳۰)

(۲) اگر زرِ عروس کی کاملاً یا جزواً ادائی کے بعد دولھا اپنا ارادہ تبدیل کرلے کیوں کہ اس نے "کسی اور عورت کو دیکھا ہے"، (۱۵۹)، تو لڑکی کے ولی کا حق ہے کہ وہ یہ رقم واپس نہ کرے۔ اور اس کے برخلاف، اگر اس کے بعد ولی لڑکی کو اس شخص کے حوالے کرنے سے انکار کر دے، تو اسے ادا شدہ رقم سے دگنی لوٹانا پڑیگی (۱۶۰)

بلکہ قانون اس سے بھی آگے جاتا ہے۔ فرض کیا، تمام معاملہ طے ہو گیا اور زرِ عروس ادا کر دیا گیا ہے۔ اب اگر کوئی شخص دولھا پر کسی قسم کی تہمت لگا دے، جس کی وجہ سے ولی اپنی لڑکی اس کے نکاح میں دینے سے انکار کر دے، تو اس صورت میں اسے وصول کردہ رقم سے دگنی، دولھا کو دینا پڑیگی اور وہ لڑکی اس تہمت لگانے والے شخص سے بھی نکاح نہیں کر سکیگی۔ (۱۶۱)

اس آخری شق کی علتِ غائی یہ ہے کہ ممکن ہے، کوئی اور شخص بھی اس لڑکی سے نکاح کرنے کا خواہشمند ہو اور کوئی دوسرا طریقہ اپنی خواہش کے پورا کرنے کا نہ پاکر وہ قبول شدہ دولھا پر کوئی تہمت لگا دے، تاکہ نسبت ٹوٹ جائے اور وہ بعد کو خود اس لڑکی سے نکاح کر سکے۔ لیکن اگر اسے معلوم ہوگا کہ میں اب بہرحال اس لڑکی سے نکاح نہیں کر سکونگا تو اس کے لیے دولھا پر جھوٹا الزام لگانے کا عذر باقی نہیں رہیگا۔

(۳) اگر بیوی فوت ہو جائے، تو عام حالت میں، اس کے جہیز کے وارث، اس کے بچّے ہونگے (۱۶۲، ۱۶۷)۔ اگر وہ لاولد فوت ہو جائے، تو اس کا وارث اس کا

باپ، یا اس کی عدم موجودگی میں اس کے بھائی ہونگے (۱۶۳) لیکن اس صورت میں ایک استثناء ہے، یعنی اگر اس کے باپ نے "زرِ عروس"، کی رقم جو داماد نے شادی کے وقت اپنے خسر (یعنی بیوی کے والد) کو دی تھی کسی شکل میں واپس کر دی ہے، تو بہتر، ورنہ جہیز واپس کرنے سے پہلے، خاوند کا حق ہے کہ وہ "زرِ عروس"، اس میں سے وضع کر لے اور باقی متوفیہ بیوی کے میکے والوں کے حوالے کر دے (۱۶۴)۔

(ب) جہیز: دوسری چیز جہیز ہے، جو نکاح کے موقع پر لڑکی کے والدین کی طرف سے نقد یا سامان کی شکل میں دیا جاتا تھا۔ ایک بات یاد رہے، کہ یہ جہیز خاوند کو نہیں دیا جاتا تھا، بلکہ یہ لڑکی کی ذاتی ملکیت تھی۔ اگر لڑکی بے اولاد فوت ہو جائے۔ تو یہ جہیز اس کے والد یا بھائیوں کو واپس مل جائیگا (۱۶۳)۔ اگر موت کے وقت اس کی اولاد موجود ہے، تو وہی اس مال کے وارث ہونگے (۱۶۲، ۱۶۷)۔ اگر خاوند، بیوی سے اچھا سلوک نہ کرے، یا اسے منہ نہ لگائے، تو وہ اپنا جہیز لے کر اپنے باپ کے گھر واپس چلی جا سکتی ہے (۱۴۲) اگر خاوند، بیوی کے کسی قصور کے بغیر اسے طلاق دے دے تو اس کا فرض ہے، کہ اس کا جہیز۔ اس کے حوالے کرے اور اس صورت میں وہ اپنا ادا کردہ "زرِ عروس"، بھی اس سے مجرا نہیں لے سکتا (۱۳۷، ۱۳۸)۔ اگر بیوی بیمار ہو جاتی اور اپنے باپ کے گھر جانا چاہتی، تو وہ اپنا جہیز اپنے ساتھ لے جانے کی مجاز تھی (۱۴۹)۔

خاوند کی وفات پر بھی وہ اپنا جہیز اپنے قبضے میں لے سکتی تھی (۱۷۱ ب - ۱۷۲ ب)۔

ان تمام مقامات سے ظاہر ہے کہ جہیز بیوی کی ذاتی ملکیت تھی اور خاوند اس کا عارضی منتظم ہو تو ہو، وہ اس پر مستقل قبضہ نہیں جما سکتا تھا۔

جہیز کی ادائی، والدین کی مرضی پر موقوف نہیں تھی، بلکہ یہ لڑکی کا حق تھا۔ کہ وہ نکاح کے وقت پدری جایداد میں سے اپنا جہیز لے۔ یہاں تک کہ اگر باپ کی وفات پر کوئی لڑکی بن بیاہی موجود ہے، تو اس کے جہیز کی رقم الگ کرنے کے بعد ہی ترکہ وارثوں میں تقسیم ہوگا۔ (۱۸۴)۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جہیز گویا لڑکی کا اپنے والدین کے اثاثے

میں سے حصّہ ہے۔ اگر ان کی زندگی میں اس کا نکاح ہو جائے، تو وہ اسے اپنی رضامندی سے دے دینگے، ورنہ ان کی موت کے بعد ورثا دینے پر مجبور ہونگے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر لڑکی لاولد فوت ہو جائے، تو یہ جہیز اس کے پدری خاندان میں واپس آجاتا ہے، کیوں کہ اس پر اس کی اولاد کا حق تو ہو سکتا تھا، لیکن اور کوئی اسے لینے کا حقدار نہیں۔

بظاہر یہ دونوں باتیں متضاد معلوم ہوتی ہیں کہ ایک طرف تو خاوند قیمت ادا کر کے بیوی خرید رہا ہے، اور دوسری طرف باپ بیٹی کو اپنی جایداد میں سے حصّہ دے رہا ہے۔ اس میں تو کسی قسم کا شبہہ نہیں کہ شروع میں دولھا ضرور یہ قیمت ادا کرتا ہوگا۔ جوں جوں زمانہ گذرتا گیا، لوگ بیٹی فروخت کرنے کی رسم کو حقارت کی نظر سے دیکھنے لگے۔ اس سے اگرچہ قانون میں تو یہ بات قدیم دستور ہونے کی وجہ سے داخل کر دی گئی ہے، لیکن شاید عملی صورت میں، کم از کم اونچے طبقوں میں، اسے ترک کر دیا گیا ہو۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ بعد کو غریب اور مفلس لوگ، یہی "زرِ عروس"، جہیز کی شکل میں لڑکی کے حوالے کر دیتے ہوں۔ لیکن بابل کے آخری زمانے کے جو نکاحنامے ملے ہیں، ان میں جہیز کے علاوہ "زرِ عروس"، کا کوئی ذکر نہیں پایا جاتا۔

ہیروڈوٹس کی روایت :

اس جہیز کی رسم سے متعلق پانچویں صدی قبل مسیح کے مشہور یونانی مؤرخ ہیروڈوٹس نے اپنی تاریخ (۱: ۱۹۶-۱۹۹) میں ایک نہایت عجیب وغریب بات لکھی ہے۔ اس کے زمانے میں، خود اس کے وطن یونان میں کسی ایسی دوشیزہ کے لیے جس کے پاس جہیز کے لیے کوئی معقول رقم نہیں ہوتی تھی، نکاح کر لینا بہت مشکل تھا۔ اس لیے یہ بات بہت قابلِ تعریف سمجھی جاتی تھی، کہ کوئی نیک دل، صاحبِ استطاعت شخص، غریب اور عسیر الحال والدین کی کنواری لڑکیوں کے لیے جہیز مہیّا کر دے، تاکہ وہ نکاح کر سکیں۔ یہاں ہمارے ملک میں بھی ایسا رواج رہا ہے، بلکہ اب بھی ہے۔ ہیروڈوٹس نے اپنی کتاب میں بابل کی ایک ایسی رسم کا ذکر کیا ہے کہ "سال میں ایک خاص دن تمام بالغ لڑکیاں جمع کی جاتی ہیں۔ ان میں سے جو خوبصورت ہوتی ہیں،

انھیں فروخت کر دیا جاتا ہے اور اس طرح جو رقم مہیا ہوتی ہے، اس سے کم رُو لڑکیوں کو جہیز دے دیتے ہیں، تاکہ وہ بھی نکاح کرنے کے قابل ہو جائیں۔ خریدار سے اس بات کی ضمانت لے لی جاتی ہے، کہ وہ اس لڑکی سے لازماً نکاح کریگا۔ جب کہیں اسے اس لڑکی کو لے جانے کی اجازت دی جاتی ہے۔ اگر وہ باہم رضامند نہ ہوسکیں، تو خاوند کو قانون کی رُو سے یہ رقم واپس کرنا پڑتی ہے "۔

ظاہر ہے کہ ہیروڈوٹس یہاں بابلیوں کے زرِ عروس اور جہیز کی رسموں کا ذکر کر رہا ہے۔ لیکن اس نے دونوں کو ایسی بُری طرح گڈمڈ کر دیا ہے، کہ اس کی حیثیت افسانے سے زیادہ نہیں رہی۔ یہ یقیناً غلط ہے، کہ تمام نکاح سال میں ایک ہی دن کر دیے جاتے تھے کیوں کہ ہمارے پاس سینکڑوں بلکہ ہزاروں نکاحنامے ہیں، جن پر سال بھر کے مختلف اوقات کی تاریخیں درج ہیں۔ پھر یہ بھی غلط ہے کہ "زرِ عروس" سے دوسری غریب یا کم رُو لڑکیوں کو جہیز دیا جاتا تھا کیوں کہ قانون کی دفعہ (۱۶۳) اور (۱۶۴) سے صاف ظاہر ہے کہ یہی "زرِ عروس" دلھن کو جہیز کی شکل میں دے دیا جاتا تھا۔ اگر اس رقم سے غریب لڑکیوں کی شادی کر دی جاتی تھی اور یہ ان کے شوہروں کو ان بیچاریوں سے شادی پر آمادہ کرنے کے لیے (بطور ترغیب) ادا کر دی جاتی تھی، تو یہ جہیز میں واپس کیسے آسکتی تھی۔ یوں معلوم ہوتا ہے، کہ ہیروڈوٹس نے کہیں سے کوئی سُنی سنائی بات اپنی کتاب میں لکھ دی ہے۔

ہیروڈوٹس ہی نے ایک اور عجیب رسم کا بھی ذکر کیا ہے۔ لکھتا ہے، کہ ہر ایک بابلی عورت کو اپنی زندگی میں کم از کم ایک مرتبہ ضرور مندر میں ایک خاص مذہبی رسم کے سلسلے میں رہنا پڑتا ہے۔ وہ عشتار دیوی کے مندر میں جاتی اور وہاں اس وقت تک ٹھہرتی کہ کوئی مرد ۲ کے اس کی جھولی میں کچھ ڈال دے "۔ خوبصورت اور دلکش سڈول جسم کی عورتیں جلد چھٹکارا حاصل کر لیتی تھیں۔ لیکن بدصورت عورت کو یہ قانونی شرط پوری کرنے کے لیے بڑی مشکل پیش آتی تھی۔ بعض بیچاریوں کو تو تین تین چار چار برس تک انتظار کرنا پڑتا تھا۔ ...... اور جب ایک مرتبہ وہ دیوی کے لیے یہ فرض پورا کر لیتی، تو اپنے

گھر لوٹ آتی۔ پھر اس کے بعد تم خواہ کتنی بڑی سے بڑی رقم کیوں نہ پیش کرو، تم اُسے حاصل نہیں کر سکتے،،

جہاں تک ہمیں اس زمانے کا حال معلوم ہوا ہے اور جو دستاویزیں ہمیں دستیاب ہوئی ہیں، ان میں سے کسی سے بھی ہیروڈوٹس کے اس بیان کردہ رواج کی تصدیق نہیں ہوتی۔ اس کا مطلب تو یہ ہوگا کہ بابل میں کوئی عورت شادی سے پہلے دوشیزہ اور باعصمت رہ ہی نہیں سکتی تھی، حالانکہ ہمارے پاس سیکڑوں ایسے نکاحنامے ہیں، جن میں خاص طور پر لڑکی کی دوشیزگی کا ذکر کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر یہ نکاح نامہ لیجیے جو حمورابی سے ایک صدی پہلے بادشاہ سمولا ایل کے زمانے میں لکھا گیا تھا:

انا ادنی، سلیم تم کی بیٹی ہے۔ سلیم تم نے اسے جہیز دے کر بلشوت بن غلوم کے نکاح میں دے دیا ہے۔ انا ادنی دوشیزہ ہے، کسی نے اس کے خلاف کچھ نہیں کہا ہے۔ انھوں نے شمس دیوتا، مردوخ دیوتا اور سمولا ایل (بادشاہ) کے نام کی قسمیں کھائی ہیں کہ جو بھی اس تختی کو تبدیل کریگا، مستوجب سزا ہوگا۔ (سولہ گواہوں کے دستخط)

اب ایک دوسرا نکاحنامہ لیجیے، جو ہیروڈوٹس ہی کے زمانے میں بابل کے آخری بادشاہ بنونیدوس کے عہد میں لکھا گیا تھا:

بنونیدناہی نے شموکن سے کہا: تم اپنی دوشیزہ بیٹی انا اسجیل بنت کو میرے بیٹے اُبلتس جل کے نکاح میں دے دو۔ شموکن نے اس کی بات قبول کر لی اور اپنی بیٹی ابلتس جل کو دے دی۔ شموکن اس کے جہیز میں ایک من چاندی، تین غلام اور گھریلو سامان دیگا۔
شموکن نے دو تہائی من چاندی کی جگہ من کشیرت لونڈی دی ہے۔
پس جب شموکن مزید ایک تہائی من چاندی دیگا، تو جہیز کی ایک من چاندی پوری ہو جائیگی۔ سب نے اس تختی پر دستخط کیے ہیں۔
(بادشاہ بنونیدوس کا سنہ جلوس ۶)

ان دونوں نکاحناموں کے درمیان کم و بیش پندرہ سو سال کا فاصلہ ہے اور دونوں جگہ خاص طور پر لکھا ہے کہ لڑکی دوشیزہ ہے۔ اور یہ بھی اس لیے کہ دوسری صورت میں باپ "زرِعروس" کا حقدار نہیں ہو سکتا تھا۔ واللہ اعلم، ہیروڈوٹس نے کس بنا پر یہ بات لکھی ہے۔

(ج) مہر: دفعہ (۱۷۱) سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہدیہ خاوند اپنی مرضی سے بیوی کو دیتا تھا۔ اگر خاوند اپنی زندگی میں اس طرح کا کوئی ہدیہ بیوی کو دے دیتا، تو اس کی موت پر بیوہ، ترکے کے وارثوں میں شمار نہیں ہوتی تھی۔ لیکن اگر خاوند اسے کوئی ایسی رقم وغیرہ دینے سے پہلے مر جاتا، تو اس کی بیوہ بھی وارث ہوتی تھی اور اس کا حصّہ لڑکے کے حصّے کے برابر ہوتا تھا۔ (۱۷۲-الف) اگر بیوہ دوبارہ نکاح کر لیتی، تو یہ ہدیہ یا مہر وہ ساتھ نہیں لے جا سکتی تھی۔ بلکہ یہ اس کے پہلے خاوند کے خاندان کے پاس واپس آجاتا تھا۔ (۱۷۲-ب)

نکاحِ بیوگاں: مطلقہ بیوی تو جب چاہے دوسرا نکاح کر لے سکتی تھی، بیوہ کو بھی نکاحِ ثانی کی عام اجازت تھی (۱۷۲-ب)۔ چونکہ اس کا باپ یا ولی اس کے پہلے نکاح کے وقت اس کی قیمت (زرِعروس) وصول کر چکے ہیں۔ اس لیے اس نکاحِ ثانی پر، عورت کوئی رقم اپنے خاوند سے وصول کر لے تو اسے وہ اپنے پاس رکھنے کی مجاز تھی۔ یہ اس کی ذاتی ملک تھی اور اس پر اس کے ولی کا کوئی حق نہیں۔ البتہ نکاحِ ثانی کے موقع پر، بیوی اپنے متوفی خاوند کے گھر سے کوئی چیز نہیں لے جا سکتی۔ اگر اس کے خاوند نے اپنی حینِ حیات اسے کوئی منقولہ یا غیر منقولہ جایداد بطور تحفہ دی تھی، تو اسے اس سے دست بردار ہونا پڑیگا۔ لیکن شادی پر جو جہیز وہ اپنے والدین کے گھر سے ساتھ لائی تھی، وہ اسے ساتھ لے جا سکتی تھی۔ (۱۷۲-ت)

اگر اس کے پہلے خاوند سے اس کی نابالغ اولاد ہو، تو اس کی ذمہ داری اور بھی زیادہ ہے۔ اس صورت میں اسے عدالتِ مجاز سے نکاحِ ثانی کی منظوری لینا پڑیگی۔ یہ پابندی اس

لیے ضروری سمجھی گئی کہ کہیں وہ عورت یا اس کا دوسرا خاوند ان نابالغ بچوں کی جایداد خورد برد نہ کر دیں۔ قانون میں اس سے متعلق مفصل ہدایات موجود ہیں۔ (۱۷۷)

کثرتِ ازدواج: اگرچہ اصولاً ایک زوجیت ہی کا رواج معلوم ہوتا ہے، لیکن بعض خاص حالتوں میں ایک سے زیادہ بیویوں سے نکاح کرنے کی اجازت تھی، گو اس صورت میں بھی پہلی بیوی کے حقوق فائق تھے اور خاوند کا فرض تھا کہ وہ اس کے نان نفقے کا خاطر خواہ انتظام کر دے۔ اگر پہلی بیوی دائم المرض ہو (۱۴۸)، یا بانجھ ہو (۱۴۸)، یا اس میں کوئی اور عیب ہو (۱۴۱)، تو مرد کسی دوسری عورت سے نکاح کر سکتا تھا۔ عام حالتوں میں یہ دوسری بیوی محض داشتہ ہوتی تھی گویا یہ طے ہو جاتا تھا کہ وہ پہلی بیوی کی برابری کا دعویٰ نہیں کرے گی۔

کثرتِ ازدواج کی ایک اور صورت بھی تھی۔ جب مرد کسی مندر کی پجارن سے نکاح کر لیتا اور اس کے اولاد پیدا نہ ہوتی، تو وہ عورت اولاد حاصل کرنے کے لیے اپنے خاوند کو کوئی لونڈی پیش کر دیتی، جس سے وہ زناشوئی کے تعلقات قائم کر لیتا۔ اگر اس لونڈی سے اولاد ہو جاتی، تو اب وہ شخص داشتہ نہیں رکھ سکتا تھا (۱۴۴)۔ اگر اس پجارن بیوی سے اولاد نہ ہو، اور وہ اسے لونڈی بھی پیش نہ کرے، تو اس شخص کا حق تھا کہ وہ داشتہ رکھ لے۔ پجارن بیوی اس پر اعتراض نہیں کر سکتی تھی۔ البتہ قانون کی نظر میں اس داشتہ کا درجہ پجارن سے فروتر تھا (۱۴۵)۔

بعد کو یہودیوں کے ہاں بھی اسی طرح کا رواج رہا ہے کہ جب کسی شخص کے اپنی بیوی سے اولاد نہیں ہوتی تھی، تو وہ بیوی اپنی لونڈی سے اولاد پیدا کرا کے اسے اپنی اولاد شمار کرتی۔ جیسے حضرت یعقوبؑ کی دونوں بیویوں — لیاہ اور راخل نے کیا کہ اپنی لونڈیاں — بلہاہ اور زلفہ — ان کو پیش کر دیں اور ان سے اولاد حاصل کی (پیدائش باب ۳۰)

طلاق: خاوند کو طلاق دینے کی کھلی چھٹی تھی۔ وہ جب چاہے عورت سے

کہ دے کہ آج سے تو میری بیوی نہیں، ایک مقررہ رقم اس کے حوالے کرے اور اسے گھر سے نکال دے (۱۳۷-۱۴۱)۔ یہ پڑھ کر توراۃ کا حکم یاد آجاتا ہے، کہ اگر خاوند، اپنی بیوی میں کوئی بیہودہ بات پائے، تو طلاق نامہ لکھ کر اس کے ہاتھ پر رکھے اور اسے گھر سے نکال دے (کتاب استثنا، ۲۴:۱)۔

خلع:

بعض حالات میں بیوی کو بھی خاوند سے علیحدہ ہوجانے کا حق حاصل تھا۔ مثلاً اگر خاوند آوارہ اور بدچلن ہو اور بیوی اس سے نباہ نہ کرسکے، تو وہ عدالت یا پنچایت میں علیحدگی کا مطالبہ پیش کرسکتی تھی۔ اگر یہ ثابت ہوجاتا کہ عورت واقعی بےقصور ہے اور خاوند ہی عیاش ہے اور بیوی کی طرف التفات نہیں کرتا، تو اسے اجازت مل جاتی کہ چاہے تو خاوند کو چھوڑ کر اپنے میکے چلی جائے۔ اس صورت میں وہ اپنا جہیز بھی ساتھ لے جاسکتی تھی (۱۴۲)۔

لیکن اگر معلوم ہوتا کہ وہ عورت خود بدچلن ہے اور اس لیے اپنے خاوند کے ساتھ رہنا نہیں چاہتی، تو اس کی سزا موت تھی۔ اسے دریا میں ڈبو دینے کا حکم ہے (۱۴۳)

سزائے زنا:

جب لڑکی کی منگنی ہوجاتی تو اس کے بعد وہ قانوناً اپنے منگیتر کی بیوی تصور کی جاتی تھی، خواہ اس کا باقاعدہ نکاح اور رخصتی نہ بھی ہوئی ہو اور وہ ابھی اپنے میکے ہی میں رہتی ہو۔ دفعہ (۱۳۰) میں ایسی ہی لڑکی کی طرف اشارہ ہے "جو مرد کے قریب نہ گئی ہو"۔ قانون شادی شدہ عورت کی عصمت وعفت پر خاص طور پر زور دیتا ہے۔ زنا کی سزا ڈبونا ہے (۱۲۹-۱۳۳-۱۴۳) لیکن اگر اس کا خاوند اس کے نان نفقے کا انتظام کیے بغیر مفرور ہوجائے، یا جنگ میں قیدی بنا لیا جائے تو بیوی کو دوسرے شخص کے پاس رہنے کی اجازت تھی (۱۳۴) ان ایام میں جبکہ آئے دن لڑائی رہتی تھی، اس طرح کے واقعات عام طور پر ہوتے رہتے ہونگے، اس لیے قانون نے ان کا علاج تجویز کردیا۔ اس صورت میں بھی اگر قیدی خاوند واپس آجائے، تو بیوی کو اس

کے پاس لوٹ آنا پڑتا تھا (۱۳۵)۔ ہاں، اگر وہ مفرور تھا اور واپس آیا ہے تو وہ چاہے، تو اس دوسرے شخص کے پاس ہی رہے جس نے اس کے بھگوڑے خاوند کی غیر حاضری میں اس کی نگہداشت کی تھی (۱۳۶)۔

قانون یہاں تک عِفّت کو ضروری خیال کرتا ہے کہ وہ عورت کے خلاف کسی مشکوک قسم کی گپ بھی برداشت نہیں کرتا کیوں کہ اس سے اس کے خاوند کی عزّت پر داغ لگنے کا اندیشہ ہے۔ اس صورت میں ضروری تھا کہ وہ عورت دریا میں کود کر، وہاں سے زندہ سلامت نکل آئے اور اس طرح اپنی بیگناہی ثابت کرے (۱۳۲)۔ اگر اس کا خاوند غیرت کے مارے کسی شک کا اظہار کرے، تو وہ قسم اُٹھا سکتی تھی (۱۳۱)۔ لیکن اگر کوئی اور شخص اس پر جھوٹی تہمت لگاتا، تو اُسے قاضی کے سامنے اپنا دعویٰ ثابت کرنا پڑتا تھا۔ اگر وہ ثبوت مہیّا نہ کر سکتا تو اس کی پیشانی داغ دی جاتی تھی اور وہ غلام بنا لیا جاتا تھا (۱۲۷)۔

یہیں سے محرمات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ اگر کوئی شخص اپنی بیٹی سے زنا کرتا پکڑا جاتا تو اسے شہر بدر کر دیتے تھے۔ گویا وہ اس شہر یا ملک کا باشندہ نہیں رہتا تھا (۱۵۴)۔ بہو کے معاملے میں قانون نے امتیاز کیا ہے۔ اگر اس شخص کا بیٹا اس سے خلوتِ صحیحہ کر چکا ہے، تو سُسر کی سزا موت ہے، اُسے مشکیں باندھ کر دریا میں پھینک دیا جائے (۱۵۵)۔ لیکن اگر ابھی میاں بیوی میں خلوت نہیں ہوئی، تو زانی سُسر محض جرمانہ ادا کر کے چھوٹ جائیگا۔ لڑکی اپنا جہیز لے لے، اور جس دوسرے شخص سے چاہے نکاح کر لے (۱۵۶)۔ گویا شادی شدہ عورت کی صورت میں سزا دوشیزہ کی بہ نسبت زیادہ سخت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دوشیزہ بیٹی سے زنا کی سزا بھی نرم ہے۔ ہاں، اگر بیٹا اپنی سگی ماں سے زنا کرے، تو دونوں کو زندہ جلا دینے کی سزا ملیگی (۱۵۷)۔ اس کے مقابلے میں سوتیلی ماں کی صورت میں اسے محض خاندان (برادری) سے خارج کر دینے کا حکم ہے (۱۵۸)۔

۴۔ مذہبی عورتیں

قانون میں عورتوں کے پانچ ایسے طبقوں کا ذکر آیا ہے، جو غالباً مذہبی زندگی بسر کرتی تھیں، لیکن بدقسمتی سے ابھی تک ان سے متعلق مفصّل معلومات مہیا نہیں ہوسکیں مختلف مقامات پر ایسی مندرجۂ ذیل عورتوں کا نام ملتا ہے:۔

(۱) رمن ان (یا انت) — مقدّس راہبہ

(۲) اِشمپت — پُجارن

(۳) ذِکرو — دیو داسی

(۴) قادِشُت — قِدیسہ

(۵) زرماشِتُ — مندر کی کنواری

قانون میں پہلے تین گروہوں کا ذکر متعدّد جگہ پر آیا ہے لیکن آخری دولوں یعنی قدیسہ اور مندر کی کنواری کا نام صرف دفعہ (۱۸۱) میں یوں دیا ہے:۔

اگر کوئی شخص اپنی بیٹی کو خدا کے نام پر پُجارن، قدیسہ یا مندر کی کنواری بنانے کی منّت مانے۔

اس سے بظاہر یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ دولوں کسی خاص طبقے کی عوزتیں ہیں۔ قادِشُت اصل میں عربی کا لفظ قدیسہ ہے اور اس کے لغوی معنیٰ ہیں ”مقدس عورت“، لیکن زرماشِتُ کے معنیٰ ہیں ”وہ عورت جو اولاد پیدا نہیں کرسکتی“، اسی لیے میں نے اس کا ترجمہ ”مندر کی کنواری“ کیا ہے۔

یہ تو تحقیق ہے مغربی علما کی۔ لیکن میرا اپنا خیال ہے کہ اس جگہ کسی نئے طبقے کا ذکر نہیں، بلکہ یہاں انہی دونوں کی طرف اشارہ ہے جو اوپر (۱) اور (۳) میں مذکور ہیں یعنی ”مندر کی کنواری“ ہی ”دیو داسی“ ہے اور ”قدیسہ“ ہی ”راہبہ“ ہے۔ اسی لیے میں نے ”ذکرو“ کے لیے ”دیو داسی“ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ چونکہ یہ لفظ ہمارے

یہاں بالکل انہی معنوں میں مستعمل ہے۔ بابلی مندر کی کنواری اور ہندستانی دیوداسی، دونوں عمر بھر شادی نہیں کرتی تھیں۔ یہی صورت قدیسہ اور راہبہ کی ہے۔ پس دفعہ (۱۸۱) میں جہاں ان کا ذکر ہے، وہاں کسی نئے خاص طبقے کی طرف اشارہ کرنا مقصود نہیں، بلکہ میرا گمان ہے، کہ اس سے مراد صرف یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی بیٹی کو راہبہ یا دیوداسی کے طور پر مندر کی نذر کرنے کا عہد کرے تو ـــ لیکن راہبہ یا دیوداسی کی جگہ دو نئے لفظ استعمال کر دیے گئے ہیں۔

دیوداسی:

علمائے بابلیات کا اس مسئلے میں بہت اختلاف ہے کہ راہبہ اور پجارن اور دیوداسی۔ ان تینوں قسم کی عورتوں کے فرائض کیا تھے، اور ان کی عام حیثیت کیا تھی۔ ذِکرُ (دیوداسی) سے متعلق خاص طور پر بہت بحث ہوئی ہے اور مختلف آراء میں جو بُعد المشرقین ہے، اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے، کہ جرمن علماء تقریباً سب کے سب متفق ہیں کہ یہ عصمت باختہ عورتیں تھیں اور ان کی حیثیت عام کسبیوں سے بہتر نہیں تھی۔ اس کے برخلاف انگریز اور امریکی مصنف ان کے صاحبِ عفّت ہونے کے قائل ہیں اور اس کے لیے وہ یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ قانون میں جہاں کہیں ان کا ذکر آیا ہے، ان کے لیے عزّت اور احترام کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ آج چار پانچ ہزار سال بعد جب کہ ہمارے ذرائع معلومات اتنے محدود ہیں، ہمارے لیے کسی حتمی نتیجے پر پہنچنا محال ہے۔ لیکن میری ذاتی رائے بھی بہت حد تک وہی ہے، جو جرمن علماء کی ہے۔ شروع میں یقیناً یہ عورتیں پاکدامن رہی ہونگی اور اسی لیے قانون میں ان کا ذکر عزّت سے آنا ہی چاہیے تھا۔ لیکن زمانہ گزرنے کے ساتھ اخلاقی انحطاط پیدا ہو گیا ہو، تو اس میں تعجّب کی کوئی بات نہیں۔ یونانی مؤرخ ہیروڈوٹس نے جو کچھ لکھا ہے، وہ آپ اوپر پڑھ ہی چکے ہیں، اگرچہ اس کے بیان میں بہت کچھ مبالغہ معلوم ہوتا ہے اور ابھی تک کوئی مقامی دستاویزی شہادت، اس کی تائید میں ہمیں نہیں ملی، لیکن یہ بھی حدِ امکان میں ہے کہ بعض مندروں سے متعلق جو عورتیں تھیں، وہ اس طرح کرتی ہوں کہ خاص خاص تہواروں کے موقع پر

مردوں کو اپنی طرف مائل کرنے کے لیے بیٹھتی ہوں اور ہیروڈوٹس نے اسی بات کو نمک مرچ لگا کر سارے ملک کی کنواریوں سے منسوب کر دیا ہو۔

راہبہ اور پجارن: راہبہ کا طبقہ البتہ بہت پُر وقار معلوم ہوتا ہے۔ حکم تھا کہ اگر کوئی شخص کسی راہبہ پر تہمت لگائے تو اسے سخت سزا دی جائے اور اسے غلام بنا لیا جائے (۱۲۷)۔

راہبہ اور پجارن، خانقاہ یا راہب خانے سے باہر نہیں جا سکتی تھیں۔ اگر وہ وہاں سے نکل کر شرابخانہ کھول لیں، بلکہ کسی شرابخانہ میں داخل بھی ہو جائیں تو انھیں زندہ جلا دینے کا حکم ہے (۱۱۰)۔ جرم کے مقابلے میں یہ سزا بظاہر بہت سخت معلوم ہوتی ہے لیکن جب ہم یہ مدِّنظر رکھیں، کہ یہ شرابخانے بہ حقیقت قحبہ خانے تھے اور کسی شریف عورت کا ان کی چوکھٹ پار کرلینا ہی اسے عمر بھر کے لیے بدنام اور مردود کر دینے کے لیے کافی تھا، تو یہ سزا بخوبی سمجھ میں آ سکتی ہے۔ کیونکہ راہبہ یا پجارن محض ایک عورت ہی نہیں تھی، بلکہ اس کے ساتھ مذہبی تقدس وابستہ تھا۔ وہ ایک طرح سے اپنے سارے طبقے اور اپنی خانقاہ کی نمائندہ تھی۔ جیسے اس کی عزت ان سب کی عزت تھی، اسی طرح اس کی بےعزتی بھی سب کی بےعزتی تھی۔ اگر کوئی شخص، بجا طور پر اسے انگشت نما کر سکتا ہے، تو گویا وہ اس خانقاہ اور راہب خانے کو انگشت نما کر رہا ہے۔ جہاں وہ راہبہ یا پجارن رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسے اس جرم کے لیے عبرتناک سزا دینے کا حکم دیا ہے۔

یہودیوں کے ہاں بھی اس کی مثال ملتی ہے۔ یعنی اگر کوئی عام عورت زنا کے جرم کی مرتکب ہوتی، تو اس کی سزا قتل یا سنگساری تھی (استثناء ۲۲: ۲۲-۲۴)۔ لیکن اگر کسی کاہن کی بیٹی اس جرم میں پکڑی جاتی، تو اسے زندہ جلا دیا جاتا تھا کیونکہ اس نے اپنی ناپاکی سے اپنے مقدس باپ کو بھی ناپاک کیا ہے (احبار ۲۱: ۹)

راہبہ کا طبقہ اخلاقی طور پر کتنا بلند تھا اور وہ ہر قسم کے شک و شبہ سے کتنا بالا تھا، اس کا ثبوت اس سے بھی ملتا ہے کہ اس میں بڑے بڑے معزز گھرانوں کی عورتیں شامل

ہوتی تھیں۔ اکّد کے بادشاہ سرجون، لارسہ کے بادشاہ قدر معبوق، اور بابل کے آخری مقامی بادشاہ بنو نیدوس۔ ان سب نے اپنی اپنی بیٹیوں کو اُور کے مندر میں راہبہ بننے کی اجازت دی تھی۔ جب بنو نیدوس کی بیٹی شاہزادی بعل شلت ننار راہبہ[۵] بنی ہے، تو اس موقع پر بنو نیدوس نے جو دستاویز لکھی تھی، اس کے آخری الفاظ ہیں۔

> میں دعا کرتا ہوں، کہ میری جگر گوشہ بعل شلت ننار، ان سب کے سامنے صاحبِ اقتدار ہو اور اس کے احکام کی تعمیل کی جائے۔
> اس کے اعمال نیک ہوں اور وہ مخلص پرستار بنے۔ میری دعا ہے کہ وہ گناہوں سے پاک رہے۔

اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے، کہ راہبہ سے توقع کی جاتی تھی، کہ وہ اپنے بنئے ناحول میں قابلِ احترام زندگی بسر کریگی۔

لاولد پُجارن:

پُجارن کو نکاح کرنے کی ممانعت نہیں تھی۔ نکاح کی ابتدائی غرض ہر جگہ اولاد ہوا کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کسی شخص کے ایک بیوی سے اولاد نہ ہو، تو کوئی اور بات رستے میں حائل نہ ہونے کی صورت میں، وہ دوسری شادی کر لیتا ہے۔ قانونِ حمورابی اس حالت میں اجازت دیتا ہے، کہ اگر کسی پُجارن بیوی سے اولاد نہ ہو، تو وہ اپنے شوہر کو ایک لونڈی پیش کر سکتی ہے۔ اگر اس لونڈی سے اولاد پیدا ہو جائے، تو پھر اس کا خاوند نہ دوسرا نکاح کر سکتا ہے، نہ داشتہ ہی رکھ سکتا ہے (۱۴۴)۔ اگر اس لونڈی سے بھی اولاد نہ ہو، تو پھر اسے داشتہ رکھنے کی اجازت ہے، لیکن اس داشتہ کا درجہ اس پُجارن بیوی کے برابر نہیں ہوگا (۱۴۵)۔ اگر پُجارن کی پیش کردہ لونڈی سے

---

[۵] عہد نامۂ قدیم کی کتاب بنی دانیال میں جس بادشاہ بلشفر کا نام آتا ہے، وہ اسی بنو نیدوس کا بیٹا اور بعل شلت ننار کا بھائی تھا۔ اس کا صحیح نام بعل سرادر تھا۔ فارس کے مشہور بادشاہ خورس اعظم نے بنو نیدوس ہی کو شکست دے کر سلطنتِ بابل کا خاتمہ کیا تھا۔

اولاد پیدا ہوجائے، تو اس لونڈی کی حیثیت پھر بھی گھر کی مالکن کی لونڈی ہی کی رہیگی۔ وہ اگر اپنی مالکن سے گستاخی سے پیش آئے یا اس سے برابری کا دعویٰ کرنے لگے تو چونکہ اب اس کے شوہر کی اس سے اولاد ہو چکی ہے، وہ اسے بیچ تو نہیں سکتی، لیکن چاہے تو اسے بیڑی پہنا کے نظر بند کر دے اور اس کی نقل و حرکت پر پابندی عاید کر دے۔ یا اس کے حقوق منسوخ کر کے پھر نئے سرے سے اس سے لونڈی غلاموں کا سا سلوک کرنے لگے، مالکن کو اس سے کوئی روک نہیں سکتا (۱۴۶)۔ ہاں اگر اس لونڈی کے اولاد بھی نہ ہو اور وہ ڈوں کی لینے لگے، اور اپنی مالکن سے اوچھے پن یا بے ادبی سے پیش آئے، تو اسے بطور سزا منڈی میں بیچ سکتی ہے (۱۴۷)۔

صاحبِ اولاد پجارن:

اگر کسی پجارن بیوی سے اولاد ہوجاتی، تو بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے، کہ اس کے ہوتے ہوئے، خاوند دوسرا نکاح نہیں کر سکتا تھا۔ البتہ اس کو طلاق دے سکتا تھا۔ طلاق کی صورت میں لازم تھا، کہ وہ اس کا جہیز اسے واپس دے دے۔ نیز کوئی مکان یا کھیت اس کے حوالے کرے، جس سے وہ حینِ حیات نفع اندوز ہوتی رہے۔ جب اس کے بچے سنِ رُشد کو پہنچ جاتے اور اپنے باپ کی جایداد سے اپنا حصہ لیتے تو ان کی مطلقہ ماں بھی ایک بیٹے کے برابر حصہ لینے کی حقدار تھی۔ اس کے بعد وہ چاہے تو کسی دوسری جگہ نکاح کرے سکتی تھی (۱۳۷)۔

مذہبی عورتوں کا جہیز:

(۱۷۸) سے لے کر (۱۸۲) تک چار دفعات میں مذہبی

عورتوں کی وراثت کے احکام درج ہیں۔ یہاں ہر جگہ جہیز کا لفظ استعمال ہوا ہے لیکن قابلِ غور بات یہ ہے، کہ کسی جگہ اولاد کا ذکر نہیں، بلکہ بھائیوں کا نام لیا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ جب کوئی عورت، بلا جبر و اکراہ، اپنی مرضی سے، مذہبی زندگی اختیار کر کے راہبہ یا پجارن یا دیوداسی بن جاتی تھی، تو عرفِ عام میں وہ گویا دیوتا سے شادی کر لیتی تھی۔ اس لیے وہ بھی اپنی دوسری بہنوں کی طرح جہیز لینے کی مستحق سمجھی جاتی تھی، جنھوں نے مذہبی

زندگی اختیار نہیں کی اور جنھوں نے اپنی پسند کا نکاح کر کے پدری جایداد میں سے اپنا حصّہ لیا ہے۔

جہیز دیتے وقت باپ کا فرض تھا کہ وہ متعلقہ دستاویز میں اس بات کی تصریح کر دے کہ آیا اس پجارن کو اس جایداد پر جو اسے جہیز میں دی جا رہی ہے، اختیارِ مطلق حاصل ہے اور وہ اسے جیسے چاہے، استعمال کرے، یا بیچ ڈالے، اور اپنی موت کے بعد جس کے نام چاہے، وصیت کر جائے، یا وہ صرف حینِ حیات ہی اس سے نفع اندوز ہو سکتی ہے اور اس کی موت پر یہ جایداد اس کے میکے کے خاندان میں واپس آجائیگی (۱۷۸-۱۷۹)۔ اگر باپ جہیز دینے سے پہلے فوت ہو جاتا، تو پجارن بیٹی ترکے میں سے ایک لڑکے کے برابر حصّہ کی حقدار تھی (۱۸۰)۔ اور اگر باپ نے خود بیٹی کو مندر کی بھینٹ دینے کی مَنّت مانی تھی اور وہ اسے جہیز دینے سے پہلے فوت ہو جائے، تو وہ بیٹی، باپ کے ترکے میں سے لڑکے کے حصّہ کا صرف ایک تہائی لے سکتی ہے (۱۸۱)۔ ان دونوں آخری صورتوں میں وہ اپنی زندگی بھر اس سے فائدہ اٹھائیگی۔ اس کی موت کے بعد، اس کے بھائی یا میکے کے دوسرے وارث اس پر قبضہ کرینگے۔

بابل میں پجارنوں کی بہت بڑی تعداد تھی اور ان میں سے بعض کافی مالدار تھیں۔ وہ تجارت کرتی تھیں، سود پر قرض دیتی تھیں، زمین اور جایداد کا لین دین کرتی تھیں۔ اناج اور دوسری اشیا کی نیلامی اور خرید و فروخت میں حصّہ لیتی تھیں۔ اس سے معلوم ہوگا کہ وہ سماج کا نہایت اہم اور سرگرم اور مفید جُزو تھیں۔

غالباً مندروں میں پجارنوں وغیرہ کے ذمّے جو فرائض ہوا کرتے تھے، ان کے سرانجام کرنے کے لیے مضبوط اور صحت ور اور جوان عورت زیادہ موزوں تھی۔ یہی سبب ہے کہ قانون کی متعدّد دفعات میں پجارنوں کے کم عمر لڑکیوں کو متبنّیٰ کرنے سے متعلق ہدایات ملتی ہیں۔ جب کوئی پجارن، بوڑھی یا کمزور ہو جاتی، تو وہ کسی نوجوان لڑکی کو گود لے لیتی۔ فرائضِ منصبی یہ لڑکی ادا کرتی اور منصب کی تمام آمدنی، بوڑھی پجارن آپ لے لیتی۔

اگر کوئی دیوداسی کسی لڑکے کو متبنّیٰ کر لیتی، تو بعد کو اس لڑکے کے حقیقی والدین

اس کی واپسی کا مطالبہ نہیں کر سکتے تھے (۱۸۷)۔ اب وہ دیوداسی ہی اس کی ماں تھی۔ اور اگر متبنّیٰ لڑکا کسی وجہ سے اپنی دیوداسی انّا کو، ماں تسلیم کرنے سے انکار کر دے، تو اس کی زبان کاٹ دینے کا حکم ہے (۱۹۲)۔ عموماً پوری کوشش کی جاتی ہوگی کہ متبنّیٰ لڑکے کو یہ معلوم نہ ہو، کہ اس کے حقیقی ماں باپ کون ہیں، تاکہ وہ پوری یکسوئی اور دلجمعی سے اپنی انّا کی خدمت کرے۔ لیکن اس کے باوجود اگر کسی طرح متبنّیٰ لڑکے کو پتا چل جائے کہ اس کے ماں باپ کون ہیں، تو اسے ان کے ہاں جانے آنے اور ان سے ملنے کی اجازت نہیں تھی۔ اس کا فرض تھا کہ وہ ہر طرف سے تعلقات قطع کر کے اپنے نئے گھر ہی میں رہے۔ اس پر بھی وہ انّا کو چھوڑ کر ان کے یہاں جانے سے باز نہ آئے تو حکم ہے کہ اس کی آنکھیں نوچ لی جائیں (۱۹۳)۔

ایک عجیب بات ہے کہ ان تینوں جگہوں پر (۱۸۷، ۱۹۱، ۱۹۲) دیوداسی کے ساتھ "ملازم"، کا ذکر ہے۔ کیا اس کا یہ مطلب تو نہیں، کہ مندر کی دیوداسیاں، ان ملازموں سے تعلّقاتِ زنا شوئی پیدا کر لینے کی مجاز تھیں (اگرچہ ضروری تھا کہ ان کے اولاد نہ پیدا ہو) اور ان تینوں دفعات میں ان دونوں کے مشترکہ متبنّیٰ بیٹے کا ذکر ہے؟

۵۔ متبنّیٰ

تبنیت کا اصول:

متبنّیٰ کرنے کی رسم چین اور ہندوستان سے شروع ہوئی۔ ان دونوں ملکوں میں بزرگوں کی پوجا ہوتی تھی اور ان کی موت کے بعد ان سے متعلق مذہبی رسمیں ادا کرنا پڑتی تھیں، ورنہ متوفّی کی نجات معرضِ خطر میں پڑ جانے کا اندیشہ تھا۔ اس لیے اگر کسی شخص کے اپنی اولاد نہیں ہوتی تھی، تو وہ کسی دوسرے کے بیٹے کو اپنا بیٹا بنا لیتا، جو اس کے مرنے کے بعد یہ رسوم پوری کرتا۔ قدیم رومنوں کے ہاں بھی متبنّیٰ کرنے کا یہی مقصد تھا۔

اس کے برعکس جب سامی قوموں نے متبنّیٰ کرنے کا اصول اختیار کیا، تو ان کا مقصد اس سے مادّی فوائد حاصل کرنا تھا۔ زمیندار اس لیے متبنّیٰ کرتا کہ وہ کھیت میں کام کاج کرنے یا ڈھور ڈنگر کی رکھوالی کے لیے ایک مددگار چاہتا ہے۔ مالدار اس لیے کہ اسے اپنے مال و دولت کے لیے ایک وارث کی ضرورت ہے اور وہ نہیں چاہتا کہ اس کے گاڑھے پسینے کی کمائی کسی غیر کے ہاتھ میں چلی جائے۔ قانونِ حمورابی میں بھی یہی صورت ہے اور اس کی تہ میں کوئی مذہبی خیال کام نہیں کر رہا ہے۔ کیونکہ اگر کوئی شخص چاہے تو وہ صُلبی اولاد کی موجودگی میں بھی کسی اور لڑکے کو متبنّیٰ بنا لے سکتا تھا (۱۹۰)۔ اگر کوئی کاریگر یا پیشہ ور کسی لڑکے کو متبنّیٰ بناتا، تو اس کا مقصد یہ تھا، کہ اسے اپنے کام میں ایک معاون کی ضرورت ہے۔ وہ اسے اپنے پیشے کی تعلیم دیتا اور روزی کمانے کے قابل بنا دیتا ہے، تو وہ گویا اپنے بڑھاپے کے دنوں کے لیے انتظام کر رہا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی بوڑھی پجارن، کسی نوعمر لڑکی کو گود لیتی ہے تو وہ یہ چاہتی ہے کہ وہ اس کی جگہ مندر میں کام کرے اور وہ خود اس کی آمدنی سے لطف اندوز ہوتی رہے۔

بابلی قانون:

متبنّیٰ کرنے پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ سماج کا ہر ایک طبقہ اس کا حق رکھتا تھا۔ آزاد اور غلام، مرد اور عورت کی کوئی تمیز نہیں تھی۔ البتّہ یہ ضروری تھا کہ متبنّیٰ کرنے والا، اس بچّے کو اپنے پیشے کی تعلیم دے اور اُسے اپنے پانو پر کھڑا ہونے کے قابل بنا دے۔ اگر اس کے صُلبی اولاد موجود ہے تو وہ متبنّیٰ کو بھی اس کے ساتھ اعلانیہ اپنا بیٹا قبول کرے۔ متبنّیٰ بننے کے بعد وہ بچہ اپنے اصلی والدین کے پاس صرف تین صورتوں میں واپس جا سکتا تھا (۱) اگر انکہ، متبنّیٰ کے سگے ماں باپ سے بدسلوکی سے پیش آئے (۱۸۶) یا (۲) انکہ نے متبنّیٰ کو اپنے پیشے کی تعلیم نہ دی ہو (۱۸۹) یا (۳) وہ اسے اپنی دوسری اولاد کے برابر دنیا کے سامنے پیش نہ کرے (۱۹۰) اس کے علاوہ اور کسی صورت میں متبنّیٰ اپنے ماں باپ کے پاس نہیں جا سکتا تھا۔

متبنیٰ کے حقوق و فرائض: تبنیت کا پہلا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ متبنیٰ اپنے اناّ اور اتکہ کے ترکے میں ان کی صُلبی اولاد کی طرح وارث بن جاتا تھا یعنی بالکل اسی طرح، جیسے لونڈی کی اولاد کا قانون تھا (۱۷۰)۔

جس بچے کو متبنیٰ کیا جاتا تھا، وہ عام طور پر دور نزدیک سے رشتہ دار ہوتا تھا لیکن بعض اوقات غیر بلکہ غلام کو بھی متبنیٰ کر لیا جاتا تھا۔ اگر بچہ اصل میں غلام تھا، تو متبنیٰ بننے کے ساتھ ہی وہ غلامی سے آزاد ہوجاتا اور اس کی آئندہ حیثیت اتکہ کے صُلبی بیٹے سے کم نہیں ہوتی تھی۔ مثال میں ذیل کا معاہدہ پیش کیا جا سکتا ہے:

"سن ابوشں نے زجاج کی پیشانی دھوڈالی ہے اور اسے اپنا بیٹا بنا لیا ہے اس کی غلامی کی تختی توڑ دی گئی ہے۔ جب تک سن ابوشں زندہ ہے، زجاج اس کی خدمت کریگا۔ شمس کی پجارن نوتبت اور اس کے بھائی نبی سن (یعنی سن ابوشں کی اولاد) کا آج سے زجاج پر کوئی حق نہیں۔ وہ اب ان کا بھائی ہے۔ اگر زجاج کبھی اپنے باپ سن ابوش سے کہے "تم میرے باپ نہیں ہو"، تو اسے شاہی قانون کے مطابق سزا دی جائیگی (شمس اور مردوخ اور سمولا ایل کے نام پر قسمیں کھائی گئیں)"۔

یہاں اتکہ کا نام سن ابوشں ہے۔ زجاج اس کا غلام تھا۔ پیشانی دھوڈالنے سے یہ مراد ہے کہ مالک نے اسے غلامی سے آزاد کر دیا ہے اور اس کی غلامی کی دستاویز (تختی) ضائع کر دینے کے بعد اسے متبنیٰ بنا لیا ہے، حالانکہ اس کی اپنی صُلبی اولاد پہلے سے موجود ہے، ایک بیٹا اور ایک بیٹی، جو مذہبی زندگی اختیار کر چکی ہے۔ اب وہ دونوں زجاج سے متعلق اپنے مالکانہ حقوق سے دست بردار ہوتے ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ آج سے ان کے برابر ہے اور باپ کی وفات کے بعد وہ نہ صرف ان کا غلام نہیں بنیگا بلکہ ان کے ساتھ ترکے کا وارث بھی ہوگا۔

متبنیٰ کا فرض تھا کہ وہ اپنی اناّ اور اتکہ کی اسی طرح عزت کرے اور ان سے

ادب سے پیش آئے، جیسے وہ واقعی اس کے ماں باپ ہوں۔ اگر وہ اپنے اتکہ سے کہے کہ تم میرے باپ نہیں یا اپنی انّا سے کہے کہ تم میری ماں نہیں، تو اس کی سزا یہ ہے کہ اس کی زبان کاٹ دی جائے (۱۹۲)۔ اگر بچے کو اپنے اصلی ماں باپ کا پتا بھی ہے، تو بھی اس کا فرض ہے کہ وہ اپنے نئے گھر میں رہے اور اپنی انّا اور اتکہ کے ہر ایک حکم کی تعمیل کرے۔ لیکن اگر اس کی بجائے وہ ان سے نفرت کرتا ہے اور اپنے حقیقی ماں باپ کے ہاں آتا جاتا ہے، تو اس کی آنکھیں نکال لینے کا حکم ہے (۱۹۳)۔

۶۔ وراثت

وراثت کا فیصلہ رواج کے مطابق ہوتا تھا اور چوں کہ اس کا نکاح سے بہت گہرا تعلق ہے، اس لیے قانون میں ان دونوں کا ذکر ایک ہی جگہ کیا گیا ہے۔

وصیّت:

پہلا اصول یہ ملتا ہے کہ کسی شخص کو وصیّت کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ مثلاً وہ اپنی جایداد کا کوئی حصّہ کسی مندر کے نام لگا جائے یا کسی غیر شخص ہی کو دے جائے۔ اگر وہ اپنی بیوی کو کوئی چیز دینا چاہے (۱۵۰، ۱۷۱ب) یا اپنی بیٹی کو، جس نے مذہبی زندگی اختیار کر لی ہے، کوئی چیز خاص طور پر دینا چاہے (۱۷۹)، یا وہ کسی بیٹے ہی کو بطور تحفہ کچھ دینا چاہے، تو اسے اپنی حین حیات ہی ایسا کرنے کی اجازت تھی (۱۶۵)۔ ورثا کا حق صرف اس جایداد پر تھا، جو موت کے وقت بے واسطہ یا بالواسطہ طور پر اس کے قبضہ میں ہوتی۔ چونکہ یہ تحائف وغیرہ اس کی موت پر اس کے پاس نہیں تھے، اس لیے یہ اس کے ترکے میں محسوب نہیں ہوتے تھے۔

ترکہ:

جایداد کی تقسیم سے پہلے بعض باتوں کا خیال رکھنا پڑتا تھا۔ اگر اولاد میں غیر شادی شدہ لڑکی ہو، تو اس کے لیے جہیز (۱۸۴)، اور لڑکا ہو تو اس کے نکاح کے لیے

"زرِ عروس" الگ کرنا پڑتا تھا (۱۶۶)۔ اگر بیوی اس سے پہلے اپنا حق لے چکی ہے، تو بہتر ورنہ اس کا حصّہ ایک لڑکے کے برابر تھا (۱۷۲-الف)۔ لیکن وہ صرف حینِ حیات اس سے خود نفع اندوز ہونے کی حقدار تھی۔ نہ اسے کسی کے نام ہبہ کر سکتی تھی، نہ اس کی موت پر اس کے متوفی خاوند کے ورثا کے علاوہ کوئی اور شخص اس کا حصّہ لے سکتا تھا (۱۷۱-ب) اگر وہ نکاحِ ثانی کر لیتی، تو اس صورت میں بھی یہ اس کے پہلے خاوند کے خاندان ہی میں رہتا (۱۷۲-ب)۔ اگر لڑکیوں میں سے کوئی مذہبی خیال کی ہو اور ترکِ دنیا کرنا چاہے، تو وہ اپنے مذہبی رتبے کے مطابق حصّہ لینے کی حقدار تھی (۱۸۰-۱۸۲)۔

اصولِ تقسیم

تمام ترکہ بیٹوں میں برابر برابر تقسیم ہو جاتا تھا، خواہ وہ اس کی صُلبی اولاد ہو، خواہ متبنّیٰ (۱۶۷، ۱۷۰)۔ چونکہ لڑکی اپنا حصّہ جہیز کی شکل میں لے چکی ہے، اس لیے وہ ترکے میں وارث نہیں ہوتی تھی (۱۸۳)۔

عام حالات میں باپ کسی کو وراثت سے محروم نہیں کر سکتا تھا۔ کوئی ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ باپ کسی بیٹے کو عاق کرنا چاہے، تو اس کی ایک ہی صورت تھی کہ وہ عدالت میں ثابت کرے، کہ لڑکے سے کوئی ایسا شنیع فعل سرزد ہوا ہے کہ وہ اُسے عاق کرنے پر مجبور ہے۔ اس کے بعد عدالت کی منظوری سے وہ ایسا کر سکتا تھا (۱۶۸-۱۶۹)۔

عورت کے وارث

عورت کا ترکہ تین چیزوں پر مشتمل ہوتا تھا۔ ایک وہ جہیز جو وہ شادی پر میکے سے ساتھ لاتی تھی۔ دوسرے اس کا مہر جو اسی موقع پر اس کو خاوند کی طرف سے ملتا تھا اور تیسرے وہ تحائف وغیرہ جو اس کا خاوند بطیبِ خاطر سے وقتاً فوقتاً دیتا رہا ہے۔ ان سب چیزوں کی وراثت کا قانون الگ الگ ہے۔

عام اصول یہ ہے کہ عورت کے وارث اس کے بچے ہیں۔ بچوں کی موجودگی میں، اس کے ترکے پر نہ اس کے خاوند کا کوئی حق ہے، نہ اس کے میکے کے کسی آدمی کا۔

لیکن اگر اس کے اولاد نہ ہو، تو جو جہیز وہ اپنے باپ کے گھر سے لائی تھی، یہ اس کی موت کے بعد اس کے باپ کے گھر میں واپس چلا جائیگا (۱۶۳) ۔ اس میں صرف ایک استثنا ہے کہ اگر خاوند نے ,, زرِ عروس ،، کسی نہ کسی طرح وصول کر لیا ہے، تو بہتر، ورنہ وہ جہیز واپس کرنے سے پہلے اس میں سے ,, زرِ عروس ،، کے مساوی رقم وضع کر لینے کا حقدار ہے (۱۶۴) ۔

مہر کی وراثت میں اس کے میکے کا قطعاً کوئی حق نہیں ۔ یہ اس کے بچوں میں تقسیم ہوگا ۔ وہ اس میں سے کسی خاص بچے کو بھی کچھ علیحدہ طور پر نہیں دے سکتی، بچوں کی عدم موجودگی میں یہ اس کے خاوند کے دوسرے وارثوں کو ملیگا (۱۷۱ ب)

جو تحائف اسے اپنے خاوند کی طرف سے ملتے رہے ہیں، یہ اس کی ذاتی ملکیت ہے ۔ اُن پر اس کا بلاشرکتِ غیرے قبضہ ہے، تو وہ چاہے، تو انھیں کسی خاص بچے کو دے ڈالے، یہ اس کے ترکے میں شمار نہیں ہونگے ۔ صرف ایک شرط ہے کہ وہ انھیں اپنے میکے کے کسی آدمی کو نہیں دے سکتی (۱۵۰) ۔

۷ ۔ زراعت

دیوتا کے لوگ :

بابل کا سیاسی نظام شہر پر قائم تھا، تو اس کے اقتصادی اور مذہبی نظام کی اساس مندر تھا ۔ ان مندروں کے مذہبی پہلو اور لوگوں کے معتقدات پر بحث تو آگے آئیگی، یہاں ہم ان مندروں کی اقتصادی اور مالی اہمیت کا تفصیلی جائزہ لینا چاہتے ہیں ۔

یہ مندر نہایت ابتدائی ایام یعنی سُومری عہد سے جملہ سماجی سرگرمیوں کا مرکز تھے ۔ یا یوں کہیے کہ مندر اور اس کا دیوتا شہر کے رہنے والوں کی زندگی کے ہر ایک شعبے پر حاوی تھے اور تمام باشندے کسی نہ کسی حیثیت سے اس دیوتا اور مندر سے منسوب کیے جاتے تھے ۔ اس کا باعث یہ تھا کہ ہر ایک مندر کے ساتھ بہت بڑی جاگیر وابستہ ہوتی تھی،

جیسے ہم یوں بھی تعبیر کرسکتے ہیں کہ ہر ایک دیوتا وسیع جاگیر کا مالک ہوتا تھا اور اس شہر کے تمام باشندے کسی نہ کسی پہلو سے اس جاگیر پر کام کرتے تھے۔ کچھ مندر میں پجاری تھے، کچھ بھیڑ بکریوں کے ریوڑ اور گائے بیلوں کے گلّوں کے گڈریے تھے، کچھ ماہی گیر تھے، کچھ باغبان، بعض راج مزدور، بعض بڑھئی اور کاریگر یا کوئی اور کام کرنے پر مقرر تھے۔ بعض زمین کی پیداوار کا سودا کرنے کے ذمّہ دار تھے۔ پھر ان کی مدد کو غلام تھے، حساب رکھنے کو خزانچی تھے۔ اور سب سے اوپر ان کاموں کی دیکھ بھال کے لیے افسر اور مہتمم تھے۔ اس طرح شہر کے تمام لوگ "فلاں دیوتا کے لوگ" کہلاتے تھے۔

زمین کی تقسیم :

شہر کی زمین دو حصّوں میں تقسیم کی جاتی تھی۔ ایک حصّہ مندر کے انتظام میں رہتا۔ اس پر کاشت وغیرہ کا سارا کام اس مندر کے "دیوتا کے لوگ" مل جُل کر کرتے اور اگرچہ اس کی تمام پیداوار شروع میں مندر ہی کے حوالے کردی جاتی تھی، لیکن بعد کو اس کے استعمال میں بھی سب شریک ہوتے تھے۔ اس زمین کو ہم آج کل کی اصطلاح میں "شاملات" کہہ سکتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ موجودہ "شاملات" صرف چراگاہ یا بنجر زمین پر مشتمل ہوتی ہے اور یہاں شہر کی ساری زراعتی زمین پر یہ اصول وارد ہوتا تھا۔ شہر کی ایک چوتھائی قابلِ کاشت زمین تک مندر کی ملکیت ہوسکتی تھی۔

بقیہ زمین باشندوں میں تقسیم کردی جاتی تھی، جسے وہ اپنی ضرورت کے مطابق جیسے چاہیں، کاشت کرسکتے تھے اور اس کی پیداوار بھی ان کی ذاتی مِلک ہوتی تھی۔ البتّہ اس زمین کے لیے انھیں مندر کو مالیہ دینا پڑتا تھا۔ مالیہ کی شرح فصل کے چھٹے حصّے سے لے کر ایک تہائی تک ہوتی تھی اور اگرچہ اس کا بڑا حصّہ جنس کی شکل میں ادا کیا جاسکتا تھا، لیکن تھوڑی سی مقدار چاندی کی بھی ضرور دینا پڑتی تھی۔

"شاملات" کے لیے زمینداروں کو تقاوی، ہل جوتنے اور گاہنے کے لیے بیل، کاشتکاری کے اوزار اور دوسرا سامان مندر مہیا کرتا تھا۔ سب چھوٹے بڑے "دیوتا کی سیوا" کے لیے ہر سال مقررہ دنوں میں اس زمین پر کام کرتے۔ اناج وغیرہ کا ذخیرہ رکھنے

کے لیے مندروں کے ساتھ بڑے بڑے گودام تعمیر کیے جاتے تھے۔ ہمیں ایک مندر کے ذخیرے کی فہرست میں ان چیزوں کے نام ملے ہیں:-

گندم، جو، تِل، پیاز اور دوسری ترکاریاں پینے کی بیئر اور شراب، کھجوریں، خشک اور نمکین مچھلی، چربی، اُون، کھالیں، بانس اور نرسل، چٹائیاں، مختلف قسم کی لکڑی، رال، بعض قیمتی پتھر، مرمر وغیرہ، مندر میں استعمال کے برتن، کاشتکاری کے اوزار۔

اس سے ان ذخیروں کی وسعت اور اشیا کی بوقلمونی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ یہ غلّہ اور دوسری اشیا بھی نہ صرف بیج اور قربانیوں یا مندر کے پجاریوں، دیوداسیوں اور دوسرے مفت خوروں کے کام آتیں، بلکہ اس کا کچھ حصّہ شہر کے باشندوں میں بھی تقسیم کردیا جاتا تھا۔ چنانچہ اس بات کا ثبوت موجود ہے کہ جو اور اُون باقاعدہ مندر کی طرف سے بانٹے جاتے تھے۔ بلکہ اگر ذخیرے میں ان چیزوں کی بہت زیادہ مقدار جمع ہوجاتی، تو خاص تیوہاروں پر مزید تقسیم کا انتظام بھی کردیا جاتا تھا۔

مندر کی تحویل میں ان زراعتی زمینوں کے علاوہ پھلوں کے باغ بھی تھے۔ ان میں اگرچہ زیادہ تر کھجور کے درخت ہوتے تھے، لیکن ان کے درمیان کی خالی جگہ میں انگور، انجیر، سیب، انار، شہتوت پیدا کرنے کی کوشش بھی کی جاتی۔ بعض باغ صرف جلانے کی اور عمارتی لکڑی مہیّا کرتے تھے۔

جب تک ان شہروں کی آزادانہ حیثیت قائم رہی، اسی طریقے پر کام ہوتا رہا۔ لیکن حمورابی کے زمانے میں ان شہری ریاستوں کا مستقل وجود ختم ہوگیا اور وہ ایک وسیع سلطنت کا حصّہ بن گئیں۔ اب وہاں کے مندروں اور ان کی جاگیروں کا انتظام بھی بادشاہ یا مرکزی حکومت کی طرف سے ہونے لگا۔ اگرچہ مندر کی متعلقہ زمین (جاگیر) اب بھی برائے نام دیوتا ہی کی ملکیت تھی، لیکن اس کی پیداوار جمع کرنے اور تقسیم کے احکام اب بادشاہِ وقت کی طرف سے صادر ہونے لگے اور اس بارے میں مقامی پجاری یا کارکن اپنے طور پر کوئی فیصلہ نہیں کرسکتے تھے۔

قانونِ حمورابی میں دو چیزوں کا ذکر اکثر آیا ہے: کھیت اور میوہ باغ۔ اگرچہ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں، بابلی لوگ مختلف اشیا کی کاشت کرتے تھے، لیکن ان کی زندگی کا دارو مدار زیادہ تر گندم، جَو، تِل اور کھجور پر تھا۔ اس لیے جہاں کھیت کا لفظ آیا ہے اس سے مراد پہلی تین چیزیں یعنی گندم، جَو اور تِل ہیں اور میوہ باغ سے کھجوروں کا باغ مراد ہے۔

پٹہ (زمین): عہدِ حمورابی میں زمین کی بہت بڑی مقدار بیوہ عورتوں اور پُجاریوں یا ایسے لوگوں کے قبضے میں تھی، جو خود کاشت نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے وہ مجبور تھے، کہ اسے آگے ٹھیکے پر اُٹھا دیں۔ شرط یہ ہوتی تھی کہ اس کے عوض میں مزارع، فصل کا ایک مقرر حصّہ مالکِ زمین کے حوالے کیا کرے گا۔ یہ حصّہ زمین کے رقبے، اس کے محلِ وقوع، انتظامِ قلبہ رانی، اس علاقے کی عام شرحِ پیداوار، فصل کی نوعیّت وغیرہ سب چیزوں کو مدِّ نظر رکھ کے مقرر کیا جاتا تھا۔ عام طور پر یہ فصل کی تہائی سے لے کر نصف تک ہوتا تھا (۴۶)۔

بیج، بونی، ہل، نلائی، کٹائی وغیرہ سب مزارع کے ذمّے تھا۔ وہ چاہے تو یہ کام اپنی بیوی بچّوں کی مدد سے کرے یا کمیرے کرایے پر منگوا لے۔

بعض اوقات بٹائی کی جگہ فی ایکڑ غلّے کی شرح مقرّر کر دی جاتی، یا غلّے کے علاوہ مزارع کو کچھ اور خدمت بھی کرنا پڑتی تھی۔ مثال کے طور پر ایک دستاویز ملاحظہ ہو:

> دبن زامہ نے شمس کی پُجارن، اناالٰہی عرشہ بنت وردایلش سے ساٹ گز زمین ٹھیکے پر لی ہے۔ فصل کے موقع پر وہ دو تہائی گر غلّہ فی گن کے حساب سے ماپ کر مندر کے دروازے پر ادا کریگا۔ اس کے علاوہ وہ تینوں بڑے تیوہاروں میں ہر ایک موقع پر (۲۰) قاع ٹوڈی (۵) قاع روٹی، اور گوشت کی ایک ران بھی دیا کریگا۔ (تاریخ اور گواہوں کے نام)۔

بالعموم زراعتی زمین ایک سال کے ٹھیکے پر دی جاتی تھی، لیکن پرتی کی صورت میں جسے نئے سرے سے کاشت وغیرہ کے قابل بنانے کی ضرورت ہوتی، یہ میعاد تین برس ہوا

کرتی۔ پہلے برس مزارع کچھ نہیں دیتا تھا، کیونکہ یہ زمانہ زمین کے تیار کرنے میں لگ جاتا تھا اور عام حالات میں پہلے سال شاذونادر ہی کوئی پیداوار ہوتی ہوگی۔ دوسرے برس وہ کچھ برائے نام کرایہ دیتا۔ البتہ تیسرے برس اسے ٹھیکے کی شرائط کے مطابق پورے واجبات ادا کرنے پڑتے تھے۔ ایک پٹہ نامہ مثال میں پیش کیا جاتا ہے:۔

زمیندار شل شونا سے مردوخ ناصر نے تین گن زمین پٹے پر لی ہے۔

مردوخ ناصر پہلے برس اسے توڑ کر کاشت کے قابل بنائیگا۔ دوسرے برس وہ اس کے لیے دو تہائی گر غلہ ماپ کر دیگا۔ تیسرے برس وہ اسی شرح سے غلہ ادا کریگا جو اس کے پڑوس کے مزارع دیتے ہیں۔

اگر کوئی شخص زیر کاشت زمین کرایے پر لے کر اس میں کام نہ کرتا، تو اُسے فصل کے موقع پر قرب وجوار کی زمینوں کی اوسط پیداوار صاحب زمین کو دینا پڑتی تھی (۴۲-۴۳)، اور بنجر زمین کی صورت میں اسے چوتھے برس، زمین توڑ کر مالک کے حوالے کرنا پڑتی تھی اور ساتھ کچھ اناج بھی بطور تاوان دینا پڑتا تھا (۴۴)۔ البتہ اگر امساکِ باراں یا طوفان کے باعث فصل تباہ ہو جائے، جس پر مزارع کا کوئی اختیار نہیں تھا، تو اسے یہ حق حاصل تھا کہ وہ پٹے کی تختی پانی سے دھو ڈالے اور زمیندار کا حصّہ نہ ادا کرے۔ بابلیوں کے نزدیک قدرتی حوادث، دیوتاؤں کے کام تھے۔ بابلی دیومالا میں اَداد دیوتا کا وہی مقام تھا جو ہندوؤں کے ہاں اندر دیوتا کا ہے۔ وہ برق و باراں کے لیے ذمّہ دار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قانون میں یہ نہیں کہا کہ "وہ کثرتِ بارش سے کھیت زیر آب ہو جائے"، بلکہ یہ کہ "اَداد دیوتا کھیت زیر آب کردے" (۴۸)۔ (اسی طرح کا اشارہ "خدا کا غضب" (۲۶۶) میں ہے)۔

ہاں اگر مزارع مالک کا حصّہ، نقد یا جنس کی صورت میں ادا کر چکا ہے اور پھر اس کے بعد کسی ناگہانی حادثے میں فصل برباد ہو جائے، تو اب وہ اس نقصان کے لیے مالک سے کوئی مطالبہ نہیں کرسکتا، وہ اسے بلاشرکتِ غیرے خود برداشت کرے! (۴۵)۔

اگر مزارع کے پاس بیج نہ ہو (اور ایسی صورت عام طور پر پیش آتی ہوگی)، تو اُسے لازماً ساہوکار سے قرض لینا پڑیگا۔ لیکن اسے فصل کی ضمانت پر قرض لینے کی اجازت

نہیں تھی کیونکہ اس صورت میں اس بات کا بجا اندیشہ تھا کہ قرضخواہ ساہوکار کہیں زمیندار کا حصّہ بھی ہضم نہ کر جائے۔ اس حالت میں زمیندار کھیتی پر خود قبضہ کر کے، پہلے اپنا حصّہ الگ کر لیتا۔ اس کے بعد ساہوکار کے قرض کی ادائی ہوتی۔ پھر جو کچھ بچ رہتا، وہ مزارع کے حوالے کر دیا جاتا۔ اگر قرض بیج کی شکل میں نہیں، بلکہ نقد (چاندی) بھی ہوتا، تو مقروض کا حق تھا کہ وہ اس کے عوض میں، قرضخواہ کو، حکومت کے مقرّرہ نرخ پر، غلّہ، اناج وغیرہ ادا کر دے (۴۹۔ ۵۰)

پٹّہ (میوہ باغ): بابلیوں کے لیے کھجور بہت قیمتی درخت تھا اور اس سے ان کے سَو کام نکلتے تھے۔ اس لیے کھجور کا کاٹنا جُرم قرار دیا گیا (۵۹)۔ ہندستان میں تو بہت سے ایسے مفید جانوروں اور درختوں کی آخر میں پوجا ہونے لگی، جن کے افادے کی وجہ سے شروع میں انھیں صرف نقصان پہنچانا ہی جُرم سمجھا جاتا ہوگا۔

عام کھیت کے مقابلے میں کھجوروں کے باغ میں کام آسان ہوتا ہے۔ صرف اُسے متواتر پانی دینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ کھجور میں پانچ برس کے بعد پھل آنا شروع ہو جاتا ہے اور اگر ایک مرتبہ باغ تیار ہو جائے، تو اس کے بعد اس میں زیادہ محنت نہیں کرنا پڑتی۔ معمولی دیکھ بھال سے سال بسال فصل اپنے آپ تیار ہوتی رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے، کہ باغ کا مالک فصل کا دو تہائی لے لیتا تھا اور باقی تہائی مالی (۶۴)۔ اگر مالی اپنی ذاتی ضرورت کے لیے کسی سے باغ کی ضمانت پر قرض لیتا، تو مالک کا حق تھا کہ وہ قرضخواہ کے مطالبات اپنی گرہ سے ادا کر کے پوری فصل پر خود قبضہ جمائے (۶۶)۔

ہل اور بونی: جیسا کہ ہیروڈوٹس نے بھی لکھا ہے (کتاب اول: ۱۹۳)، عراق کی زمین ہمیشہ بہت زرخیز رہی ہے۔ دونوں دریاؤں کی لائی ہوئی مٹّی سے جو زمین بنتی ہے، اس پر معمولی محنت کرنے سے فصل پیدا ہو سکتی ہے۔

کسّدی عہد کی ایک تصویر نفرؔ کے مقام سے ملی ہے۔ اس میں تین شخص ہل چلا

رہے ہیں۔ ہل کے آگے دو بیل جُتے ہوئے ہیں، جن کے ہانکنے پر ایک شخص مقرر ہے۔ دوسرا پیچھے ہل پکڑے ہوئے ہے۔ (ہل اسی شکل کا ہے، جیسا آج بھی شام میں استعمال ہوتا ہے۔ اس میں دو دستے ہوتے ہیں اور ان دونوں کو پکڑنا پڑتا ہے، تاکہ ہل کی پھالی اِدھر اُدھر نہ ہو جائے) تیسرے شخص کے بائیں کندھے سے ایک جھولی لٹک رہی ہے۔ وہ اس میں سے بیج نکال نکال کر ہل سے ملحق قیف نُما نلکی میں ڈال رہا ہے، جو نیچے باہ میں گرتا جاتا ہے۔ غالبًا ہل جوتنے کا یہی عام طریقہ رہا ہوگا۔

آبپاشی :

زراعت کا انحصار آبپاشی پر ہے۔ کھیت ہو کہ باغ، اگر پانی میسّر نہ آئے، تو محنتی سے محنتی مزارع بھی کچھ نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ پرانے زمانے میں جہاں کہیں کسی بادشاہ نے نہر کھدوائی یا رعایا کے لیے آبرسانی کے اور سامان مہیا کیے، اس کے ایسے کاموں کی خاص طور پر تعریف کی گئی ہے۔ بعض اوقات کوئی بڑا زمیندار یا متموّل آدمی بھی نہر تیار کر لیتا اور خاص شروط پر کاشتکاروں کو نقد یا جنس کے عوض میں، اس میں سے پانی مہیا کر دیتا تھا۔ کاشتکار کا فرض تھا کہ وہ نہر سے پانی لیتے وقت نہایت احتیاط سے کام لے۔ اگر اس کی غفلت سے، اس کے پڑوسی کا کھیت زیرِ آب ہو جائے اور اس کی کھیتی کو نقصان پہنچ جائے، تو وہ ہرجانہ ادا کرنے کا ذمّہ دار تھا (۵۳-۵۶)

نہروں کے علاوہ آبپاشی کے دو اور طریقے بھی رائج تھے۔ ایک ڈھیکلی، دوسرا پَن رہٹ۔ ڈھیکلی میں چمڑے کا بڑا سا چرسہ بیلوں کے ذریعے استعمال ہوتا تھا۔ یہ اس طرح کا تھا، جیسا آج کل کا مصری شادوف ہے اور ہندوستان کے بعض حصّوں میں بھی مروّج ہے۔ پَن رہٹ البتہ زیادہ دلچسپ چیز تھی اور اس سے بابلیوں کی ایجاد کی صلاحیت پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ یہ عام طور پر دریا میں اس جگہ لگایا جاتا تھا، جہاں پانی بہت تیزی سے بہتا ہو۔ اس کا اصول پَن چکی کا سا تھا۔ اس میں دو چکّر یا پہیے ہوتے، جو ایک دُھرے کے ذریعے آپس میں جُڑے ہوتے تھے۔ ایک چھوٹا، یہ پانی کی سطح کے نیچے رہتا۔ دوسرا بڑا نیمے دروں، نیمے بروں۔ نیچے والے چکّر کے اندر کھجور کی تہ بہ تہ

بندھی ہوئی شاخیں متقاطع صورت میں، میخوں سے ڈھرے میں جڑ دی جاتی تھیں۔ یہی پن چکی کی پتواروں کا کام دیتی تھیں۔ جب پانی کے بہاؤ کے زور سے یہ چکر چلتا، تو ڈھرے کے ذریعے دوسرا بڑا چکر بھی حرکت میں آجاتا، جس کے گرداگرد پکی مٹی کی ڈولچیاں (پنجابی: ٹنڈین) بندھی ہوتی تھیں۔ یہ چکر برابر چلتا رہتا اور ان ڈولچیوں کا پانی، کنارے پر لگی ہوئی لکڑی کی پنالی میں گرتا رہتا، جیسا یونانی مورخ تھیوفراسطوس نے بھی لکھا ہے (۶۲)۔ بابلیوں کا یہ عام دستور تھا کہ وہ دو فصلیں کاٹنے کے بعد افتادہ اٹھا دیتے اور اس میں بھیڑ بکریاں چرنے چگنے کو چھوڑ دیتے، تاکہ پھر سے کھاد پڑ جائے۔ یہی آج کل کا بھی نظریہ ہے۔ مقصد یہ ہوتا ہے کہ زمین متواتر کاشت سے کمزور نہ ہو جائے اور ایک سال کے ناغے سے اس کی طاقت عود کر آئے۔ گڈریے کا فرض تھا کہ وہ مالک سے اجازت لیے بغیر جانوروں کو کسی پڑوسی کی کھیتی میں نہ گھسنے دے، ورنہ اسے اس کے لیے جرمانہ دینا پڑیگا۔ (۵۷-۵۸)۔
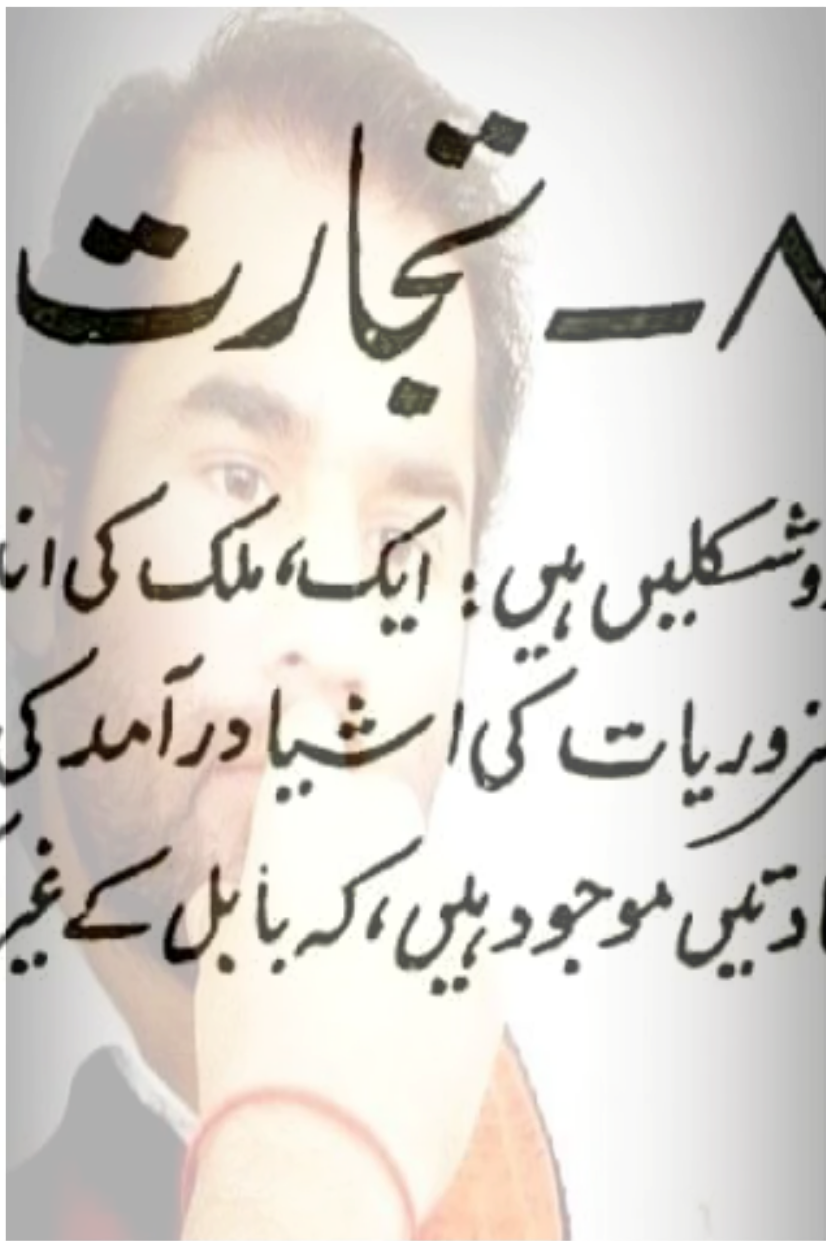
۸۔ تجارت

تجارتی کاروبار کی دو شکلیں ہیں: ایک، ملک کی اندرونی منڈیوں میں لین دین، دوسرے، دساور سے، جہاں سے اپنی ضروریات کی اشیا درآمد کی جاتی ہیں اور ملکی پیداوار وہاں برآمد کی جاتی ہیں۔ ایسی قوی شہادتیں موجود ہیں، کہ بابل کے غیر ملکوں سے تعلقات بہت وسیع پیمانے پر قائم تھے۔

بیرونی تعلقات

کسی ملک کے بیرونی ممالک سے تعلقات کا محکم ترین ثبوت یہ ہے کہ اس ملک کی کوئی مخصوص چیز وہاں سے دستیاب ہو جائے۔ مثلاً رومن زمانے کے سکّے، یورپ کے مختلف حصّوں کے علاوہ جنوبی ہندستان میں بھی بڑی تعداد میں ملے ہیں۔ اس سے ہم یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور ہیں، کہ اپنے عہدِ عروج میں روما اور ان ممالک کے درمیان نہ صرف آمد و رفت ہی تھی، بلکہ غالباً لین دین کے تعلقات بھی تھے، جن میں یہ سکّے استعمال

ہوئے۔

ہم بابلی مہروں کا ذکر کر چکے ہیں۔ یہ خاص اس ملک کی چیز ہیں اور یہیں سے دوسرے ملکوں میں پہنچیں۔ اس لیے جب ہمیں ترکی اور مصر اور ایران میں اسی قسم کی مہریں ملیں جو وادیِ فرات کا امتیازی نشان ہیں یا شوسس اور کش کے مقامات سے ایسی مہریں دستیاب ہوں، جن پر موہنجوڈارو اور ہڑپہ (وادیِ سندھ) کی طرز کی تحریریں ہیں اور سومری طرز کے نقش و نگار، تو ثابت ہوا کہ حضرت مسیح ناصری علیہ السلام سے تین ہزار برس پہلے بابل اور ان ممالک (ترکی، مصر، ایران، ہندستان) میں آمد و رفت جاری تھی، اور چونکہ یہ مہریں تجارتی کاروبار ہی میں استعمال ہوتی تھیں، اس لیے ان تعلقات کا مقصد تجارت ہی ہو سکتا ہے۔ یا مثلاً استر آباد اور سیستان کے بعض علاقوں سے ایسے مٹی کے برتن نکلے ہیں جن پر سومری نقش اور پھول بوٹے ہیں۔ یہ جب ہی ممکن ہے کہ ان ملکوں کے آپس میں گہرے تعلقات رہے ہوں۔

عہد نامۂ قدیم سے معلوم ہوتا ہے کہ جب حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنی حکومت کے چوتھے سال (تقریباً ۹۶۰ ق م) یروشلم میں ہیکل تعمیر کیا، تو اس میں چندن کی لکڑی استعمال کی گئی تھی (سلاطین الاول، ۱۰: ۱۲) ہم جانتے ہیں، کہ اس زمانے میں چندن صرف ہندستان ہی مہیا کر سکتا تھا۔ اس کے علاوہ مور بھی ہندستان کے جنگلوں سے وہاں گئے تھے، (ایضاً ۱۰-۲۲)۔ یہ چیزیں ہندستان سے فلسطین لے جانے کے لیے لابد تھا کہ یا تو انھیں یہاں سے خلیج فارس کے رستے پہلے بابل کی جنوبی بندرگاہوں (اُور اور اَیریدو) میں اور پھر وہاں سے چھوٹی کشتیوں پر بار کر کے فرات کے ذریعے مقصود تک پہنچایا جائے۔ یا ہندستان سے فلسطین تک کا سارا سفر خلیج فارس کے شمالی کنارے کے ساتھ ساتھ خشکی سے طے ہو۔ اس صورت میں بھی لازم تھا کہ یہ قافلے بابل سے گزریں۔ بہر حال کوئی سی صورت بھی رہی ہو اس سے بابل اور ہندستان کے درمیان تجارتی تعلقات کا قطعی ثبوت ملتا ہے۔

بیرونی ممالک سے آمد و رفت کی ایک اور مثال ملاحظہ ہو:

اُور سے کھدائی پر بعض تعویذ ملے ہیں، جنھیں لوگ تفاؤل یا نظرِ بد سے بچنے

کے لیے استعمال کرتے ہونگے۔ ان تعویزوں میں بہت بڑی تعداد بندروں کی شکل کی ہے۔ بندر بابل میں نہیں ہوتا تھا (آج بھی عراق میں نہیں ہوتا)۔ یہ ہندستان میں ہوتا ہے۔ آج کل تو نہیں، کسی زمانے میں مصر میں بھی کثرت سے ملتا تھا۔ اس لیے یہ فیصلہ کرنا تو مشکل ہے، کہ بابلیوں نے کہاں سے لیا، لیکن کہیں سے بھی ہو، اس سے ان کی باہر کے ملکوں میں آمد و رفت اور وہاں کے رسم و رواج کی تقلید کرنا ثابت ہوتا ہے۔

تجارتی سامان

بابل اپنی ضرورت کی جو چیزیں دساور سے منگواتا تھا، ان میں آرائش اور عمارتوں اور بُت تراشی کے لیے مختلف قسم کے پتھر، زیورات اور تجارتی لین دین کے لیے سونا چاندی، جنگی ساز و سامان اور گھریلو استعمال کے برتنوں کے لیے تانبا اور سکّہ، مکانوں اور جہاز سازی کے لیے لکڑی، اور مندروں میں جلانے کو بخور اور لوبان اور خوشبویات زیادہ اہم ہیں۔ ان کے مقابلے میں نہ صرف غلّہ، کھجوریں، پیاز اور زرعی پیداوار ہی باہر بھیجی جاتی تھی، بلکہ ان کے علاوہ بعض مقامی مصنوعات بھی برآمد کی جاتی تھیں۔ بابل میں اُونی کپڑے اور قالین کی صنعت بہت قدیم زمانے سے خاصی ترقی یافتہ رہی ہے۔ سُومری عہد سے باہر کی منڈیوں میں یہاں کی دستکاری کے نمونوں کی مانگ تھی اور پتھر اور دھات کی مورتیاں اور دوسرا آرائشی سامان ان ملکوں کو جاتا تھا۔ عین ممکن ہے، کہ زیادہ کاروبار اشیا کے تبادلے کی شکل میں ہوتا ہو، اور نقد قیمت لینے یا دینے کی نوبت کم آتی ہو۔

دساور میں یہ مال کشتیوں کے علاوہ گدھوں پر بار ہو کے جاتا تھا۔ ابھی تک اونٹ اور گھوڑا عام طور پر استعمال نہیں ہوتے تھے۔ بلکہ اس بات کا کوئی ثبوت ہی نہیں کہ یہ دونوں جانور بابل میں ابتدائی زمانے میں موجود بھی تھے۔

حمورابی کی فتوحات نے ان تجارتی سرگرمیوں میں اور اضافہ کر دیا۔ اب تک یہ تعلّقات زیادہ تر مشرقی ممالک کے ساتھ رہے تھے۔ اس کے زمانے میں ان میں مغربی منڈیوں۔ شام، فلسطین، مصر وغیرہ۔ کا بھی اضافہ ہو گیا۔ حمورابی کے زمانے کی ایک اور خصوصیت یہ بھی ہے، کہ بابل کا سیاسی اثر و نفوذ بہت دُور دست ممالک میں

محسوس ہونے لگا۔ منجملہ اور باتوں کے اس کا ایک اہم نتیجہ یہ نکلا کہ یہاں کا میخی رسم الخط تقریباً سارے مغربی ایشیا اور ایشیائے کوچک میں نجی اور تجارتی کاروبار کے لیے رائج ہوگیا۔ بلکہ مصری بادشاہ تو اسے اپنی سرکاری خط و کتابت میں بھی استعمال کرنے لگے تھے۔ ان باتوں نے بابل کے بیرونی دنیا سے تعلقات وسیع سے وسیع تر کر دیے۔

اندرونی تجارت :

ملک کی داخلی تجارتی سرگرمیوں پر قانون کی متعدد دفعات سے ثبوت مہیا ہو سکتا ہے، جو دفعہ (۹۰) سے شروع ہوتی ہیں۔ افسوس کہ اس سے پہلے کا بہت سا حصہ ضائع ہوگیا ہے اور بعد کے تین ٹکڑے بھی (۹۳، ۹۸، ۹۹) غائب ہیں۔ بہر حال جو کچھ ہمارے پاس موجود ہے، اس سے بھی یہ بالکل واضح ہو جاتا ہے، کہ زراعت کے بعد تجارت اور ساہوکارہ ہی لوگوں کا عام پیشہ تھا۔

معاہدوں کا اصول :

قانون میں ہر قسم کے معاہدوں سے متعلق ایک بنیادی اصول ملتا ہے، کہ جب بھی دو فریق کوئی معاہدہ کریں، تو یہ نیک نیتی سے، اور عمل کرنے کے لیے ہونا چاہیے۔ اور جب اس طرح کا کوئی جائز اقرار نامہ ضبطِ تحریر میں آجائے، تو اس پر عمل درآمد لازمی ہے۔ اب یہ صرف اسی صورت میں توڑا جا سکتا ہے جب کوئی فریق یہ ثابت کر دے، کہ ایسے حالات پیش آگئے تھے، جن پر اس کا کوئی اختیار نہیں تھا اور ان حالات کے باعث وہ اس معاہدے پر عمل کرنے سے معذور رہا۔ نہ صرف یہی بلکہ اس معاہدے کی نوعیت ایسی ہونی چاہیے کہ فریقین یہ خیال کرنے میں حق بجانب ہوں کہ ایسے موانع پیش آجانے کی صورت میں اس پر عمل کرنا ضروری (یا ممکن) نہیں ہوگا۔ مثلاً ہم زراعت کے باب میں دیکھ چکے ہیں، پٹہ ناقابلِ تنسیخ تھا، اور پٹہ دار بٹائی کا حصہ ادا کرنے سے صرف اسی صورت میں بچ سکتا تھا کہ فصل برق و باراں سے تباہ ہو جائے (۴۵، ۴۶)۔ اسی طرح اگر اس نے کسی ساہوکار سے فصل کی ضمانت پر قرض لیا اور طوفان یا کثرتِ بارش یا امساکِ باراں سے فصل خراب ہوگئی، تو قرضخواہ اس سے سود کا مطالبہ

نہیں کر سکتا تھا (۹۸)۔

یہی اصول تجارت میں بھی رائج تھا۔ اگر کوئی شخص، تجارت کے لیے کسی تاجر کا مال باہر لے جائے اور وہاں ڈاکو اس کا مال اسباب لوٹ لے جائیں، تو چونکہ اس امر پر اس کا کوئی اختیار نہیں تھا، قرضخواہ اس سے کوئی مطالبہ نہیں کر سکتا (۱۰۳)۔ لیکن اگر نقصان کسی اور سبب سے ہوا ہے، تو اس صورت میں مقروض بری الذمہ نہیں، اسے اصل زر کا دُگنا تھوک فروش تاجر کو واپس کرنا پڑیگا (۱۰۱)۔

ممکن ہے، ہم یہ خیال کریں کہ یہ دُگنے کی بیچ بہت ظالمانہ ہے۔ موئے پر سَو دُرّے، کہ ایک تو اس غریب کا نقصان ہوا اور اس پر مستزاد، اسے دُگنی رقم بھی لوٹانا پڑے۔ تو یاد رکھنا چاہیے کہ اُس بے امنی اور افراتفری کے زمانے میں کسی شخص کا اس طرح قرض دینا دراصل رقم کو ڈبو دینے کے مترادف تھا۔ مقروض کسی دوسرے ملک (یا کہیں دُور دراز شہر ہی میں) چلا جائے، تو قرضخواہ کے لیے یہ ناممکن تھا، کہ وہ اس کا تعاقب کرے اور اپنے دعوے کی تصدیق کر سکے۔ گویا ہمیشہ پوری رقم کے ڈوب جانے کا قوی اندیشہ تھا۔ اس لیے دھوکا دھڑی سے بچاؤ کے لیے یہ قانون بنایا گیا کہ، نقصان کے لیے ناگزیر حالات کے علاوہ کوئی اور عذر مسموع نہیں ہوگا۔ چنانچہ اگر ثابت ہو جائے، کہ مقروض نے بد دیانتی کی ہے، یا وہ دانستہ اپنے واجبات کی ادائی سے گریز کر رہا ہے، تو اسے اصل کی تگنی رقم دینا پڑتی تھی (۱۰۶)۔

اس کے ساتھ ہی خردہ فروش اور کارندے کے حقوق کی حفاظت یوں کی گئی کہ وہ جو مال اسباب بھی لے، اس کی باقاعدہ قیمت وار فہرست مرتب کی جائے اور وہ جتنی رقم بھی تاجر یا ساہوکار کو علی الحساب ادا کرے، اس سے مُہری رسید لے لے (۱۰۴)۔ ورنہ حساب بیباق کرتے وقت ایسی ادا شدہ رقم مُجرا نہیں لی جائیگی (۱۰۵)۔ اگر غیر دیانت دار تاجر کو بطور ہرجانہ تگنی رقم ادا کرنے کا حکم ہے، تو غیر دیانت دار ساہوکار کو، جو کسی رقم کی وصولی کے بعد اس سے انکار کر دے، متنازعہ رقم کا چھے گنا ادا کرنا پڑتا تھا (۱۰۷)۔

ساہوکارہ : آج جب کہ لین دین کے لیے مضروب سکّوں کا عام رواج ہے، ہمارے لیے یہ سمجھنا مشکل ہے، کہ کسی زمانے میں دنیا جہان کی ہر وہ شے جس کی انسان کو ضرورت پیش آسکتی ہے، سکّے کی جگہ استعمال ہوتی تھی۔ کسی کے پاس اناج ہے اور اسے تیل کی ضرورت ہے، تو وہ تھوڑا سا اناج جھولی میں ڈال کر دکاندار کے پاس جاتا اور اس سے اناج کے بدلے میں تیل لے آتا۔ کسی کے پاس روئی ہے اور وہ ترکاری چاہتا، تو روئی دے کر ترکاری لے آتا۔ ہمارے دُور دست دیہات میں، جہاں کی آبادی بیشتر زراعتی پیداوار پر گذارہ کرتی ہے، آج بھی یہ رواج مفقود نہیں، اگرچہ روز بروز کم ہوتا جارہا ہے۔ بابل میں بھی یہی نقشا نظر آتا ہے۔ سکّوں کی جگہ لوگ چاندی استعمال کرتے تھے اور یہی ان کی تجارت کی بنیاد تھی۔ لیکن چیزوں کے تبادلے پر روزمرّہ کی زندگی کا انحصار تھا۔ زمیندار ساہوکار سے ضرورت کے وقت اناج اور تیل لے آتا اور فصل کے موقع پر اسے اپنی پیداوار کی مقررہ مقدار ماپ کر یا تول کر دے دیتا۔ اگر ساہوکار اُسے قبول کرنے سے انکار کرتا تو وہ اسے دوسری جگہ بیچ کر، چاندی ساہوکار کے حوالے کر دیتا یا اس کے بالعکس وہ ساہوکار سے چاندی لیتا اور اس کے عوض میں بھیڑوں کی اُون یا پختہ اینٹیں دے آتا۔ آج ہم اس کا نام تجارت رکھیںگے۔ ایک مال دے رہا ہے، دوسرا اس کے عوض میں دوسری قسم کا مال دے رہا ہے، یہ خرید و فروخت ہے۔ لیکن اُس زمانے میں اسی کا نام ساہوکارہ تھا۔ ایک شخص قرض دے رہا ہے اور دوسرا ادائی کے وقت نہ صرف اصل ہی ادا کریگا، بلکہ اس کے لیے مقررہ سود بھی دیگا۔

سُود : سُود کے خلاف سب سے پہلی باقاعدہ آواز ارسطو نے اپنی کتاب سیاسیات میں اُٹھائی۔ اس کی تائید مذہبی دنیا نے بھی کی۔ یہود کے ہاں، اگرچہ غیروں سے سُود لینے کی اجازت ملتی ہے، لیکن آپس میں صراحت سے اس کی تحریم کا حکم موجود ہے (خروج ۲۲ : ۲۵، احبار، ۲۵ : ۳۵-۳۷، استشناد، ۲۳ : ۱۹-۲۰)۔ انجیل میں بھی ایسا اشارہ

موجود ہے، جس سے سُود کی ممانعت پر استدلال کیا گیا ہے (لوقا، ۶: ۳۵)۔ اسلام نے تو صراحت سے اس کی ممانعت کر دی (البقرہ ۲: ۲۷۵)

بابل میں سود لینا اور دینا معمولی بات تھی اور وہ اُسے بالکل جائز سمجھتے تھے کہ مقروض قرضخواہ کو نہ صرف اصل، بلکہ اس پر سُود بھی ادا کرے۔ ان کے ہاں سکّے نہیں تھے۔ وہ ان کی جگہ چاندی استعمال کرتے تھے۔ اور ملک میں اس کی مقدار بھی زیادہ نہیں تھی۔ عام طور پر ان کا قرض، گندم، جو، تِل وغیرہ کی شکل میں ہوتا تھا اور یہ ایسی چیزیں ہیں، جو بڑھتی ہیں، خدا چاہے، تو ان کے ایک ایک دانے سے سات سات سو دانے پیدا ہو سکتے ہیں۔ پس ان لوگوں نے سوچا کہ اگر ایک من گندم اُدھار لینے والے نے فصل کے موقع پر ایک ہی من واپس کر دی، تو گویا اس نے کچھ بھی نہ دیا کیوں کہ اس ایک من سے اس نے سینکڑوں من غلّہ پیدا کیا ہے۔ لہٰذا اس کا فرض ہے کہ وہ اس اضافہ میں سے کچھ حصّہ اس شخص کو دے دے، جو اس اضافے کا باعث ہوا ہے۔ بابلی زبان میں "سُود" اور "اضافہ" دونوں کے لیے ایک ہی لفظ ہے "سبط" (سبط عربی۔ ہر ایک قسم کی زیادتی)۔ دوسرے معنوں میں مقروض، سُود نہیں ادا کر رہا ہے، بلکہ اپنے اضافے (نفع) کا ایک حصّہ دے رہا ہے۔ یا یوں کہیے کہ قرضخواہ اور مقروض دونوں ایک تجارت میں شریک ہوئے، جس میں سرمایہ قرضخواہ کا ہے اور محنت مقروض کی۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں قرض کی جتنی دستاویزیں بھی ملی ہیں، سُود اُن کا جزو لاینفک ہے۔ سود کی شرح سے متعلق نقد چاندی کی صورت میں ساڑھے ۵ سے ۲۵ فی صد تک اور جنس کی صورت میں ۲۰ سے ۳۳ ۱/۳ فی صدی تک کی مثالیں ملتی ہیں۔

سُود کے خلاف سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ خواہ مقروض کے کاروبار میں کتنا گھاٹا پڑے۔ نفع تو درکنار، اس کا سارا اصل سرمایہ بھی ڈوب جائے، قرضخواہ کو اس سے کوئی سروکار نہیں۔ وہ نہ صرف اپنے اصل زر، بلکہ پورے سُود کا بھی حقدار ہے۔ بابلی قانون پر کم از کم یہ اعتراض وارد نہیں ہوتا۔ جو شخص بیج بوتا ہے، وہ ضرور فصل کاٹیگا۔ اضافہ بہت حد تک اس کی اپنی محنت پر منحصر ہے اور اگر بدقسمتی سے فصل بالکل ہی تباہ ہو جائے اور کوئی پیداوار نہ ہو، تو قانون اسے یہ حق دیتا ہے کہ وہ اس سال قرضخواہ کو سُود نہ

ادا کرے (۴۸)

قرض:

موجودہ قانون کی رو سے قرضخواہ صرف مقروض کی جایداد پر قبضہ کرنے کا مجاز ہے۔ لیکن قدیم قوانین میں ہر جگہ وہ مقروض کی ذات پر بھی قبضہ کرلیتا تھا اور اپنا قرض وصول کرنے کے لیے چاہتا تو اسے بیچ بھی ڈالتا۔ کسی حد تک بابل میں بھی یہی قانون رائج تھا (۵۴)۔ اگر مقروض اپنی آزادی قائم رکھنا چاہتا، تو اپنی بیوی یا بچے کو قرضخواہ کے حوالے کر دیتا کہ وہ اس کی خدمت کریں، اور اس طرح ان کی خدمت کے عوض میں قرض کی رقم ختم ہوجاتی تھی۔ لیکن یہ لوگ قرضخواہ کے غلام نہیں بن جاتے تھے اور نہ وہ انھیں اپنا قرض نقد وصول کرنے کے لیے آگے فروخت ہی کرسکتا تھا۔ مزید یہ کہ تین سال تک خدمت لینے کے بعد وہ انھیں روک بھی نہیں سکتا تھا، چوتھے برس لازماً وہ اپنے خاندان میں واپس آجاتے تھے، خواہ قرض کی رقم پوری ہوئی ہو یا نہیں (۱۱۷)۔ البتہ غلام کی صورت دوسری تھی۔ اگر مالک نے قرض کی ادائی میں غلام دیا ہے، تو قرضخواہ اسے آگے فروخت کرکے اپنا قرض نقد وصول کرلے سکتا ہے (۱۱۸)۔ اس میں بھی ایک شرط تھی کہ اگر یہ غلام، ایسی لونڈی ہے، جس سے مقروض کے اولاد پیدا ہوچکی ہے تو وہ مجبور تھا کہ اس کی قیمت ادا کرکے اسے قرضخواہ کے چنگل سے چھڑائے اور اس کے بعد وہ آزاد کردی جاتی تھی (۱۱۹)۔ اگر کام کی زیادتی یا برے سلوک کے نتیجہ میں مقروض کی بیوی یا بچہ یا غلام قرضخواہ کے ہاں فوت ہوجائے تو مقروض کو حق حاصل تھا کہ وہ مقدمہ دائر کردے۔ اگر اس کا بیٹا فوت ہوا ہے، تو قرضخواہ کا بیٹا قتل کردیا جائیگا (۱۱۶)۔ اس سے گمان گذرتا ہے کہ اگر کوئی رشتہ دار فوت ہوجاتا تو "عین بالعین والسن بالسن" کے اصول پر قرضخواہ کے اسی رشتہ دار کو سزا دی جاتی ہوگی۔ لیکن اگر غلام کی موت ہوجاتی تو قرضخواہ مالک کو ایک تہائی من چاندی ادا کرتا، جو غلام کی اوسط قیمت سے دگنی ہے اور اس کے بعد وہ اپنے قرض کا بقیہ بھی وصول نہیں کرسکتا تھا (۱۱۶)۔ البتہ اگر یہ ثابت ہوجائے کہ موت طبیعی حالات کا نتیجہ تھی تو قرضخواہ اس کے لیے ذمہ دار نہیں تھا۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ خاوند بیوی کو اپنے قرض کی ادائی

کے لیے قرضخواہ کے حوالے کر دے سکتا تھا۔ لیکن بیوی کا یہ حق تھا کہ وہ نکاح کے موقع پر شرط کر لے کہ وہ خاوند کے کسی قرضخواہ کے سپرد نہیں کی جائیگی (۱۵۱)

اگر مقروض زمیندار ہوتا تو قرضخواہ اس کا بیل قرق نہیں کر سکتا تھا، کیوں کہ یہ اس کی معاش کا ذریعہ تھا (۲۴۱) غریب مقروض کو قرضخواہ کی بے ضابطگی اور ظلم سے بچانے کے لیے قانون میں سزا مقرر کر دی گئی ہے (۱۱۳-۱۱۴)

خرید و فروخت :

چیزوں کے لین دین میں بہت احتیاط برتی جاتی تھی۔ کیوں کہ ممکن تھا کہ مال چوری کا ہو۔ اس صورت میں خریدنے والے پر چوری کا شبہہ وارد ہو سکتا تھا یا کسی اور دھوکے ہی کا گمان ہو سکتا تھا۔ اس کا علاج یہ سوچا گیا کہ بالعموم ہر ایک بیع و شرا کی دستاویز لکھ لی جاتی تھی، جس کی رو سے بیچنے والا حلفیہ، مالِ متعلقہ میں اپنے حقوق سے دائمی دست برداری کا اقرار کرتا۔ بعض اوقات مزید اختیاط کے لیے دستاویز ہی میں کسی ضامن کا نام بھی درج کر دیا جاتا جو اس مال پر کسی اور شخص کے دعوے دار ہونے کی صورت میں مشتری کے نقصان کی تلافی کے لیے ذمّہ داری اٹھاتا۔ یہ پیش بندی خاص طور پر زمین اور مکان یا باغ کے بارے میں کی جاتی تھی، کیوں کہ یہ چیزیں مشترکہ جایداد کا حصّہ ہوا کرتی تھیں اور خاندان کا کرتا بھی انھیں فروخت کر کے وارثوں کو ان کے حقوق سے محروم نہیں کر دے سکتا تھا۔ اس لیے غیر منقولہ جایداد کی فروخت کی صورت میں عام طور پر جائز وارث اور حقدار بھی شریک معاملہ کر لیے جاتے تھے تاکہ بعد کو کسی طرح کی پیچیدگی نہ پیدا ہو۔ قیمت کی تعداد وہی جاتی تھی، اگرچہ شاذ و نادر ادھار کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔

بساطی :

ملک کی اندرونی تجارت کا بہت بڑا حصّہ بساطیوں اور پھیری والوں کے ہاتھ میں تھا۔ تھوک فروش تاجر کسی بڑے شہر میں اپنا کاروبار شروع کرتا اور دیہات میں اپنے کاروبار کا جال بچھا دیتا۔ یہ تاجر خود ہر فن مولا شخص ہوتا تھا۔ وہ وقت پڑنے

پر سب کچھ کرنے کو تیار رہتا۔ وہ زمین کی دلالی کا کام کرتا۔ مال اسباب اور اجناس وغیرہ کے لیے تھوک فروش بن جاتا۔ اور سُودی قرض دینے کے لیے ساہوکار یہی صورت کم و بیش بساطی کی بھی تھی۔ وہ گاؤں گاؤں پھر کے تاجر کا مال بھی بیچتا۔ کہیں اسے سستے داموں لونڈی غلام بکتا ہوا مل جاتا، تو اُسے بھی خرید لیتا اور پھر کسی دوسرے گاؤں میں نفع پر بیچ ڈالتا اور کبھی کبھی تاجر اُسے چاندی دے کر کسی دوسرے شہر مال خریدنے کو بھیج دیتا۔ اگر اس کے پاس کافی رقم جمع ہو جاتی تو اس سے، ورنہ چاہے تو کسی دوسرے سے قرض لے کر اپنا ذاتی کاروبار شروع کر دیتا۔ آخری صورت میں وہ تاجر کے ساتھ نفع مقررہ شرح پر تقسیم کر لیتا تھا۔

اندرونِ ملک میں آج بھی حالت کچھ ایسی مختلف نہیں، لیکن ان ایام میں اور زیادہ مشکل رہی ہو گی۔ عموماً لوگ کارواں بنا کے سفر کرتے تھے۔ کارواں کے ساتھ معاً اونٹ کا خیال آتا ہے، لیکن قدیم بابل میں اونٹ بہت کم تھا اور گھوڑا تو بالکل نہیں تھا۔ لوگ یا اپنے سروں پر بوجھ اٹھائے پھرتے تھے یا پھر گدھوں پر بار کیے ہوئے۔ منزل بمنزل کاروانسرائے موجود تھی، جس کے ارد گرد ڈاکوؤں سے بچاؤ کے لیے فصیل ہوتی۔ سفر نہ صرف مشکل ہی تھا بلکہ خطرناک بھی۔ راہزن، دن دہاڑے مسافروں کو لوٹ لیتے۔ قانونِ حمورابی میں (۲۲) سے (۲۴) تک اسی کی طرف اشارہ ہے۔ اگر کوئی بساطی اس طرح لُٹ جاتا، تو قسم اٹھانے پر وہ نقصان کی ذمہ داری سے نلوہ چھوٹ جاتا تھا (۱۰۳)۔

۹۔ عام معاشرت

دنیا کی تمام پرانی تہذیبوں کا کسی نہ کسی دریا سے تعلق رہا ہے۔ دریائے دجلہ و فرات، دریائے نیل، دریائے سندھ، دریائے گنگا و جمنا، دریائے ہوانگ ہو و ینگسی سامنے کی مثالیں ہیں۔ وجہ ظاہر ہے۔ پانی کے بغیر زندگی محال ہے اور ابھی تک قدرتی ذرائع کے سوائے، اس کے حصول کا کوئی اور طریقہ معلوم نہیں ہوا تھا۔ پس، لوگ مجبور تھے

کہ وہ کسی ایسی جگہ آباد ہوں، جہاں سے پانی نزدیک اور سہل الحصول ہو۔ اسی لیے تقریباً سب ملکوں میں نہ صرف بڑے شہر ہی، کسی نہ کسی دریا کے کنارے آباد ہو گئے، بلکہ چھوٹے چھوٹے قصبے اور گاؤں بھی دریا نہیں، تو کسی چھوٹی ندی ہی کے قریب ضرور ہوتے، تاکہ لوگوں کو روزمرہ کے استعمال کے لیے پانی آسانی سے مہیا ہو سکے۔

بابل میں بھی حالت اس سے مختلف نہیں تھی۔ یہاں خوش قسمتی سے دو بڑے بڑے دریا موجود تھے۔ ان کے علاوہ ان کے کئی معاون تھے۔ ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ اس قدرتی فیاضی پر انسانی دماغ نے اضافہ کیا۔ جن مقامات تک دریا یا کسی معاون کا پانی نہیں پہنچتا تھا، وہاں لوگوں نے ان میں سے نہریں نکال کر پہنچا دیا۔ ان نہروں سے نہ صرف کھیتی باڑی ہی میں مدد ملتی تھی، بلکہ لوگ اپنی بیشتر وقت کی گھریلو ضروریات بھی ان سے پوری کرنے لگے۔

سامانِ عمارت :

عراق میں پتھر کہیں نہیں۔ یہ صرف انتہائے شمال کے پہاڑی علاقے میں ملتا ہے اور وہ بھی چونے کا پتھر، جو اتنا سخت اور مضبوط نہیں ہوتا۔ لیکن اس کے مقابلے میں یہاں کی مٹی بہت چکنی ہے۔ یہ جب جم جاتی ہے، تو اس کی پختگی پتھر سے کم نہیں ہوتی۔ اس لیے بابلی معمار نے پتھر کا کام مٹی سے لیا اور مٹی کی کچی اور پکی اینٹیں تعمیر میں استعمال ہونے لگیں۔

پتھر کے علاوہ عراق میں لکڑی بھی نایاب ہے۔ ان شمال پہاڑوں پر بھی جنگل بہت کم ہیں۔ اس لیے تعمیری اور روزمرہ کے کاموں کے لیے عموماً یہ باہر سے درآمد کی جاتی تھی۔ یہ غالباً جنوبی ترکی کے جنگلوں (امانوس) سے آتی تھی۔ اس طرح کہ پہلے اسے وہاں سے میدانِ عمق کے خشکی کے راستے سے دریائے فرات کے شمالی حصے تک گھسیٹ لاتے۔ یہاں یہ دریا میں ڈال دی جاتی، اور اس طرح بتدریج نیچے میدان میں پہنچ جاتی۔

اصولِ تعمیر :

مکان کی تعمیر میں پہلا اور اہم اصول یہ تھا کہ جہاں تک

ممکن ہو، اُسے آئے دن کے سیلاب کے مقابلے کے لائق بنایا جائے۔ اس کی دو ہی صورتیں تھیں کہ یہ بلندی پر ہو اور اس کی دیواریں زیادہ سے زیادہ چوڑی ہوں جو پانی کا ریلا سہ سکیں۔ عام لوگوں کا تو کیا ذکر، بادشاہ بھی جب کوئی محل تعمیر کرتے یا دیوتا کی مورتی نصب کرنے کو مندر کھڑا کرتے، تو خوبصورتی اور ظاہری وضع قطع سے زیادہ وہ اس کی سیلاب کے زمانے میں قوتِ مقاومت کو مدِّنظر رکھتے۔ چنانچہ ایک حکمران فخریہ بیان کرتا ہے، کہ میں نے اپنا محل ''پہاڑ کی طرح مضبوط'' تیار کیا ہے۔

اُور :

۱۹۲۲ء اور ۱۹۲۹ء کے درمیانی زمانے میں اُور کی باقاعدہ کھدائی ہوئی تھی۔ اس میں حضرت ابراہیم علیہ السّلام اور حمورابی کے زمانے کا شہر بھی برآمد ہوا۔ معلوم ہوا کہ اس کی تعمیر میں کسی نقشے اور اصول کا لحاظ نہیں رکھا گیا، بلکہ جیسے کسی نے چاہا، جہاں کہیں خالی جگہ دیکھی، وہاں مکان بنالیا۔ گلیاں کچّی اور عام طور پر تنگ اور ٹیڑھی میڑھی ہیں۔ ناممکن ہے کہ ان میں سے کوئی گاڑی وغیرہ گزر سکے۔ البتہ یہ خیال رکھا گیا ہے کہ گلی کے موڑ پر کے مکانوں کے نکّڑ گول کر دیے گیے ہیں، تاکہ اگر گدھا یا اور جانور بوجھ لے کر گزرے تو سامان وغیرہ کو نقصان نہ پہنچے، اور اگر کوئی آدمی اس پر سوار ہو، تو اُسے زخم نہ آجائے۔

بابل :

اس کے مقابلے میں بابل زیادہ بڑا شہر تھا۔ اس کے گرد اگرد بہت مضبوط فصیل تھی۔ ہیروڈوٹس نے جو حال لکھا ہے (۱: ۱۷۸-۱۷۹) کہ اس کی بیرونی دیوار ۵۳ میل لمبی تھی اور اس میں ایک سو بڑے بڑے پھاٹک تھے، جن کے دروازے پیتل کے بنے تھے اور ان پر پیتل ہی کے چوڑے پترے جڑے تھے، تو اگرچہ اس میں شبہہ نہیں کہ اس میں بہت کچھ مبالغہ ہے، کیونکہ یہاں کی کھدائی سے نہ شہر کا اتنا بڑا رقبہ ثابت ہوتا ہے۔ نہ کوئی ایسا دروازہ ہی نکلا ہے، لیکن یہ بھی واقع ہے کہ ملک کا دارالخلافہ ہونے کے باعث حمورابی کے زمانے میں یہ شہر بہت بارونق ہوگیا تھا۔ اس کی

آبادی میں بھی اضافہ ہو گیا، اور تجارت اور صنعت و حرفت کی ترقّی کے نتیجے میں یہاں مال و دولت کی بھی ریل پیل ہو گئی، اور لوگوں نے بڑے بڑے مکان تعمیر کر لیے تھے۔

نو بخت نصر ثانی (۶۰۴ - ۵۶۱ ق م) نے شہر کی حفاظت کے لیے دو فصیلیں تعمیر کی تھیں۔ ان میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بُرج بنے تھے، جن میں سنتری اور پہرے دار متعیّن تھے۔ شہر کے اندر سڑکیں چوڑی اور نسبتہً خاص نقشے کے مطابق تھیں۔ اگرچہ ابھی تک بیشتر مکان کچّی اینٹوں ہی کے تھے، لیکن اب پکّی اینٹیں بھی عام طور پر استعمال ہونے لگی تھیں۔ اس کے علاوہ روغنی اینٹوں اور مینا کاری کا بھی رواج ہو چلا تھا۔ بابل کے کھنڈروں میں دیواروں پر ان روغنی اینٹوں کی بنی ہوئی شیروں اور بیلوں اور اژدھوں کی تصویریں موجود ہیں۔

گھر کا نقشا:

مکانوں کی بنیادیں ہر جگہ عام طور پر پڑاوے کی پکّی اینٹوں کی ہیں۔ اور یہی ہونا بھی چاہیے تھا۔ ورنہ پانی سے بنیاد کمزور ہو جاتی اور ہمیشہ پوری عمارت کے منہدم ہو جانے کا خطرہ لاحق رہتا۔ اکثر زمین کے اوپر کا کچھ حصّہ بھی انہی پکّی اینٹوں کا ہے۔ اس کے بعد دیوار چھت تک کچّی اینٹ کی ہے اور اس پر سفیدی یا مٹّی کا پلستر کر دیا گیا ہے کہ نچلے حصّے اور اوپر کی دیوار کا فرق ظاہر نہ ہو۔

بالعموم ہر ایک مکان کے ساتھ صحن ضرور ہے۔ مکان چھوٹے بھی ہیں اور بڑے بھی، یک منزلہ بھی اور دو منزلہ بھی۔ دو تین کمرے کے یک منزلہ مکان سے لے کر تیرہ تیرہ چودہ چودہ کمروں تک کے دو منزلہ مکان ملے ہیں۔ صحن میں پکّی اینٹوں کا فرش ہے اور اس کی ڈھلان وسط کی طرف ہے، تاکہ بارش کا پانی دیواروں کے قریب جمع نہ ہو سکے اور یہیں وسط میں اس کے باہر گلی میں جانے کی نالی ہے۔ کمروں کے اندر کچا فرش ہے۔ اس پر مٹّی لیپ دی جاتی ہو گی۔

گلی سے اندر داخل ہوتے ہی پہلے مختصر سی ڈیوڑھی ملتی ہے۔ یہیں ایک لکڑی یا پتھر کی پنالی میں پانی جمع رہتا، جس سے آنے والا ہاتھ مُنھ دھو سکتا تھا۔ یہاں سے

صحن میں راستہ نہ جاتا تھا۔ اُور کے مکانوں میں ایک اور عجیب بات یہ دیکھی، کہ یہاں تمام کمرے صحن میں کھلتے ہیں اور ان میں اندر سے ایک دوسرے کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ اس زمانے کی ایک کہاوت سے یہ خیال ہوتا ہے کہ ان لوگوں کا یہ عقیدہ تھا کہ کمروں میں درمیانی رستہ رکھنا بدبختی کا باعث ہوتا ہے اور اگر ہر ایک کمرہ صحن میں کھلے، تو یہ خوش قسمتی کی نشانی ہے۔ دروازے نیچے تھے اور جھکے بغیر ان میں داخل ہونا ممکن نہیں تھا۔ گلی کی طرف کوئی کھڑکی یا روشندان رکھنے کا رواج نہیں تھا۔ اور جو صحن کی طرف ہیں، وہ بھی کچھ ایسے بڑے نہیں۔ ہم انھیں زیادہ سے زیادہ بڑے سوراخ کہہ سکتے ہیں۔ اور یہ بھی اونچے چھت کے بہت قریب ہیں۔

کئی گھروں میں ایک عبادتگاہ ملتی ہے۔ لوگ شہر کے مندر میں غالباً روزانہ نہیں جاتے ہونگے، یا جو شخص مندر میں نہ جانا چاہتا، وہ گھر ہی پر پُوجا پاٹ کر لیتا ہوگا۔ یہ عبادتگاہ کوئی الگ کمرہ نہیں تھا، بلکہ کسی عام کمرے ہی کے ایک کونے میں ایک اینٹ کا اونچا مختصر سا چبوترہ بنا دیا جاتا۔ اس کے ایک طرف دیوار میں طاقچہ ہوتا، جس میں دیوی دیوتاؤں کی مورتیاں رکھی جاتی تھیں۔ اسی چبوترے کے نیچے قبر نما تہ خانہ ہوتا جس میں گھر کے کسی فرد کے مرنے کے بعد اس کی لاش رکھی جاتی تھی۔

گھروں سے جو بُت برآمد ہوئے ہیں، وہ عام طور پر مقامی مندر کے بتوں ہی کی نقل ہوتے تھے۔ لیکن اگر خاندان کا کوئی آدمی کسی اور خاص دیوی دیوتا کا بھی معتقد ہوتا، تو وہ اس کی مورتی بھی اسی عبادتگاہ میں رکھ دیتا تھا۔ یہ بُت پتھر کے بھی ہوتے تھے اور لکڑی کے بھی۔ اسی طرح کے وہ بُت ہونگے جن کا ذکر عہد نامہ قدیم (پیدائش، ۳۱: ۱۹) میں آیا ہے اور جو حضرت یعقوب کے اپنی سسرال فدان آرام سے کنعان کو روانہ ہوتے وقت، ان کی بیوی راخل نے اپنے باپ لابن کے گھر سے چرائے تھے اور جنھیں بعد کو حضرت یعقوب نے سکم میں شاہ بلوط کے درخت تلے دفن کیا تھا (ایضاً، ۳۵: ۴)۔

آثار قدیمہ میں گھریلو استعمال کی بھی بہت سی چیزیں ملی ہیں۔ مثلاً کھجور اور گھاس پھوس کی چٹائیاں ہیں۔ لوگ انھیں زمین پر بیٹھنے کے وقت استعمال کرتے ہونگے، بلکہ

عین ممکن ہے کہ سوتے بھی انھیں پر ہوں۔ مختلف قسم کے پکّی مٹی اور دھات کے برتن ملے ہیں۔ سکّہ اور تانبا دو دھاتیں عام طور پر استعمال کی جاتی تھیں۔ لوگ پیتل سے بھی واقف تھے۔ لیکن ابھی تک لوہا یہاں نہیں پہنچا تھا۔ سلطنتِ بابل کے زوال کے بعد اسیریا والوں کے ہاں البتہ لوہا ملتا ہے اور نینوا کی کھدائی میں لوہے کی بعض چیزیں بھی دستیاب ہوئی ہیں۔ گھروں سے چکّی کے پاٹ بھی ملے ہیں، جن میں آٹا وغیرہ پیسا جاتا ہوگا۔

لباس۔ زیورات :

لوگ سُومری عہد سے شال کی قسم کا ایک لباس پہنتے تھے۔ یہ کمر کے گرد لپیٹ لیا جاتا اور ٹخنوں تک لٹکتا رہتا تھا بعض اوقات اس کا ایک سرا پیٹھ پر سے کھینچ کر بائیں کندھے کے اوپر سے آگے لے آتے تھے۔ عام لوگ گلے سے ننگے رہتے تھے، لیکن قدیم تصویروں سے پتا چلتا ہے کہ کم از کم امیر طبقہ اوپر بھی ایک چادر سی لپیٹ لیتا تھا۔ یہ دائیں بغل سے نکلتی تھی اور اس سے بایاں شانہ پورے کا پورا ڈھک جاتا تھا۔ بعد کے زمانے میں لوگ قمیص یا کرتے سے ملتا جلتا لباس استعمال کرنے لگے تھے، جس کی باقاعدہ آستینیں ہوتی تھیں، جیسا کہ خود حمورابی کی تصویروں سے بھی ثابت ہوتا ہے۔

سُومری نہ صرف ڈاڑھی اور سر ہی منڈاتے تھے، بلکہ ان کے ہاں چار ابرو کی صفائی کا رواج بھی ملتا ہے۔ اس کے برعکس سامی لوگ داڑھی بڑھاتے اور سر پر پٹّے رکھتے تھے۔ اور غالباً اسی وجہ سے وہ ننگے سر نہیں رہتے تھے اور عام طور پر گول یا نوکدار ٹوپی اوڑھتے تھے۔ یا کم از کم کسی کپڑے کی دھجی ہی سے اپنے بال ضرور باندھ لیتے تھے۔

عورتوں کا لباس اس سے زیادہ مکمل تھا۔ اوّل تو وہ جسم سے کبھی ننگی نہیں رہتی تھی۔ بلکہ امیر گھرانوں میں تو عام لباس کے اوپر بھی چادر کی قسم کی کوئی چیز اوڑھنے کا رواج تھا۔ دوسرے معلوم ہوتا ہے کہ آج کی طرح جب بھی، وہ اپنی زینت و آرائش سے غافل نہیں تھیں۔ اگرچہ مردوں کے گلے میں بھی کنٹھے کی قسم کا زیور ملتا ہے، لیکن غالباً مرد اُسے عام طور پر نہیں پہنتے تھے۔ اس کے برخلاف عورتیں بناؤ سنگار کا زیادہ خیال رکھتی تھیں۔ مختلف جگہوں سے تانبے کے بنے ہوئے آیینے ملے ہیں۔ موچینے بھی استعمال ہوتے تھے۔ وہ آنکھوں

میں کاجل لگاتی تھیں۔ تصویروں اور مقبروں کے باقیات سے معلوم ہوتا ہے، کہ وہ مختلف قسم کے زیور پہنتی تھیں۔ انگوٹھیاں، چوڑیاں، کانوں کی بالیاں اور آویزے، گلے میں پہننے کے مالا اور کنٹھے، بعض سر کے زیور، تعویز اور طلسم، بڑی تعداد میں ملے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اُن کی دل پسند چیزیں تھیں۔ ان کے بنانے میں سونا، چاندی، کانسی، سیپ، موتی لاجورد اور بعض قیمتی پتھر استعمال کیے گئے ہیں۔ یہ چاندی اور تانبا سینا سے اور سونا مدین سے آتے تھے۔

خوراک:

ملک میں جو اور گندم اور تِل عام پیدا ہوتا تھا، بلکہ بعض لوگوں کا تو یہ خیال ہے، کہ گندم سب سے پہلے پیدا ہی اسی خطے میں ہوئی۔ خدا معلوم۔ لیکن بہرحال یہ امر واقع ہے کہ عراق کے بعض حصّوں میں آج بھی گندم خود رَو ہے۔ بعض ماہرینِ زراعت کھجور کا اصلی وطن بھی عراق ہی کو قرار دیتے ہیں۔ لوگ پتھر سے غلّہ پیس کے روٹی پکاتے تھے اور کھجور کھاتے تھے۔ لیکن ایک عجیب بات ہے، کہ گوشت سے زیادہ مچھلی ان کی من بھاتی غذا تھی۔ بالعموم زمیندار اپنی زمین میں تالاب اور جھپڑ بنا کر وہاں مچھلیاں پالتے تھے۔ کم و بیش پچاس قسم کی مچھلیوں کے نام تحریروں میں ملتے ہیں۔

عام طور پر بھیڑ اور بکری دودھ کے لیے پالتے تھے، اگرچہ ان کا گوشت بھی کھایا جاتا تھا۔ سؤر بھی گوشت کے لیے پالے جاتے تھے۔

قانونِ حموربی میں شراب خانوں کا ذکر ہے (۱۰۹)۔ لیکن اس سے کوئی غلط فہمی نہیں ہونا چاہیے۔ یہ شراب انگوری نہیں تھی۔ یوں ملک میں انگور تھا بھی بہت کم اور وہ لوگ اس سے شراب تیار کرنا جانتے بھی نہیں تھے۔ ان کا عام اور دل پسند مشروب جَو کی بیئر تھی۔ کھجور سے وہ تاڑی تیار کرتے تھے، جیسے عبّاسیوں کے زمانے میں بغداد میں نبیذ بننے لگی تھی۔ یہ کام عام طور پر عورتوں کے ذمّے تھا۔ وہ اپنے گھروں میں تیار کرتی اور بیچتی تھیں۔ خال خال کارخانے بھی تھے، جہاں پیشہ ور کشید کرنے والے کام کرتے تھے۔ بیئر کو ذائقہ دار بنانے کے لیے، اس میں تِل اور دارچینی اور بعض اور اشیا بھی ملائی جاتی تھیں۔

حکومت کی طرف سے ان چیزوں کی قیمت مقرر تھی اور دکاندار کو منافع لینے کی ممانعت تھی (۱۰۸، ۱۱۱)۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جن دکانوں پر بیئر یا تاڑی بکتی تھی، وہ بہت بدنام تھیں اور ان کے مالک بھی کوئی اچھی قسم کے لوگ نہیں تھے۔ یہ دکانیں زیادہ تر شہر کے اوباشں اور جرائم پیشہ افراد کے اڈے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ قانون میں حکم ہے کہ اگر مفرور یا باغی یہاں آئیں، تو دکان کے مالک کا فرض ہے کہ انھیں پکڑ کے پولیس کے حوالے کر دے، ورنہ خود اسے سزائے موت دی جائیگی۔

مختلف پیشے

قانونِ حمورابی میں بھی مختلف پیشوں کے نام ملتے ہیں (۲۷۳-۲۷۴) آثارِ قدیمہ جو برآمد ہوئے ہیں، ان سے بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ بیسیوں قسم کے پیشہ ور لوگ سماج میں موجود تھے۔ غالباً حکومت کی طرف سے ان سب کی اُجرت مقرر تھی اور اس سے زیادہ لینا جرم تھا۔ زیادہ مشہور پیشہ ور مندرجہ ذیل تھے:

۱۔ طبیب	۲۔ جرّاح
۳۔ بیطار	۴۔ دایہ
۵۔ جہاز ساز، کشتی ساز	۶۔ جہاز راں، کشتی راں، ملّاح، خلاصی
۷۔ بڑھئی	۸۔ لوہار
۹۔ ٹھٹھیرا	۱۰۔ سُنار
۱۱۔ شراب کشید کرنے والے	۱۲۔ کمہار
۱۳۔ معمار، راج	۱۴۔ سنگ تراش
۱۵۔ بُت تراش	۱۶۔ مُہرکن
۱۷۔ ساز (ستار) بنانے والے	۱۸۔ چمار، موچی
۱۹۔ حجّام، نائی، مشّاطہ	۲۰۔ تیلی
۲۱۔ جلاہا، ندّاف	۲۲۔ گڈریا، چرواہا

۴۳- ماہی گیر　　　۴۴- عرائض نویس، کاتب

کتابیات

1. Cambridge Ancient History I-III (Cambridge: 1923-25)
2. The Civilization of Babylonia and Assyria. Morris Jastrow Jr., (Philadelphia:1917).
3. Mesopotamian Civilization. J. Delaporte (London:1924).
4. The Birth of Civilization in the Near East. Henri Frankfort, (London:1951).
5. The Consecrated Women of the Hammurabi Code. David G.Lyon, (New York:1912).
6. Babylonian Legal and Business Documents from the First Dynasty of Babylon. Arno Poebel, (Philadelphia:1909).
7. Babylonian and Assyrian Laws, Contracts and Letters. C.H.W. Johns, (Edinburgh, 1904).
8. The Oath in Babylonian and Assyrian Literature, S.A.B. Mercer, (Paris:1912).
9. Cylinder Seals. Henri Frankfort, (London:1939).
10. Ur of the Chaldees, Sir Leonard Woolley (Penguin Edition), (London:1940).

چوتھا باب

۱

بابلی مذہب و معتقدات

مآخذ

بابل کے مذہبی معتقدات کے معلوم کرنے کے لیے ہمارے پاس مندرجہ ذیل مآخذ ہیں۔

(۱) دعائیں اور بھجن اور دوسری مذہبی تحریریں۔ ان سے خاص طور پر ان دیوی دیوتاؤں کی خصوصیات معلوم ہوتی ہیں، جن کی شان میں وہ لکھے گئے ہیں۔ نیز ان کے آپس میں تعلقات اور ان کا فرقِ مراتب واضح ہوتا ہے۔

(۲) دیو مالا کے قصّے اور افسانے، جن میں دیوتاؤں کی باہمی کشمکش کا حال بیان ہوا ہے۔

(۳) مختلف مندروں سے بعض ایسی تحریریں دستیاب ہوئی ہیں، جن میں دیوی دیوتاؤں کی فہرستیں درج ہیں۔

(۴) تاریخی کتبے۔ بالعموم ان کے شروع اور آخر میں متعدد دیوی دیوتاؤں کے نام ملتے ہیں۔ مثلاً حمورابی کے قانون کی تمہید اور خاتمے میں کئی معبودوں اور دیوتاؤں کا ذکر ہے، جو اس کے زمانے میں خاص طور پر محلِ عزت و احترام تھے۔ اکثر ان کتبوں کے ساتھ کسی نہ کسی دیوتا کی تصویر بھی ہے، جس میں کوئی مذہبی رسم ادا کی جا رہی ہے۔

(۵) مہریں۔ ان پر بھی دیوتاؤں کی تصویریں اور مذہبی رسوم نقش ہیں۔

(۶) مختلف زمانوں کی تجارتی دستاویزیں، کاروباری معاہدے، وصیتیں، وغیرہ ان کے آخر میں بسا اوقات کسی نہ کسی دیوتا کے نام کی قسم درج ہیں۔

(۷) لوگوں کے نام — ہر ایک زمانے میں انسان اپنی اولاد کے نام، اپنے معبود کے نام پر رکھتا رہا ہے۔ اس سے بھی ان کے معتقدات کا حال معلوم کیا جا سکتا ہے۔

(۸) مندروں کی عمارتوں کی بنیادوں میں ایسے کتبے ملے ہیں، جن سے اس مندر کے دیوی دیوتا کا نام اور اس کی صفات وغیرہ معلوم ہوتی ہیں۔

(۹) قرآن اور تورات میں بعض قدیم مورخوں کے ہاں جو اشارات ملتے ہیں، ان سے بھی ہماری معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔

عقیدۂ شرک :

شروع میں دنیا یقیناً خدائے واحد کی معتقد اور پرستار تھی۔ جوں جوں زمانہ گزرتا گیا، لوگوں کے عقائد میں انحطاط اور ان کی عبادت میں شرک کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ وجہ ظاہر ہے۔ اَن دیکھے خدا پر کامل ایمان، اسی وقت تک رہ سکتا ہے کہ انسان "یومنون بالغیب" کے مصداق یہ ماننے پر تیار ہو کہ دنیا میں کچھ ایسی باتیں بھی ہو سکتی ہیں اور فی الحقیقت ہمیشہ ہوتی ہیں، جو ہماری سمجھ سے بالا ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ ہم انفس و آفاق کا جو فعل بھی دیکھیں، اُس کی کُنہ اور غرض بھی لازمی طور پر ہماری سمجھ میں آجائے۔ خدا پر اعتقاد کو متزلزل کرنے کا سبب شروع سے یہی رہا ہے۔ اور آج بھی صورت اس سے چنداں مختلف نہیں کہ جونہی یہ "عالم"، لوگ خود اپنے وجود یا خارج میں کوئی بات دیکھتے ہیں، تو فوراً اس کے "مادّی" اسباب تلاش کرنے لگتے ہیں۔ جہاں تک یہ معلوم ہو سکے، وہاں تک تو خیر ہے، لیکن جہاں ان کی عقل مزید رہبری سے قاصر رہ جاتی ہے، وہاں بجائے اس کے کہ یہ دیانتداری سے سیدھی طرح، کسی برتر اور عقل و فہم سے بالا ہستی کی مصلحتوں پر ایمان لے آئیں وہ "لاادریت" اور اسی طرح کی دوسری اصطلاحوں کی اُوٹ میں اپنی ضد کا

اظہار کرنے لگتے ہیں۔

اور شروع میں تو یہ "علم" بھی اس حد تک ترقی یافتہ نہیں تھا کہ وہ لوگ ہر ایک بات سے متعلق تحقیق کر سکتے۔ اس وقت تو ہر ایک فعل اور اس کا سبب سب ہی کچھ نامعلوم تھے۔ اس لیے جو بات بھی ان کی سمجھ میں نہ آئی انھوں نے اسے کسی دیوتا سے منسوب کر دیا۔

یہ دیوی دیوتا اور دوسرے "اَرْبَاباً مِّنْ دُوْنِ اللّٰہ" اسی طرح پیدا ہوئے۔ جب کسی نے دیکھا کہ میں نے ہل جوتا، ٹھیک طرح بوائی اور نلائی کی، وقت پر کھیت کو پانی دیا، کھیتی تیار کھڑی تھی اور میں بھائی بندوں اور پاس پڑوس کے دوستوں کو ساتھ لے کر کل اس سب کا کٹنے کا انتظام کر رہا تھا کہ اچانک رات کو دل بادل گھر آئے، موسلا دھار پانی برسا، اولے پڑے اور کھیتی برباد ہو گئی۔ تو اس میں کوئی ایسی بات نہیں تھی، جس کے سمجھنے میں اسے مشکل پیش آتی کیوں کہ بارش اور ژالہ باری بالکل قانونِ قدرت کے مطابق تھی۔ لیکن اس غریب کو اس کا علم نہیں تھا۔ اس نے یہی خیال کیا کہ ہو نہ ہو اس طوفان اور برق و باراں کے لیے کوئی دیوتا ذمہ دار ہے۔ اور اس نے میری تیار فصل اس لیے غارت کر دی ہے کہ وہ مجھ سے ناراض تھا۔ اب وہ آیندہ اس کی ناراضی سے بچنے اور اسے خوش رکھنے کے طریقے سوچنے لگا۔

پھر کسی کا پیارا بچہ، ہنستا کھیلتا باہر گیا، ہمجولیوں کے ساتھ کھیل کود کے گھر واپس آیا۔ اس کے ساتھی تو اسی طرح بھلے چنگے تھے، لیکن وہ بیمار پڑ گیا۔ طبیب نے آ کے دیکھا اور اپنے تجربے کی بنا پر علاج تجویز کیا۔ وہ اس سے پہلے اس بیماری کا علاج کر چکا تھا۔ اور اسی دوا سے وہ مریض تندرست ہو گئے تھے۔ لیکن اب کے اس علاج سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ وہ لڑکا جانبر نہ ہو سکا اور اپنے والدین کو دائمی جدائی کا داغ دے گیا۔ یہ بات سمجھنے کے لیے، خدا اور اس کی مشیت، طبیب کے علم کی، موت کے مقابلے میں بے بسی، موت کا وقتِ معین، وغیرہ کتنی باتوں پر غائبانہ

ایمان کی ضرورت تھی۔ ماں باپ اسے نہ سمجھ سکے اور انھوں نے بچے کی موت کو ایک ظالم دیوتا سے منسوب کر دیا، جو ان سے ناراض تھا۔

بابلی دیوتا :

غرض کچھ اسی طرح کے واقعات تھے جن سے دیوی دیوتاؤں اور ان کے خوش اور ناراض ہونے کا اعتقاد دنیا میں رائج ہوا۔ بابل میں بھی لوگ مذہبی خیالات کے اس مرحلے پر پہنچ چکے تھے۔ اگر دریافت شدہ مذہبی تحریروں اور بھجناولیوں پر انحصار کیا جائے، تو معلوم ہوتا ہے کہ ملک بھر میں ان گنت دیوتا مانے جاتے تھے۔ مثلاً بادشاہ اشور بنی پال (۶۶۸-۶۲۶ ق م) کے کتب خانے سے ایک تحریر ملی ہے۔ یہ کچھ شکستہ حالت میں ہے۔ لیکن جب مکمل ہوگی تو یہ کم از کم گیارہ انچ چوڑی اور ۱۶-انچ لمبی رہی ہوگی۔ اس کے دونوں طرف چھے چھے کالم ہیں، جن میں خفی قلم کی تحریریں ہیں۔ ہر ایک کالم میں کوئی ڈیڑھ سو سطریں ہیں اور ہر ایک سطر میں کسی نہ کسی نئے دیوی دیوتا کا نام ملتا ہے اور یہ صرف ایک تختی کا حال ہے۔

ایک اور مثال ملاحظہ ہو: ایک جرمن مصنف نے ان معبودوں کی فہرست اور ان کی صفات و خصوصیات ہی کے بیان میں خاص ایک کتاب لکھی ہے ۵۔ اس کے (۲۴۹) صفحے ہیں اور مصنف نے کتنے دیوتاؤں کے محض نام دینے پر اکتفا کیا ہے۔ کیوں کہ ان سے متعلق کوئی تفصیل نہ مل سکی۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ بابلی لوگوں کے مذہبی خیالات اور معتقدات اور دیومالا کس حد تک مکمل ہو چکے تھے، اور ایک مختصر تحریر میں ان پر مفصل بحث کرنا کس قدر مشکل کام ہے۔

ہمیں حضرت عیسٰی علیہ السّلام سے پہلے کے تین ساڑھے تین ہزار برس کے لمبے عرصے کے بابلی معتقدات معلوم ہیں۔ ان کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ ان میں کامل تسلسل ہے۔ نہ کہیں سے یہ لڑی ٹوٹتی ہے، نہ اس میں کوئی اچانک تبدیلی دکھائی

---

۵ Akkadische Gotterepitheta by K. Tallqirst (Leipzig, 1938)

دیتی ہے۔ وہی دیوتا جنھیں سُومری پوجتے تھے، وہی بابلی عہد میں بھی لوگوں کے معبود رہے۔ مندروں کی ظاہری ساخت اور پوجا پاٹ کے طریقے بھی ایک سے رہے۔ بلکہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ دیوی دیوتا بھی اس تمام زمانے میں وہی کے وہی رہے اور ان میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ سوائے اس کے کہ بعض سیاسی تبدیلیوں کے ساتھ کچھ دیوتا خاص اہمیت اختیار کر گئے اور دوسرے کمتر درجے پر رکھ دیے گئے یا کسی دیوتا کو ایسی طاقت دے دی گئی، جو اس سے پہلے اس سے منسوب نہیں تھی۔

سب سے پہلی یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ یہ دیوی دیوتا فوق الانسان بلکہ فوق الفطرت ہستیاں تھیں اور وہ نظروں سے اوجھل رہتے تھے۔ اگرچہ ہر ایک دیوتا کی اپنی خاص شخصیت اور صفات تھیں، لیکن "تراشیدم صنم بر صورتِ خویش" کے مصداق یہ سب انسانی شکل وصورت کے تھے۔ وہ بھی عام انسانوں کی طرح ڈاڑھی بڑھاتے اور گھاگرے کی طرح کا لباس پہنتے تھے۔ نہ صرف ظاہری وضع قطع ہی میں، بلکہ وہ سوچنے اور کام بھی گوشت پوست کے عام انسانوں ہی کے سے کرتے تھے۔ وہ پیدا ہوتے، محبت کرتے، بیویاں رکھتے اور اولاد پیدا کرتے تھے۔ اقتدار کے حصول کے لیے ان میں آپس میں خون خرابہ بھی ہوتا تھا اور پھر وہ مر بھی جاتے تھے۔ بات اصل میں یہ ہے کہ بابلیوں کی ساری دنیا مشاہدات پر مبنی تھی، وہ کسی دقیق اور فلسفیانہ خیال آرائی کے قائل نہیں تھے۔ اور غالباً اس کے قابل بھی نہیں تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب انھوں نے عبادت کے لیے اپنے آپ سے کسی بلند ہستی کی تخلیق کی، تو وہ اس کی ہیئت، شخصیت، صفات، امیال وعواطف، کسی چیز میں بھی انسانی سطح سے اوپر نہیں اُٹھ سکے کیوں کہ یہی ان کا روزمرہ کا تجربہ اور مشاہدہ تھا۔ ان کے دیوتا اور خود ان میں بس اتنا فرق تھا، کہ وہ ان سے زیادہ طاقتور اور زیادہ عقلمند تھے۔ اور غیر مرئی بھی۔ اگر ہم وہ افسانے پڑھیں، جن میں انھوں نے بعض دیوتاؤں

کے کارنامے بیان کیے ہیں، تو ان کی شجاعت اور تہوّر، مکّاری اور عیّاری، خوف اور طمع کے واقعات سے بعض پورانوں کے قصّے یاد آجاتے ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ یہ سب دیوتا قدرتی مظاہر کے نمایندے تھے۔ لوگوں نے جو کچھ اپنے اردگرد ہوتے دیکھا، اس کی تعبیر وہ اس سے بہتر نہیں کرسکے کہ یہ سب مختلف دیوتاؤں کی کارگزاریاں ہیں۔ ان کے عقیدے کی بنیاد اس اصول پر تھی کہ حیات اور قوت دونوں لازم ملزوم چیزیں ہیں۔ یعنی جہاں زندگی ہے، وہاں طاقت ہے، اور جس چیز میں طاقت ہے، اس میں ضرور زندگی بھی ہے۔ قدرتی طور پر سورج اور چاند طاقت کے سب سے بڑے اور نمایاں وجود تھے۔ انھوں نے ہر صبح سورج چڑھتے اور ہر شام اسے ڈوبتے دیکھا۔ چاند کا گھٹنا بڑھنا ملاحظہ کیا۔ پھر ستاروں کے نظارے دیکھے، جو رات کے اندھیرے میں ان کے سفر کے ساتھی تھے۔ انھوں نے تجربے سے معلوم کیا کہ کھیتی کی نشوونما کے لیے بارش کی ضرورت ہے۔ اور اس کے پکنے کے لیے سورج اور دھوپ کی۔ قدرتی طور پر وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ نہ صرف سورج اور چاند اور ستاروں میں زندگی ہے، بلکہ سب درختوں اور پودوں میں بھی۔ جو خزاں کے آتے ہی مرجھا جاتے اور بہار کے ساتھ دوبارہ زندہ ہوجاتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی انھوں نے طوفان و سیلاب اور رعد و برق کی تباہ کاریوں کا بھی مزہ چکھا تو انھوں نے ان سب باتوں کو کسی قانونِ قدرت کا نتیجہ قرار دینے کی بجائے اسے مختلف دیوتاؤں کی وقتی خوشنودی اور ناراضی پر محمول کردیا۔ دیوتا، جو انھی کے سے دل و دماغ کی ہستیاں تھیں، انھی کی طرح سوچنے اور کام کرنے تھے۔ انھی کی طرح بعض باتوں سے خوش اور بعض سے ناراض ہوتے تھے۔ اس لیے وہ سوچنے لگے کہ ہم کیسے ان کے قہر و غضب سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔

ان تمام دیوی دیوتاؤں میں دو گروہ بہت اہم اور قابل ذکر ہیں:

تثلیثِ اوّل :

اس پہلے گروہ میں تین دیوتا (۱) اَنُو (۲) اَنلیل اور (۳) اَنکی تھے۔ یہ تریموُرتی بہت پرانی ہے۔ یعنی سُومریوں کے ہاں بھی اس کے آثار ملتے ہیں اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ بابلیوں نے انہی کی پیروی میں اسے اپنا لیا اور اس کی پرستش کرنے لگے۔

(۱) اَنُو۔ سُومری زبان میں اَنُو کے معنیٰ آسمان کے ہیں۔ اگرچہ سُومری عہد کی ابتدا میں اَنُو سے متعلق کچھ زیادہ تفصیل نہیں ملتی، لیکن دوسرے ہزار قبلِ مسیح کے آغاز کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت اَنُو سب دیوتاؤں کا صدر نشین مان لیا گیا تھا، کیوں کہ کئی بھجنوں میں اسے دیوتاؤں کا باپ اور بادشاہ کہا گیا ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ مذہب کا رجحان روز بروز ستارہ پرستی کی طرف بڑھتا جارہا تھا۔ یہ پہلے تسلیم کر لیا گیا تھا کہ اَنُو، آسمان کا حکمران ہے۔ اس لیے جب سورج اور چاند اور دوسرے ستاروں کی پرستش شروع ہوئی جو سب کے سب آسمان میں دکھائی دیتے تھے، تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ انھیں اَنُو کی اولاد اور اس کی رعایا قبول کرنا پڑا۔ لیکن یہ بھی واقع ہے کہ مذہبی رسوم یا پوجا پاٹ میں اَنُو بہت کم دکھائی دیتا ہے، نہ اس کی مدح کے بھجن ہی زیادہ تعداد میں ملے ہیں۔

اَنُو کا باپ اَپسو (انگریزی۔) یعنی گہرا سمندر تھا اور اس کی ماں تیامت (ابتدائے آفرینش کی ہل چل)۔ آسمان کا وسطی دائرہ (خط استوا) اَنُو کی سکونت کے لیے مخصوص تھا۔

ابتدائی زمانے میں اس کی بیوی کا نام انتی یا انتو (بمعنی زمین) ملتا ہے، جس سے متعلق کوئی مذہبی رسم نہیں تھی۔ لیکن بعد کو مشہور دیوی عشتار (زُہرہ) نے انتو کو نکال باہر کیا اور خود اس کی سیج کی مالک بن گئی۔ وہ تین سو دیوتا جو تحت الثریٰ کے خطۂ انونا کی میں رہتے تھے، اور ان کے علاوہ مشہور سات بدروحیں

(اسکی) سب انو اور انتو ہی کی اولاد تھے۔

شروع میں انو کی پوجا دیر کے مندر میں ہوتی رہی، بلکہ دیر کا نام ہی "انو کا شہر" تھا۔ ابھی تک دیر کا محلِ وقوع ٹھیک طور پر متعین نہیں ہو سکا۔ لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شہر بغداد کے مشرق میں کہیں ۳۰-۴۰ میل کے فاصلے پر تھا۔ اس کے علاوہ انو کے نام کے مندر اُور، اریخ، نِفر، اور لاغاش میں بھی تھے۔ بابل میں اس کی عبادت نتی دیوتا ہی کے مندر میں ہوتی تھی۔ لوگوں کے دل میں انو کا عام تصور یہ تھا، کہ وہ عوام النّاس کا نہیں، بلکہ بادشاہوں اور شاہزادوں کا سرپرست ہے۔ اسی لیے کئی کتبوں میں لکھنے والے بادشاہ اپنے آپ کو "انو کا محبوب" لکھتے ہیں۔

(۲) اِنلیل ۔ یہ دوسرا اقنوم، آندھی یا طوفان کا دیوتا تھا۔ اس کی دوہری حیثیت تھی۔ روایت کے مطابق "طوفانِ عظیم" اسی نے برپا کیا تھا۔ چنانچہ جب ایک آدمی اس طوفان سے بچ کے نکل گیا، تو وہ اس پر بہت پیچ و تاب کا اظہار کرتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بنی آدم کا مخالف تھا۔ اس کے برخلاف کچھ روایات میں اسے "خالقِ بنی نوع انسان" بھی دکھایا گیا ہے اور اس زمانے کے بعض آدمیوں کے اس طرح کے نام بھی ملے ہیں مثلاً "انلیل ناری" (انلیل میرا ناصر ہے) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انلیل کی ہستی دوگانہ بلکہ متضاد صفات کی حامل تھی۔ وہ انسانی نسل کا دشمن بھی ہے اور دوست بھی۔ وہ اس کا استیصال بھی کرنا چاہتا ہے اور اس کا حامی بھی ہے۔

اِنلیل کی سب سے اہم خصوصیت یہ تھی کہ مخلوقات کی قسمت کے نوشتے (الواحِ محفوظ) اس کی تحویل میں تھے جس سے اسے تمام مخلوق، جاندار اور بے جان کے نصیبے اور موت و حیات پر پورا پورا اقتدار حاصل ہو گیا۔ کسی چیز کا مقسوم طے کرنے کے یہ معنیٰ تھے کہ وہ مخلوقات میں کس جگہ اور کس حیثیت سے رہیگی۔ دیومالا کے ایک پرانے افسانے میں ہے کہ طوفانی پرندے زو نے یہ الواح چرالی تھیں۔

پھر اِنلیل نے بڑی جان جوکھم سے انھیں دوبارہ حاصل کیا۔ بعض مہروں پر اس واقعے کی تصویر بھی ملتی ہے۔ یعنی زو (آدھا انسان، آدھا پرندہ) اپنے جرم کی سزا کا فیصلہ سننے کے لیے قیدی کی طرح اِنلیل کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے۔

اِنلیل کی عبادت کا خاص شہر نِفّر تھا۔ اس کے مندر کو ای کور کہتے تھے (ای، گھر یا مکان اور کور، پہاڑی یعنی بیت الجبل)۔ اس مندر کی وجہ سے نفّر کی اہمیّت خاص طور پر بڑھ گئی۔ لوگ دور دور سے محض اس مندر کی زیارت کے لیے یہاں آتے۔ بالکل اسی طرح جیسے آج کل مکّہ یا بنارس، روما یا یروشلم جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ جب اس شہر کی سیاسی طاقت میں زوال آگیا، تو بھی اس کی مذہبی حیثیت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ بلکہ آخری زمانے میں تو مندر کے اردگرد کی زمین اس حد تک مقدّس خیال کی جاتی تھی کہ معتقدین یہاں دفن ہونے کو ترجیح دیتے تھے۔ جس طرح آج شیعی لوگ اپنی میّتوں کو نجف اشرف اور کربلائے معلیٰ دفن کرنے کو بھیج دیتے ہیں، اسی طرح بابلی، اپنے مردوں کو اِنلیل کے مندر کے احاطے میں دفن کرنے کے لیے بھیجتے تھے۔

اِنلیل کی بیوی کا نام نِن لیل تھا، اور اس کا مشیرِ اعلیٰ یا وزیرِ اعظم نُسک دیوتا (عربی نُسک۔ آگ) تھا۔ اس کے علاوہ اور بہت سے چھوٹے درجے کے دیوتا بھی اس کے حاشیہ میں تھے۔ جن کے ذمّہ معمولی معمولی عہدے تھے۔ مثلاً وہ دربان، باورچی، چوپان، ایلچی، وغیرہ کے فرائض سر انجام دیتے تھے۔

آسمان پر کہکشاں کا خط انلیل کی سکونت کے لیے مخصوص تھا۔

(۳) انکی — یہ اس تثلیث کا تیسرا اقنوم ہے۔ اسی کا نام بعد میں اِیا قرار پایا تھا۔ جیسے اُنو آسمانوں کا دیوتا تھا اور اِنلیل زمینوں کا۔ اسی طرح انکی کا دور دورہ پانیوں پر تھا۔ یہ پہلے صرف خلیج فارس کا دیوتا تھا، لیکن بعد کو تمام سمندروں کی قلمرو اس کے سپرد کر دی گئی کیوں کہ بابلیوں کی نظر میں خلیجِ فارس ہی سب سے بڑا سمندر تھا۔

انکی کو بالعموم "عقل و دانش کا دیوتا" کہتے تھے کیوں کہ وہی تمام علوم و فنون (اور جادو ٹونے کا بھی) موجد خیال کیا جاتا تھا۔ اُسی نے انسانوں کو لکھنا پڑھنا، عمارتیں بنانا، کھیتی باڑی کرنا سکھایا۔ چوں کہ بیماریوں کے علاج میں پانی پر دم کر کے جھاڑ پھونک کرتے تھے اور پانی ہی پر انکی کی سلطنت تھی، اس لیے اس طرح کے تمام عملیات میں اسی کی برکت اور نصرت طلب کی جاتی تھی بلکہ اسی کو ہر طرح کے "سحر کا دیوتا" بھی کہتے تھے۔

جیسا کہ بیان ہوا۔ آنو اور اِنلِیل دونوں عام طور پر بنی نوعِ انسان کے دوست نہیں خیال کیے جاتے تھے۔ ان کے مقابلے میں انکی خاص طور پر انسانوں پر مہربان گنا جاتا تھا۔ انسانی زندگی میں پانی جتنا مفید ہے اور اس کے بغیر جو مشکلات پیش آسکتی ہیں، وہ کسی سے مخفی نہیں۔ اسی لیے انکی (ایا) خصوصاً انسانوں کا حامی اور ولی قرار پایا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ طوفان کی روایت میں اسی نے اُت نا پشتم (نوح) کو طوفان سے بچنے کے لیے کشتی تیار کرنے کا مشورہ دیا تھا۔

قدرتی طور پر انکی کی پرستش کا مرکز اَرِیدو تھا، جو انتہائے جنوب میں خلیج فارس کے کنارے پر بابل کی سب سے بڑی بندرگاہ تھی۔ انکی کا خاص رفیق دیوتا ممو تھا جو کاریگروں اور دستکاروں کا سرپرست اور مربّی خیال کیا جاتا تھا۔ انکی کی بیوی کا نام دامکن تھا اور مردوخ ان کا بیٹا تھا۔

جھاڑ پھونک کے منتروں میں انکی اور مردوخ عموماً ایک دوسرے کے معاون ظاہر کیے گئے ہیں مثلاً جب کبھی مردوخ اپنے والد بزرگوار انکی سے مشورہ کرنے جاتا ہے، تو اس کے جواب میں اکثر یہ لفظ ملتے ہیں "میرے بیٹے، تم خود کونسی بات نہیں جانتے؟ میں اور کیا تمھیں بتاؤں؟"، یا "مردوخ، تم کیا نہیں جانتے؟ میں تمھارے علم میں کیا اضافہ کرسکتا ہوں؟"، یا "جو کچھ میں جانتا ہوں، وہ تمھیں معلوم ہی ہے" وغیرہ۔

پرانی تحریروں میں اس ترمورتی کے ساتھ ایک دیوی کا نام بھی ملتا ہے،

جسے کبھی نن مخ کہتے ہیں۔ کبھی ننتو، کبھی نن خرسج یا اُرُوُرو۔ اسی طرح اس کے (اہم) مختلف نام بیان ہوئے ہیں۔ جو سب کے سب صفاتی ہیں۔ ان میں قدرِ مشترک یہ ہے کہ وہ زمین کی طرح کسی نہ کسی شکل میں سیرحاصلی اور زرخیزی کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ چنانچہ اس دیوی کے فرائض میں زچگی بھی شامل تھی۔ اور انلیل اور انکی کے ساتھ انسانوں کی تخلیق میں وہ بھی برابر کی شریک تھی۔

تثلیثِ ثانی :

اس کے بعد خاص بابلی عہد میں ایک دوسری تثلیث ظاہر ہوئی۔ یہ بھی تین دیوتاؤں اور ایک دیوی پر مشتمل تھی: دیوتا سن (چاند)، شمس (سورج)، اور اداد (طوفان، برق و باراں) تھے اور دیوی عشتار (زہرہ) تھی۔

(۱) سن: چاند دیوتا قدیم زمانے میں بھی بہت اہم تھا اور اس کی یہ اہمیت آخر تک قائم رہی۔ اس کا سومری نام ننّر تھا (عربی منور، قمر)۔ سومری میں یہ نام (ان-زو) بلکہ بعض جگہ (زو-ان) بھی لکھا ملا ہے (ان-صاحب اور زو-علم یعنی صاحبِ علم) سن (سی-ان) اسی (ان-زو) کی اُلٹی شکل ہے ٭ یہی اس کی دو اہم صفات ہیں یعنی نور اور علم۔ اور تمام مناجاتوں میں اس کی انہی دونوں خصوصیتوں کی تعریف کی گئی ہے۔ ان میں اسے بالعموم انلیل کا بیٹا بلکہ پلوٹھا کہا گیا ہے۔

چاند کے گھٹنے بڑھنے کو بہت اہمیت دی جاتی تھی۔ لوگ اندھیرے دنوں کو

٭ اس طرح کی تقلیب کی مثالیں بہت ہیں۔ مثلاً عربی کا لفظ راس لیجیے۔ یہ جب دنیا کی دوسری زبانوں میں گیا، تو اسے الٹ دیا گیا۔ اگرچہ اس کے معنوں میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ سر (بمعنی سر) سیزر، قیصر، کسریٰ، زار، سب اسی لفظ کی مختلف شکلیں ہیں۔ جرمن کا ہر بھی یہی سر ہے، جس میں (س) کی جگہ (ہ) نے لے لی ہے (کیوں کہ س اور ہ بھی ایک دوسرے سے بدل جاتی ہیں، سند اور ہند سامنے کی مثال ہے)۔ البتہ حبشہ کی زبان (امہری) میں راس جوں کا توں رہا۔

بہت بُرا اور منحوس سمجھتے تھے۔ عام خیال یہ تھا کہ ان ایام میں بد روحیں اپنے مخفی مقام سے باہر نکل آتی اور خاص طور پر خطرناک اور ضرر رساں ہوتی ہیں۔ دوسری قوموں کی طرح بابل میں بھی قمری سال کا رواج تھا۔ اور سِن کو تقویم کا دیوتا مانا جاتا تھا۔ دن، مہینے اور سال اسی کے معیّن کیے ہوئے ہیں۔

اس کے دو مندر خاص طور پر مشہور تھے، ایک جنوب میں اُور میں تھا اور دوسرا شمال میں حرّان میں۔ اس کی بیوی کا نام ننِ جل تھا۔ سورج اُنہی دونوں کا بیٹا تھا۔

(۲) شمس۔ تمام مشرقی روایات میں پہلے رات ہے اور دن بعد کو آتا ہے۔ بابلیوں نے بھی اسی لیے سورج کو چاند کا بیٹا قرار دیا۔ سِن کی طرح شمس بھی عربی لفظ ہے۔ سُومری میں اسے بَبّر یا اُتُو کہتے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں کی پوجا عام طور پر سامی عہد میں شروع ہوئی۔

پرانی تصویروں میں سورج بالعموم کسی پہاڑی کے پیچھے سے اُبھرتا دکھایا گیا ہے، جب کہ روشنی اس کے شانوں سے چھن چھن کے نکل رہی ہے۔ سورج دیوتا قانون اور انصاف اور راستی کا حامی یقین کیا جاتا تھا۔ اس کا باعث غالباً یہ ہوگا کہ جب سورج نکل آتا ہے، تو کوئی چیز اندھیرے میں یا پوشیدہ نہیں رہتی اور اس کی روشنی میں انسان کو اپنی راہ ڈھونڈنے میں کوئی دقّت پیش نہیں آتی۔ قانونِ حمورابی جس کھمبے پر کندہ ہے، اس کی پیشانی پر سورج دیوتا ایک کرسی پر بیٹھا دکھایا گیا ہے اور حمورابی سامنے کھڑا اس سے قانون لے رہا ہے۔

شمس کی پوجا کے خاص شہر شمال میں سپارہ اور جنوب میں لارسہ تھے۔ بعد کو اسیریا میں سِن اور شمس دونوں باپ بیٹوں کی اشور کے ایک ہی مندر میں عبادت ہوتی رہی۔

شروع میں شمسی صفات کے اور بھی بہت سے معبود تھے، جو بعد کو اسی میں مدغم ہو گئے۔ مثلاً ننیب ـــــ ہے۔ اس کا مندر بھی سپارہ میں تھا۔ شمس کے اہمیت اختیار کر جانے پر اگرچہ ننیب کو اسی کے مندر میں نسبتاً کمتر جگہ دے دی۔

گئی، لیکن اس کے باوجود وہ سورج ہی کا مظہر رہا۔ اسی طرح نرجل بھی شمسی صفات کا دیوتا ہے۔ ان تینوں کی مدح اور مناجات میں بھجن ملتے ہیں۔ بعد کو ان سب کو ایک سلسلے میں اس طرح منسلک کیا گیا کہ شمس تو سورج کا عام عَلَم ہے، ننیک اس سورج کے لیے استعمال ہونے لگا، جو بہار کے موسم میں ہوتا ہے جب سبزی اُگتی ہے، پھول کھلتے ہیں، سردی ختم ہو جاتی ہے اور ہر طرف نئی زندگی کے آثار نظر آنے لگتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں نرجل سورج کی جلالی شان کا مظہر قرار پایا۔ نرجل کسی زمانے میں جنوبی بابل کی شہری ریاست کوتہ کا مقامی معبود تھا۔ اب اسے تباہی اور جنگ کا دیوتا تسلیم کر لیا گیا۔ اگرچہ فتح اسی کے کرم پر موقوف تھی، لیکن موت اور بیماریاں بھی اسی کی حاشیہ بردار تھیں۔

(۳) اَداد — یہ اس تثلیث کا اقنوم ثالث ہے۔ تصویروں میں اس کے ایک ہاتھ میں برق ہوتی ہے اور دوسرے میں رعد۔ یہ دراصل برق و باراں اور طوفان کا دیوتا تھا، اور اس پہلو سے گویا یہ پہلی تثلیث کے اِنلیل دیوتا کا مدِمقابل ہے۔ طوفانِ عظیم کی روایت میں جب دیوتاؤں نے دنیا میں طوفان برپا کرنے کا فیصلہ کیا ہے، تو اس حکم کے نافذ کرنے کا فرض اداد ہی پر عاید کیا گیا تھا۔

چونکہ برسات کی کثرت اور بجلی کھیتوں اور آدمیوں کی موت اور تباہی کا باعث ہو سکتی ہے، اس لیے امیر اور غریب، شاہ اور رعایا، سب اس سے ڈرتے اور اسے خوش رکھنے کے خواہشمند رہتے تھے۔

اس کے علاوہ اَداد کے کردار کا ایک اور پہلو بھی ہے۔ سورج کی طرح یہ بھی جوتشیوں اور غیب دانوں کا دیوتا تھا۔ جس طرح اجرامِ فلکی۔ چاند، ستاروں وغیرہ۔ کا مطالعہ جوتشیوں کا فرض تھا، اسی طرح طوفان، بادل، بارش، کڑک، بجلی، زلزلہ وغیرہ کی بنا پر بھی وہ افراد اور ملک کی قسمت سے متعلق حکم لگاتے تھے۔ اور یہ سب چیزیں شمس اور اَداد ہی سے متعلق تھیں۔

اَداد کے مندر بابل اور یورسبا میں تھے۔ اس کے علاوہ اس کی پوجا کے

نشان ایشیائے کوچک کے دوسرے ملکوں مثلاً شام، فلسطین وغیرہ میں بھی ملتے ہیں۔ حِتّیوں کے ہاں یہ تشرب کے نام سے موسوم تھا۔ شام میں اسے رشپ اور حداد کہتے تھے۔ تورات میں جہاں اموّن کا ذکر آیا ہے (مثلاً سلاطین دوم، ۵:۱۸ وغیرہ) وہاں اسی دیوتا کی طرف اشارہ مقصود ہے۔

اس تِرموَرتی کی دیوی عِشتار ہے۔ اگرچہ یہ اس دوسری تثلیث سے متعلق ہے۔ لیکن جیسا کہ اوپر بیان ہوا، اس نے پہلی تثلیث کے انو دیوتا کی بیوی کو بیدخل کرکے خود اس کی جگہ پر قبضہ جما لیا تھا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے، کہ گو اسے خاص اہمیت بعد کے زمانے میں حاصل ہوئی، اس کی پرستش بہت قدیم سے ہو رہی تھی۔

چوں کہ عورت کے بغیر مرد کی زندگی نہ تو مکمّل کہی جا سکتی تھی، نہ اس کے تمام تخلیقی قوا ہی پورے طور پر کام کر سکتے تھے، اس لیے ہر ایک دیوتا کے ساتھ بھی کوئی نہ کوئی دیوی اس کی بیوی کی حیثیت سے وابستہ کر دی گئی تھی۔ لیکن ان میں سے کسی بھاگوان کی بھی اپنی کوئی آزادانہ ہستی نہیں، نہ کسی کی کہیں الگ سے عبادت ہی ہوتی تھی۔ اس کلیّہ سے اگر مستثنیٰ ہے، تو صرف ایک عِشتار۔ اور یہ بھی دراصل اس لیے کہ اسے ہر طرح کی روئیدگی اور افزائشِ نسل کی دیوی کا مقام دے دیا گیا تھا۔ رفتہ رفتہ تمام دوسری دیویوں کی خصوصیات بھی اسی سے منسوب کر دی گئیں اور دیوی کا عَلَم گویا اس سے مخصوص ہو کے رہ گیا، یعنی جہاں آپ نے دیوی کا لفظ کہا، سامع اس سے عِشتار ہی مراد لیتا تھا۔

یہ سِن کی بیٹی تصوّر کی جاتی تھی اور اجرامِ فلکی میں زہرہ ستارہ خاص طور پر اسی سے منسوب ہوتا تھا۔ بابلی دیو مالا میں شاید ہی کوئی ایسا افسانہ ہوگا جس میں عِشتار کا نام نہ ملتا ہو۔ لیکن اس کی ہستی کچھ عجیب مجموعۂ اضداد ہے۔ وہ ایک طرف عشق و محبّت اور افزائشِ نسل کی دیوی ہے تو دوسری طرف جنگ کی بھی (خاص طور پر اسیریا میں)، چنانچہ اس کی اس مؤخر الذکر حیثیت کی جو تصویریں دستیاب ہوئی ہیں، ان میں وہ تیر کمان اور ترکش سے لیس، اچھّی خاصی اوپچی بنی ہوئی ہے۔

حمورابی نے بھی اپنے قانون کی تمہید میں اس کی اس صفت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ لکھتا ہے۔

"دشمنوں کا قلع قمع کرنے والا، جس نے نینوا کے اِس مشمش مندر میں عِشتار کا نام چمکایا ہے۔"

یہ اس لیے کہ دشمنوں کا قلع قمع کرنے کے لیے عِشتار کی (بحیثیت جنگ کی دیوی کے) مدد کی ضرورت تھی۔

اگرچہ شروع میں اس کا بڑا مندر اریخ میں تھا، لیکن جیسا کہ امید کی جا سکتی ہے اپنی خاص صفات کے باعث بعد کو اس کی پوجا بہت عام ہوگئی تھی، اور ملک کے مختلف حصّوں میں متعدّد مندر اس سے منسوب ہوگئے، جہاں اس کی مورتی نصب تھی۔ اشور بابل، قلعہ، اُور، نینوا، اربیل، ان میں سے خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ چوں کہ وہ پیدائشِ اولاد کی وجہ سے (دیوی ماتا) مانی جاتی تھی، اس لیے ہر جگہ عشّاق اور عورتیں جوق در جوق اس پر چڑھاوے چڑھاتے تھے۔ دیوداسیاں سب سے زیادہ اسی کے مندروں میں رہتی تھیں، جن کے رنگین افسانے ہیروڈوٹس نے بھی بیان کیے ہیں (۱: ۹۹)۔

ان کے علاوہ بعض اور دیوتاؤں کا ذکر بھی ناگزیر ہے:

تمّوز:

سب سے پہلے تمّوز ہے۔ اس کے تفصیلی حالات معلوم نہیں لیکن یہ اس لحاظ سے بہت دلچسپ ہے کہ بابل کے اردگرد کے خطّوں نے بھی اسے کسی نہ کسی شکل میں مستعار لے لیا تھا۔ شام میں ادونس کے نام سے اس کی پوجا ہوتی رہی۔ بلکہ اسرائیلیوں کے ہاں بھی چھٹی صدی ق م تک عورتیں اس کے لیے بین کرتی رہیں (حزقیال ۸: ۱۴)۔ یہ دراصل فصلِ ربیع (بہار) کا دیوتا تھا۔ جب خزاں اور جاڑے کے آتے ہی پت جھڑ شروع ہوجاتی اور تمام سبزی مرجھا جاتی، تو خیال کیا جاتا کہ دیوتا مرگیا یا کہیں پاتال میں چلا گیا ہے۔ پھر بہار کے زمانے میں، جب ہر طرف ہریاول نظر آنے لگتی

اور باغ وراغ پر تروتازگی آجاتی، تو لوگ سمجھتے کہ وہ دوبارہ زندہ ہوگیا ہے۔ چنانچہ ایک روایت کے مطابق جب تموز مر جاتا ہے، تو عشتار دیوی (جس کا وہ بیک وقت بھائی بھی ہے اور شوہر بھی) اس کے لیے بہت جزع فزع کرتی ہے، اور اس کی تلاش میں پاتال تک جاتی ہے۔ جب بہار کے آغاز میں دونوں واپس آتے ہیں، تو دنیا کے لوگ بہت خوشیاں مناتے ہیں۔ کیوں کہ ان کے آنے سے سبزی ترکاری اور اناج غلہ پیدا ہوتا ہے اور نسل بڑھتی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ تموز کا تعلق زراعت سے تھا۔

نرجل =

بیماریوں اور علتوں کے لانے والے دیوتاؤں میں نرجل سب سے بڑا تھا۔ دیومالا میں ہے کہ رشکی جل دیوی پاتال کی صاحب اقتدار ملکہ تھی۔ ایک مرتبہ اس نے اپنے ایلچی نامتر کو کوئی پیغام دے کر دیوتاؤں کی سبھا میں بھیجا۔ نامتر کے پہنچنے پر اور سب دیوتا تو اس کی پذیرائی کے لیے کھڑے ہوگئے، لیکن نرجل نے اس کی پروا نہ کی اور اپنی جگہ پر ڈٹا رہا۔ جب رشکی جل کو اس کی خبر ملی، تو وہ غصے کے مارے آگ بگولا ہوگئی۔ اس نے اپنے ایلچی کی بیعزتی، اپنی بیعزتی تصور کی اور اس گستاخانہ اور غیر مؤدبانہ حرکت کی جوابدہی کے لیے نرجل کو اپنے دربار میں حاضری کا حکم دیا۔ نرجل آ تو گیا، لیکن سخت جلا بھنا۔ اس نے اس طلبی کو اپنی ہتک خیال کیا، اور ٹھان لی کہ رشکی جل کو اس دیدہ دلیری اور جسارت کا مزہ چکھا دیگا۔ چنانچہ جونہی وہ دربار میں پہنچا، اس نے رشکی جل کو چوٹی سے پکڑ، تخت سے نیچے گھسیٹ لیا اور قریب تھا کہ اس کا سر اڑا دے، کہ رشکی جل نے اس سے معافی مانگی اور منت سماجت کرنے لگی۔ نہ صرف یہی، بلکہ اس نے نرجل سے درخواست کی، کہ مجھ سے شادی کر لو۔ نرجل نے اس کی جان بخشی کی اور اسے اپنی بیوی بنا لیا۔ اس کے بعد وہ سال کے چھے مہینے دنیا میں رہتا اور چھے مہینے پاتال میں۔ اس کا کام تھا دنیا میں وبائیں اور بیماریاں پھیلانا، طوفان برپا کرنا اور عام طور پر تباہی لانا۔ کوشہ میں نرجل اور رشکی جل کا ایک مشترکہ مندر تھا۔ لیکن اس کے علاوہ لارسہ، اسپلین اور اشور میں اس کی الگ مندروں

میں بھی پرستش ہوتی تھی۔

نامتر:

نامتر کا نام جادو ٹونوں اور چھومنتروں میں عام طور پر ملتا ہے۔ وہ موت کا مقدمہ الجیش تھا۔ ساٹھ بیماریاں اس کے جلو میں چلتی تھیں۔ وہ جب چاہتا انھیں دنیا پر مسلّط کر دیتا۔ نرجل کے ساتھ ایک اور دیوتا آرا کا نام ملتا ہے۔ یہ بھی وباؤں کا دیوتا تھا اور بنی نوعِ انسان کا جانی دشمن۔ عام طور پر لوگ نیا مکان تعمیر کرتے وقت ایک تختی پر اس سے بچاؤ کا منتر لکھ کر اس کی بنیادوں میں رکھ دیتے تھے، تاکہ اس کی ایذا سے محفوظ رہیں۔

اشور:

جب بابل پر زوال آیا اور سیاسی اقتدار کا مرکز شمال کی طرف اسیریا میں منتقل ہوگیا، تو شمس اور مردوخ دونوں کی خصوصیات بھی یہاں کے مقامی دیوتا اشور کو تفویض کر دی گئیں۔ لیکن وہ خاص طور پر جنگ کا دیوتا قرار پایا۔ اب عشتار اس کی بیوی بنی اور تمام دیویوں پر اس کی برتری تسلیم کر لی گئی۔

اینجی، انوناکی:

انو کا (اور بعد کو مردوخ اور اشور کا بھی) ایک لقب "شاہ اینجی" تھا۔ انلیل "شاہ انوناکی" کہلاتا تھا۔ یہ دونوں نام اینجی اور انوناکی اسم جمع ہیں اور ان سے تمام زمین اور پاتال کے دیوی دیوتا مراد لیے جاتے ہیں۔ اینجی میں چھ سو دیوتا تھے۔ یہ آسمانوں یا عالمِ علیا میں مقیم تھے۔ انوناکی کے تین سو دیوتا زمین اور پاتال کے باسی تھے۔ یہی دنیا میں وبائیں، بیماریاں اور دوسری مصیبتیں لاتے تھے۔ جادو کے منتروں میں ان کے نام کثرت سے ملتے ہیں۔ نرجل اور ارشکی جل ان میں سے خاص طور پر اہم تھے۔

مردوخ:

میں نے شروع میں بیان کیا ہے کہ بابل اور اسیریا میں ہزاروں

دیوتا مختلف شکلوں میں پوجے جاتے تھے۔ اس لیے ان سب کا تذکرہ ناممکن ہے اور غالباً غیر ضروری بھی۔ ان میں سے جو زیادہ اہم ہیں ان کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے۔ مختصراً ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ مختلف شہر خاص خاص دیوتا کی عبادت کا مرکز تھے۔ جب کسی شہر کی سیاسی طاقت کم ہوجاتی اور وہ کسی دوسرے شہر کے ماتحت ہوجاتا، تو اسے یوں تعبیر کرتے کہ فاتح شہر کا دیوتا، ہزیمت خوردہ شہر کے دیوتا پر غالب آگیا ہے۔ اس کا ایک لازمی نتیجہ یہ ہوتا کہ اس کی مورتی فاتح دیوتا کے مندر میں بطور حاشیہ نشینوں کے رکھ دی جاتی۔ جوں جوں یہ شہری ریاستیں کمزور ہوتی گئیں، ان کے مقامی دیوی دیوتاؤں کی اہمیت بھی کم ہوتی گئی حتیٰ کہ جب حمورابی کے زمانے میں سارا ملک بابل کی سیادت تسلیم کرنے پر مجبور ہوگیا اور تمام دُور دَست ریاستیں اس کی باجگزار بن گئیں، تو اب نہ صرف حمورابی ہی ملک بھر کا بادشاہ بن گیا، بلکہ بابل کا دیوتا مردوخ بھی ملک بھر کے دیوتاؤں کا سردار قرار پایا۔ بابل کی سیاسی سطوت گویا مرادف تھی، اس کے دیوتا کی بزرگی اور عظمت کے۔ اگر دوسری شہری ریاستیں حمورابی کی فوجوں کے مقابلے میں نہیں ٹھہر سکی تھیں، تو اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ ان کی تعداد تھوڑی تھی، یا ان کے پاس اسلحہ کم تھے، یا بابلی فوج فنونِ جنگ اور تنظیم اور حکمتِ عملی میں ان سے بڑھی ہوئی تھی، بلکہ اس لیے کہ مردوخ دیوتا جو بابلیوں کی پشت پناہ تھا، وہ ان کے اپنے دیوتاؤں سے زیادہ طاقتور تھا۔ ظاہر ہے کہ جس کی لاٹھی اس کی بھینس ان حالات میں زبردست کی عبادت عام ہونا ہی چاہیے تھی۔ یہ مردوخ دیوتا بحیثیتِ مجموعی سورج کا نمائندہ تھا۔

ستارہ پرستی:

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ بابلی عہد میں عام طور پر تین دیوتاؤں (سِن، شَمس، اَداد) اور ان کے ساتھ ایک دیوی (عِشتار) کی پرستش ہو رہی تھی۔ اسے ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ سُومری عہد میں عبادت کائناتی تقسیم پر مبنی تھی۔ اَنُو آسمان کا دیوتا تھا، اِنلیل زمین اور فضا کا اور اِیاَ پانیوں کا۔ لیکن بابلی

عہد میں زیادہ زور قدرت کے مظاہر اور اجرامِ فلکی کی حرکتوں اور ان کے اثرات پر دیا جانے لگا۔ سورج کھیتی باڑی اور سبزی ترکاری کی پیداوار کے لیے ذمہ دار تھا۔ چاند اور ستارے نہ صرف بدّو کے تجارتی سفروں میں اس کے رہنما تھے، بلکہ تقویم کا حساب بھی انہی سے رکھا جاتا تھا۔ طوفان اور اس کے متعلقہ مظاہر سیلاب، بجلی، زلزلہ، آدمی کے گھر بار اور کھیت اور باغ پر براہِ راست اثر انداز ہوتے تھے۔ اسی طرح زہرہ کے طلوع و غروب سے بھی جنتری کی تدوین اور زائچہ کی ترتیب میں مدد لی جاتی تھی۔ پس ہم مختصراً یہ کہہ سکتے ہیں کہ بابلیوں کا مذہب فطرت پرستی اور ستارہ پرستی تھا۔ چاند اور سورج اور ستاروں کی پرستش عام تھی اور وہ قضا و قدر کے مالک اور انسانوں کے حاجت روا مانے جاتے تھے۔ حمورابی کا اپنے سب سے بڑے بیٹے اور ولی عہد کا نام شمس ایلنا (شمس ہمارا معبود ہے) رکھنا بھی اسی عقیدے کا اعلان تھا۔ یہی شمس ایلنا حمورابی کے بعد بابل کے تخت پر بیٹھا تھا۔

قرآن کی شہادت : اس نتیجے کی صحت کی تصدیق قرآن سے بھی ہوتی ہے۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام، حمورابی کے ہم عصر تھے۔ وہ اُور شہر کے رہنے والے تھے جو جنوبی بابل میں سِن دیوتا (چاند) کی عبادت کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ خداوند تعالیٰ نے انھیں ہدایت کی اور وہ بتوں کی پوجا اور ستارہ پرستی سے باز آگئے۔ اس پر ان کی اپنے بزرگِ خاندان اور دوسرے بُت پرستوں سے جو بات چیت ہوئی اس کا ذکر قرآن میں ان لفظوں میں آیا ہے:-

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ اٰزَرَ اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً
اِنِّيْٓ اَرٰىكَ وَقَوْمَكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ○ وَكَذٰلِكَ نُرِيْٓ
اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ
الْمُوْقِنِيْنَ ○ فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا قَالَ هٰذَا
رَبِّيْ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ ○ فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ

بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّيْ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَئِنْ لَّمْ يَهْدِنِيْ رَبِّيْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّيْنَ ○ فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّيْ هٰذَآ اَكْبَرُ فَلَمَّآ اَفَلَتْ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ○ اِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ○ وَحَآجَّهٗ قَوْمُهٗ قَالَ اَتُحَآجُّوْٓنِّيْ فِي اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰىنِ وَلَآ اَخَافُ مَا تُشْرِكُوْنَ بِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ رَبِّيْ شَيْـًٔا وَسِعَ رَبِّيْ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ ○

(الانعام ۶: ۷۴-۸۰)

(ترجمہ) اور جب (حضرت ابراہیم (سے اس مسئلے میں بات چیت ہوئی، تو انھوں نے) اپنے بزرگ خاندان آزر سے کہا کہ کیا آپ (ان) بتوں کو معبود بنا رہے ہیں؟ (جو نہ اپنی حفاظت کر سکتے ہیں، نہ کسی اور کی مدد) میری نظر میں تو آپ اور آپ کی (ساری) قوم سخت گمراہی (کے رستے) پر (جا رہی) ہے۔ اور (پھر) اس طرح ہم نے ابراہیم کو آسمانوں اور زمین کی عظمت (مختلف مظاہر کے ذریعے) دکھائی، تاکہ انھیں (اپنے عقیدے کی راستی کا پورا پورا) یقین ہو جائے۔ چنانچہ جب اُن پر رات (کی تاریکی) چھا گئی، تو انھوں نے آسمان میں چمکدار زہرہ ستارہ دیکھا (اور لوگوں نے اپنے غلط عقیدے کے مطابق ان سے کہا یہ ہمارا رب ہے) تو انھوں نے (جواب میں) کہا، اچھا، کیا یہ میرا رب ہے؟ لیکن جب (تھوڑی دیر بعد) وہ ڈوب گیا، تو انھوں نے (ان لوگوں سے) کہا کہ (یہ تو ڈوب گیا) میں ڈوب جانے والے (خدا) کو پسند نہیں کرتا (کیوں کہ میرا خدا تو ہر وقت موجود رہنے والی ہستی ہے) اس کے بعد چمکتا ہوا چاند

طلوع ہوا (تو اب لوگوں نے ان سے کہا، کہ یہ بھی ہمارا رب ہے) اس پر انھوں نے (پھر بھی) کہا کہ اچھا تو (گویا) یہ میرا معبود ہے۔ لیکن جب (کچھ وقت کے بعد) یہ بھی غروب ہو گیا، تو انھوں نے کہا (لو یہ بھی ڈوب گیا، پس یہ بھی دنیا کا رب نہیں ہو سکتا۔ خوب ہوا کہ میں تمھارے دھوکے میں نہیں آگیا، میں اپنے خدا کا شکر ادا کرتا ہوں) اگر اس میرے رب نے میری ہدایت نہ کی ہوتی، تو میں (بھی تمھاری باتوں میں آ کے) تمھاری طرح گمراہ ہو گیا ہوتا (انہی باتوں میں دن ہو گیا اور سورج نکل آیا، تو اب لوگوں نے کہا کہ یہ سب سے بڑا معبود ہے) جب انھوں نے روشن سورج دیکھا تو کہا کیا (واقعی) یہ میرا رب ہے؟ (بے شک) یہ سب سے بڑا ہے (آخر کار) جب یہ بھی ڈوب گیا (تو اب تو وہ پکار اُٹھے) اے میری قوم، (یہ بھی رب نہیں ہو سکتا، بلکہ تم سب شرک میں مبتلا ہو) میں ان سب (چیزوں) سے برأت کا اعلان کرتا ہوں جنھیں تم خدا وند تعالیٰ کے ساتھ شریک کرتے ہو۔ میں تو سچے دل سے صرف اسی ہستی پر تکیہ کرتا ہوں، جس نے ان تمام آسمانوں اور زمین کو (اور جو کچھ ان میں ہے) پیدا کیا اور میں (اس کی عبادت میں) کسی دوسرے کو شریک نہیں بناتا۔ اس پر ان کی قوم نے (اُن سے حجت بازی کی) تو انھوں نے (آخری جواب دیتے ہوئے) کہا (تم عجیب لوگ ہو) کیا تم مجھ سے خداوند تعالیٰ کے بارے میں دلیل بازی کرتے ہو (حال آنکہ مجھے اس کے وجود پر کامل یقین ہے کیوں کہ) اسی نے مجھے سیدھی راہ دکھائی ہے اور (تم مجھے ان دیوتاؤں اور بتوں سے) جن کی تم پوجا کرتے ہو (اور ان کے قہر و غضب سے کیا ڈراتے ہو) میں اُن سے نہیں

ڈرتا (مجھے تمہارے ان بتوں سے کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا) سوائے اس کے کہ میرا خدا ہی ایسا چاہے۔ میرے رب کے علم میں ہر ایک چیز ہے۔ پس میری تکلیف بھی اسی کے علم کے مطابق اور ضرور میرے کسی فائدے ہی کے لیے ہوگی) کیا تم (لوگ اس سے) کوئی نصیحت حاصل نہیں کر سکتے" اور اسی طرح یہ مکالمہ چلا جاتا ہے۔

یہ ثبوت ہے اس امر کا کہ حمورابی کے زمانے میں ستارہ پرستی عام تھی۔ تمام ستارے، چاند، سورج محلِ عبادت تھے اور خدا نے اسی گمراہی سے نکالنے کے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بابلیوں کی طرف مبعوث کیا۔

مندر:

جیسا کہ [illegible] ہے، بالعموم ہر ایک بڑے دیوتا کے لیے کوئی نہ کوئی شہر مخصوص تھا، جہاں اس دیوتا کی مورتی کے لیے مرکزی مندر تعمیر کیا جاتا تھا۔ شروع میں یقیناً یہ بہت سادہ عمارت رہی ہوگی۔ لیکن جوں جوں زمانہ گزرتا گیا، تکلفات بڑھے اور ضروریات نے مجبور کیا، تو مندر کی عمارت زیادہ وسیع اور پر تکلّف ہوتی گئی۔ دولتمند اور امیر لوگ بھی کسی خواہش کے حصول کے لیے منّت مانتے اور وہ پوری ہو جاتی، تو شکر گزاری کے اظہار میں یا تو موجودہ مندر کی عمارت ہی میں اضافہ کر دیتے یا کسی اور دیوتا کے نام پر نیا مندر تعمیر کروا دیتے۔ اسی طرح ان مندروں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ ہیروڈوٹس آخری زمانے میں لکھتا ہے کہ خاص بابل میں (۵۸) مندر تھے۔

مختلف جگہوں پر بیسیوں مندروں کی کھدائی ہوئی ہے۔ اگرچہ ان کا نقشا بہت حد تک ایک دوسرے سے الگ ہے۔ اور یہ ہونا بھی چاہیے تھا کیوں کہ ہر جگہ کا مذاق مختلف تھا، اور ضرورتیں یکساں نہیں تھیں۔ لیکن بعض باتیں سب میں مشترک ہیں۔ مثلاً ہر ایک کے وسط میں صحن ملتا ہے۔ ایک سرے پر ایک بڑا کمرہ دیوتا کے لیے مخصوص تھا اور اس کی دیوار میں چھوٹا یا بڑا طاق، جس میں دیوتا کی

مورتی کے لیے چوکی رکھی جاتی تھی۔

اگر مندر کا رقبہ زیادہ ہوتا، تو اس بڑے صحن کے علاوہ دو ایک چھوٹے صحن بھی ہوتے۔ ان کے گرداگرد پجاریوں، پروہتوں، دیوداسیوں، وغیرہ کے رہنے کے کمرے ہوتے تھے۔ یہیں مندر کا مودی خانہ بھی ہوتا جس میں سامان اور رسد کا ذخیرہ رہتا تھا۔

بابل میں مردوخ کا مندر بڑی عظیم الشّان عمارت تھی اور اس کے احاطے میں گویا ایک شہر کی آبادی بستی تھی۔ اس کی جو تفصیل ہمیں معلوم ہوئی ہے، اسی سے دوسرے مندروں کا بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

مردوخ کا مندر:

اس مندر کو اِی سجیلہ کہتے تھے۔ یہ دریائے فرات کے مشرقی کنارے پر بہت بڑے مستطیلی رقبے میں تعمیر ہوا تھا۔ اس کے دو حصّے تھے۔ جنوبی حصّے کے وسط میں مردوخ کا مرکزی معبد تھا۔ اس کے اردگرد (۵۵) عبادت کے کمرے تھے۔ چاروں دیواروں میں بڑے بڑے پھاٹک تھے جن سے زائر اور پجاری دن رات کے تمام اوقات میں آتے جاتے رہتے تھے۔ اسی احاطے کے بعض کمروں میں چھوٹے درجے کے دیوی دیوتاؤں کی مورتیاں نصب تھیں۔ مثلاً مردوخ کی بیوی زرپانت ما ان کے بیٹے نبو، بحری دیوتا اِیا، اگنی دیوتا لنسک، دعائیں سننے والے دیوتا تشیمت، (عربی سماعت، سننا) اور بیسیوں دوسرے معبودوں کے بتوں کے لیے کمرے مخصوص تھے۔ چونکہ دارالخلافہ کا سب سے بڑا مندر تھا۔ اور مردوخ سلطنت کا محافظ دیوتا تھا، اس لیے ہر ایک بادشاہ اپنے عہد میں قیمتی سے قیمتی نذریں یہاں پیش کرتا رہا۔ اس سے مندر میں دولت کے انبار جمع ہو گئے۔ سونے چاندی کے برتن، ظروف، سازو سامان اور دوسری اشیا کی کوئی کمی نہیں تھی۔ ایک مثال کافی ہو گی۔ جب اشور بنی پال کے باپ سرہادون (۶۸۱ - ۶۶۹ ق م) کے عہد میں مندر کی عمارت نئے سرے سے بنائی گئی، تو اس نے مردوخ کا

بت، تخت، چوکی، کرسی، خالص سونے کی پیش کی۔ چاندی کے برتن اس کے علاوہ تھے۔ اس کے اوپر کے سائبان میں آسمان کا نظارہ پیش کیا گیا تھا جس میں ستارے اور اجرام فلکی سونے چاندی کے بنے ہوئے تھے۔

مندروں کی تعمیر میں سونا، چاندی، سیپ، سنگِ مرمر، سنگِ جراحت مختلف قسم کی قیمتی لکڑی عام استعمال ہوتی تھی۔ اور یہ چیزیں دور دور اور مختلف ملکوں سے درآمد کی جاتی تھیں۔

ذگورۃ :

مندر کے شمالی حصے میں ذگورۃ تھا (عربی، ذکر، عبادت ہ ذکورۃ محلِ عبادت) یہ ایک مینار تھا، جو ہر ایک مندر کا جزو لاینفک تھا۔ اگرچہ اس کی شکل وصورت سب مندروں میں ایک سی نہیں ہے لیکن عام طور پر یہ عمارت مستطیل قاعدے پر بنائی جاتی تھی۔ بہ درجہ بدرجہ یا منزل بمنزل ہوتی تھی۔ ہر ایک منزل، نیچے کی منزل کے چاروں طرف کچھ جگہ چھوڑ کے اس کے عین بیچ میں رکھی جاتی تھی۔ ایک منزل سے دوسری پر پہنچنے کے لیے پوری عمارت کے ارد گرد غلام گردش کی شکل کا ڈھلوان رستہ بنا ہوتا تھا۔ ذگورہ کی شکل کم و بیش مصر کے اہرامِ سقارہ سے مشابہ ہوتی تھی۔ جنوبی ہندستان کے بعض مندر بھی اسی وضع کے ہیں۔ یہ ذگورہ اہرامِ مصر کی طرح مقبرے کے طور پر استعمال نہیں ہوتا تھا، نہ یہ دیوتا کی مورتی رکھنے کی جگہ ہی تھی۔ اس کے باوجود یہ مندر کا حصہ اور مقدس جگہ تھی اور غالباً اعتکاف وغیرہ کے لیے استعمال ہوتی تھی۔

مردوخ کے مندر کا یہ حصہ، جس میں ذگورہ ہے، وہی ہے جس کا ذکر تورات کے سفرِ پیدائش (۱۱: ۱-۹) میں مینار بابل کے نام سے ملتا ہے۔ اس میں سات منزلیں تھیں، جن سے غالباً اجرام فلکی کی طرف اشارہ مقصود ہے۔

میرا اپنا خیال ہے، کہ مسلمانوں نے ماذنہ کا تصور اسی ذگورہ سے لیا۔ سب سے پہلا ماذنہ، عباسی عہد میں تعمیر ہوا۔ اس سے پہلے مسجد کی عمارت اور عام مکان

میں کوئی مابہ الامتیاز نہیں تھا۔ عباسیوں نے اس میں، اذان کے لیے مینار کا اضافہ کیا۔ خلیفہ معتصم عباسی کے تعمیر کردہ شہر سامرہ میں مسجد کا جو ماذنہ تھا، وہ اب بھی موجود ہے۔ اس میں اور ذکورہ میں کوئی فرق نہیں۔

پروہت :

شروع میں بادشاہ اور پروہت ایک ہی شخص تھا۔ زمانہ گزرنے کے ساتھ دونوں عہدوں کے فرائض بڑھتے گئے۔ یہاں تک کہ ان سے عہدہ برآ ہونا کسی ایک آدمی کے بس کی بات نہ رہی، تو دو الگ الگ شخص ان کاموں کے لیے مقرر ہوئے۔ اب پروہت کا کام صرف دیوتا کی پوجا اور مندر کی جایداد کی دیکھ بھال رہ گیا۔ پروہت گویا دیوتا اور اس کے پرستاروں کے درمیان واسطہ تھا۔ اس کے علاوہ دیوتا شہر کی تمام زمین کا مالک تھا۔ اور اس پہلو سے وہاں کے باشندے اس کی رعایا اور مزارع تھے۔ پروہت کا یہ بھی فرض تھا کہ وہ مندر کی ملحقہ جاگیروں اور زمینوں اور ڈھور ڈنگروں کا خیال رکھے اور فصل پر لگان وصول کر کے مندر کے کھتوں میں جمع کرائے۔

پروہتوں کے طبقے :

(۱) مہا پجاری، ارجل (الرجل۔ آدمی) کہلاتا تھا۔ جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، یہ گویا مندر کے مذہبی طبقے کا سرغنہ تھا اور مندر کا تمام نظم و نسق اسی کے ہاتھ میں تھا۔

(۲) کلو ـــ یہ مندر میں گانے بجانے کا انتظام کرتا تھا۔ اس کا فرض، عظیم دیوتا کا دل خوش کرنا، بتایا گیا ہے۔ پوجا کے وقت، دیوتا کے سامنے ساز اور دف کے ساتھ بھجن گائے جاتے تھے، جس سے دیوتا کو خوش کرنا مطلوب تھا۔ اول اول یہ بھجن کچھ ایسے لمبے نہیں تھے، لیکن آخری زمانے کی جو بھجناولیاں دستیاب ہوئی ہیں، ان میں خاصے طویل بھجن ہیں۔ بلکہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ متعدد بھجنوں کو ملا کے ایک لمبا بھجن بنا لیتے تھے۔ اس میں پہلے مختلف دیوی دیوتاؤں کی

حمد و ثنا بیان ہوتی اور آخر میں خاص اس دیوتا سے اپنی مصیبتوں اور مشکلات کا حال بیان کر کے عاجزی سے رحم و کرم کی درخواست کی جاتی تھی۔ ان بھجنوں کی دو خصوصیتیں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ایک تو سال کے ہر ایک مہینے کے بھجن الگ تھے۔ دوسرے بہت زمانے تک، یعنی جب سامی اقتدار اپنے انتہائی عروج پر بھی پہنچ چکا تھا، یہ بھجن سُومری زبان ہی میں گائے جاتے رہے۔ اس کی مثال بالکل انگلستان کی ہے، کہ وہاں بہت قریب زمانے تک تمام مذہبی کارروائی لاطینی میں ہوتی رہی، حال آں کہ عوام کی زبان انگریزی تھی، اور ان میں سے کوئی لاطینی نہیں سمجھتا تھا۔ موجودہ غیر اسلامی ممالک میں عربی کا بھی کچھ ایسا ہی حال ہے۔

(۳) ہر ایک مندر میں جادو ٹونے اور جھوٹ منتر کے لیے خاص پجاری ہوتے تھے۔ یہ مشمش اور اشیپ کہلاتے تھے۔ ان کا کام دو طرح کا تھا۔ یہ فوری جھاڑ پھونک کے ذریعے بھی بد روحوں کا سایہ اور بیماریاں وغیرہ دور کرتے تھے۔ اور کسی خواہشمند کی درخواست پر اس کے لیے خاص دعا اور لمبی عبادت بھی کرنے پر تیار رہتے۔

(۴) ایک اور طبقہ محض فال دیکھنے اور خوابوں کی تعبیر بیان کرنے کے لیے مخصوص تھا۔ یہ بارو کہلاتے تھے۔ (عربی معبر۔ تعبیر بیان کرنے والا) بالعموم ان کی بڑی تعداد شاہی دربار کے ساتھ وابستہ رہتی تھی۔ جب کبھی بادشاہ کسی سفر یا مہم پر جانا چاہتا، تو یہ لوگ دیکھ کر بتاتے کہ کوچ کے لیے کون سا دن مبارک اور کونسی ساعت سعید ہوگی۔ تقویم کا تیار کرنا، چاند اور دوسرے ستاروں کی نقل و حرکت کا خیال رکھنا، نیک و بد دونوں کا حساب بھی انھیں کے ذمہ تھا۔

(۵) مردوں کے علاوہ عورتیں بھی مذہبی فرائض سرانجام دیتی تھیں اور ان کے بھی متعدد طبقے تھے۔ ان کا ذکر اس سے پہلے ہو چکا ہے۔ بالخصوص عِشتار دیوی کے مندر میں ان مذہبی عورتوں کی بہت بڑی تعداد تھی۔ بلکہ انھیں امتیازی حیثیت

حاصل تھی اور عشتارت کہلاتی تھیں۔

جوں جوں زمانہ گزرتا گیا، پروہتائی اور پوجاپاٹ کا طریقہ، بلکہ تمام مذہبی علوم ہی رازہائے سربستہ بنتے چلے گئے۔ چوں کہ ان کا بڑا حصّہ پرانی سُومری زبان میں تھا، اس لیے ایک تو انھیں حاصل کرنا اور اُن پر حاوی ہونا بجائے خود مشکل اور صبر طلب کام تھا، اس پر مذہبی طبقے نے کچھ ایسا انتظام کیا کہ عوام کو اس کی ہوا بھی نہ لگے، تاکہ خوش اعتقاد لوگ ہمیشہ ان کے دست نگر اور ان سے خائف رہیں۔ مثلاً کتنی مذہبی دستاویزوں کے آخر میں اس طرح کے لفظ ملتے ہیں۔

> جو رسوم تم ادا کرو، یہ واقف کار تو دیکھ سکتا ہے لیکن کسی غیر یا اجنبی کے لیے انھیں دیکھنا جائز نہیں، ورنہ اس کی زندگی کے دن ختم ہو جائیں گے۔ واقف کار، واقف کار کو تعلیم دے۔ عامی دنیا دار انھیں نہ دیکھیں۔ انو اور انلیل اور ایا عظیم الشّان دیوتاؤں نے اس کی سخت ممانعت کر دی ہے۔

یہ بالکل وہی صورت ہے جو آخری زمانے میں ہندستان میں پیش آئی۔ برہمنوں نے مذہبی علوم پر کچھ ایسا قبضہ جمایا، کہ ان کا حصول دوسرے لوگوں اور خاص طور پر شودروں کے لیے ناممکن بنا دیا۔ اسی لیے منوسمرتی میں یہ حکم ملتا ہے کہ اگر کوئی شودر ویدبانی کا پڑھنا تو درکنار، اسے سننے تک کی جرأت کرے، تو سیسہ پگھلا کر اس کے کانوں میں اُنڈیل دیا جائے تاکہ وہ آیندہ کے لیے ایسا پاپ کرنے کے قابل ہی نہ رہے۔

بتدریج یہ علوم بابل کے گنتی کے چند خاندانوں میں محدود ہو کے رہ گئے اور وہ ان کی تعلیم اپنے بچّوں کے سوائے اور کسی کو نہیں دیتے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں مذہبی طبقے کے لیے رہبانیت اختیار کرنا محال تھا۔ یہی وجہ ہے کہ پجاری اور پجارنیں مجرّد نہیں رہتے تھے اور انھیں شادی کر لینے کی کھلی چھٹی تھی۔

زمانۂ جاہلیّت میں عرب لوگ کعبہ کا طواف بالکل ننگے جسم کرتے تھے۔ بابل

کی بعض تصویروں سے معلوم ہوتا ہے کہ شروع میں وہاں بھی مذہبی رسوم کی ادائی کے وقت پجاری جسم کے تمام کپڑے بالکل اتار دیتا تھا۔ لیکن بعد کو یہ رواج ترک ہو گیا اور وہ پوجا کے وقت جسم پر ایک سفید چادر اوڑھنے لگے۔ چھو منتر اور جادو ٹونے کرنے والا طبقہ (مشمش اور اشیپ) سرخ رنگ کی چادر استعمال کرتا تھا۔ اس سے غالباً بد روح کو ڈرانا مقصود تھا۔ بلکہ اسی مقصد سے وہ اس موقع پر بعض اوقات مختلف جانوروں کی شکل کے مصنوعی چہرے بھی سر اور منّھ پر لگا لیتے تھے۔

ان پجاریوں کی تعداد مندر اور شہر کی اہمیت کے مطابق ہوتی تھی۔ مثلاً ایک فہرست سے معلوم ہوتا ہے کہ لاغاش کے بادشاہ اور کی جن کے عہد میں (تقریباً ۲۶۰۰ ق م) باؤ دیوی کے مندر میں (۷۳۱) پجاری اور پجارنیں تھیں۔ اس کے مقابلے میں جب بابل کی سلطنت اپنے عروج پر تھی تو مردوخ کے مندر میں ان کی تعداد آٹھ سے لے کر دس ہزار تک تھی۔ آہستہ آہستہ اس طبقے نے بہت رسوخ اور اثر و نفوذ حاصل کر لیا۔ یہاں تک کہ بابل کے آخری ایام میں بادشاہ کا انتخاب بھی وہی کرتے تھے۔ چنانچہ بابل کا آخری بادشاہ نبونیدوس در اصل ایک پجاری تھا جسے اس کے ساتھیوں نے مندر کی گدّی سے اٹھا کے تختِ شاہی پر بٹھا دیا۔ البتہ ہم دیکھتے ہیں کہ مذہبی جماعت کی طاقت غیر معمولی طور پر بڑھ جانے کے زمانے میں بھی، کوئی بادشاہ اپنے ایک حق سے دست بردار نہیں ہوا یعنی بابل اور اسیریا، دونوں جگہ اعلا مذہبی عہدیدار وہ خود مقرّر کرتا تھا۔ یہ پیش بندی غالباً اس لیے کرنا پڑی کہ اگر کہیں مذہبی طبقہ مخالف ہو جاتا تو وہ ملکی نظم و نسق میں دست اندازی کر کے مشکلیں پیدا کر سکتا تھا۔ اگر اونچے درجے کے پجاری اور پروہت بادشاہ کے اپنے لوگ اور آوردہ ہوتے، تو یقین تھا کہ وہ کسی مخالفانہ سازش یا سرگرمی میں حصّہ نہیں لیں گے۔ بادشاہ ان جگہوں کے لیے عام طور پر اپنے خاندان کے کسی فرد کا انتخاب کرتا تھا۔ مثلاً اشور بنی پال نے دو اہم ترین مندروں (اشور دیوتا اور سِن دیوتا) کے مہا پروہت اپنے دونوں چھوٹے بھائی مقرّر کیے تھے۔

بلکہ بعض بادشاہ تو مہا پجارن بھی شاہی خاندان کی کسی عورت ہی کو بنا دیتے تھے۔ سرجون اور قدر معبوق اور نبونیدوس، تینوں نے اپنی اپنی بیٹی کو اس عہدے پر فائز کر دیا تھا۔

فال، تعبیر:

اوپر پجارن کے "بارو" طبقے کا ذکر آیا ہے۔ اس موضوع پر ذرا تفصیل سے لکھنے کی ضرورت ہے، کہ تعبیر اور فال کے کیا مختلف طریقے استعمال ہوتے تھے۔ اس سے نہ صرف لوگوں کے مذہبی معتقدات اور توہمات ہی کا پتا چلتا ہے بلکہ اس زمانے کے تمدن سے متعلق بھی بالواسطہ ہماری معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔

(۱) خواب اور رویا:

خواب اور رویا، ہمیشہ سے انسان کی دلچسپی کا باعث رہے ہیں۔ یہ اعتقاد بہت قدیم ہے کہ اس کے ذریعے سے خدا خواب دیکھنے والے پر اپنے عندیہ اور خواہش کا اظہار کرتا ہے۔ قرآن کی سورۂ یوسف (۱۲) میں حضرت یوسف کے قید خانے میں اپنے ساتھیوں اور بعد کو فرعون کے خوابوں کی تعبیر کے واقعات بیان ہوئے ہیں۔ دانیال نبی کی تعبیروں کے جو حالات تورات میں لکھے ہیں، وہ بھی بہت مشہور ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر بابلی لوگ بھی خوابوں کو دیوتاؤں کا اشارہ خیال کرتے تھے، تو وہ اس عقیدے میں کچھ ایسا غلطی پر بھی نہیں تھے۔ قرآن میں رویا کو بھی الہام کا ایک طریقہ بیان کیا گیا ہے جس سے خدا انسانوں سے کلام کرتا ہے۔ سورۂ شوریٰ (۵۱) میں "من وراء حجاب"، جس وحی کا ذکر ہے، تمام مفسر اس کا رویا، اور خواب پر بھی اطلاق کرتے ہیں۔ بلکہ حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ شارع اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا آغاز ہی رویائے صادقہ سے ہوا (بخاری: کتاب التفسیر)۔ اسی لیے آپ نے فرمایا بعض الرؤیا جزء من النبوۃ (متفق علیہ) بعض خواب نبوت ہی کا حصہ ہوتے ہیں۔

اس کی تصدیق ایک دوسری حدیث سے بھی ہوتی ہے، جہاں آپ نے اپنے بعد نبوت کی نفی کرتے ہوئے فرمایا: لم یبق من النبوۃ الا المبشرات (بخاری کتاب التعبیر) یعنی اب میرے بعد نبوت میں سے صرف مبشرات باقی رہینگی۔ اور مبشرات میں خوابیں شامل ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے بھی خوابوں کو وحی اور نبوت کی ایک شکل قرار دیا ہے۔ البتہ یہ سچ ہے کہ تمام خواب صحیح اور قابلِ اعتبار نہیں ہوتے۔ لیکن "رویائے صادقہ" اور "اضغاث احلام" میں امتیاز کرنا بھی ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔

بابل میں بارو پجاری ہر طرح کے خواب کی تعبیر بتاتے تھے۔ تعبیر کے کچھ بنیادی اصول موجود تھے۔ اور مرورِ زمانہ کے ساتھ اس موضوع سے متعلق بہت مسالہ جمع ہوتا گیا۔ مختلف خاندانوں میں جنہوں نے اس فن میں خاص مہارت حاصل کر لی تھی، ہر قسم کے خواب کی روایتی تعبیر موجود تھی۔ لوگ ان کے ہاں جاتے اور اپنا شوقِ تجسس پورا کر لیتے۔

(۲) نومولود کی شکل وصورت:

نہایت قدیم زمانے سے کسی عورت (بلکہ جانور کا بھی) اپنے وجود سے ایک اور ہم جنس کو پیدا کرنا، نہ صرف حیرتناک بلکہ ہولناک بات سمجھی جاتی تھی، چہ جائے کہ مولود کی شکل وصورت میں بھی کوئی غیر معمولی بات ہو۔ جب کوئی عورت حاملہ ہو جاتی، تو خیال کیا جاتا کہ کوئی بد روح یا جن اس کے پیٹ میں گھس گیا ہے، یا اس پر کسی نے جادو کر دیا ہے۔ چنانچہ سب اس سے ڈرتے کیونکہ یہ عمل ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ چنانچہ حمل کے دوران میں مختلف قسم کے ٹوٹکے اور جھاڑ پھونک ہوتے رہتے اور کئی رسمیں ادا کی جاتیں، جن کا مقصد یہ ہوتا کہ اس عورت کے رشتے دار اور متعلقین اس بد روح کی ناراضی سے محفوظ رہیں۔

اگر بچے کی شکل یا کسی عضو میں کوئی غیر معمولی بات ہوتی، تو بارو کو بلا کے اُس سے

پوچھا جاتا کہ وہ اس کی تعبیر بیان کرے۔ مثلاً ایک دستاویز میں یہ لکھا ملا ہے:۔

اگر کسی عورت کے ایسا بچہ پیدا ہو، جس کا سر شیر کے سر کے مشابہ ہو تو ملک پر ایک زبردست بادشاہ حکمران ہوگا۔ اگر بچے کا دایاں کان نہ ہو، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ شاہزادے کی موت واقع ہوگی۔ اگر اس کے سر کی شکل سانپ کی سی ہو، تو یہ نن عز بد دیوی کا نشان ہے، زمین غرق ہو جائیگی۔ اور چونکہ یہ جلیج موس کا نشان بھی ہے، اس لیے ملک میں ظلم ہوگا اور اس پر کوئی وسیع الاختیار مستبد بادشاہ حکومت کرے گا۔

کتنی دستاویزوں میں اس طرح کی فہرستیں ملی ہیں، جن میں جسم کے دوسرے حصوں چہرے، کان، ناک، پاؤں وغیرہ کی شکل سے تعبیر معلوم کرنے کے اصول بتائے گئے ہیں۔

(۳) جانور اور پرندے:

ان سے فال لینے کا رواج بھی بہت قدیم ہے۔ پالتو جانوروں کی نقل و حرکت کا بہت خیال رکھا جاتا تھا۔ سواری کا جانور (گھوڑا یا گدھا) کیسے کھڑا ہوتا ہے۔ اس کا کونسا کان ہلتا ہے۔ باہر نکلتے وقت کونسا پاؤں پہلے دہلیز سے باہر رکھتا ہے۔ سواری کے وقت کونسے نتھنے سے سانس لے رہا ہے۔ ان سب باتوں سے سفر کے وقت اور مقصد میں کامیابی یا ناکامی کا فیصلہ کیا جاتا تھا۔ اسی طرح کتے سے متعلق بھی کتنے اشارے ملتے ہیں۔ مثلاً ایک دلچسپ تحریر ملاحظہ ہو۔

اگر کسی شخص پر سفید کتا پیشاب کردے تو افلاس و نکبت اس پر مسلط ہو جائیگی۔ اگر کتے کا رنگ سیاہ ہو، تو وہ شخص بیمار پڑ جائیگا۔ لیکن اگر کتا بھورے رنگ کا ہے، تو اسے کوئی خوشی پیش آئیگی۔

اسی طرح پرندوں کے اڑنے کے طریقے اور اس کی سمت سے بھی فال لی جاتی تھی۔ عربوں میں بھی اس کا رواج تھا۔ مثلاً جب کسی شخص کو رات کے وقت سفر پیش

آجاتا تو وہ گھونسلے میں بیٹھے پرندے کو اڑاتا۔ اگر پرندہ اڑ کے دائیں طرف جاتا تو وہ اُسے اچھا شگون خیال کرتے ہوئے سفر پر روانہ ہوجاتا۔ اگر بائیں کو جاتا، تو سفر کا ارادہ ملتوی کردیتا۔ اسی لیے حدیث میں آیا ہے۔ "اقرّوا الطیور فی اوکارہم (مسند احمد حنبل) تم پرندوں کو ان کے گھونسلوں میں بیٹھا رہنے دو (اور خدا پر بھروسا کرکے سفر پر روانہ ہوجاؤ)

بابلی لوگ سانپوں سے بھی فال لیتے تھے۔ سانپ کا بہار کے موسم میں کینچلی اُتارنا اور اس طرح گویا نئی زندگی حاصل کرنا، ان کے لیے بہت تعجب کی بلکہ توہم انگیز بات تھی۔ صرف ایک مثال کافی ہوگی خیال یہ تھا کہ اگر "نیسان کے مہینے کے پہلے تیرہ دنوں میں سانپ کسی شخص کی پشت کی طرف دکھائی دے، تو اس کا دوست دشمن بن جائیگا۔"

(۴) تیل، آٹا:

اس کا طریقہ یہ تھا کہ کسی برتن یا کھلے مُنھ کے پیالے میں پانی لے کر اس پر آہستہ سے تیل یا آٹا ڈالا جاتا۔ پھر اس تیرتے ہوئے تیل یا آٹے کی مختلف شکلوں سے فال نکالی جاتی تھی۔ حمورابی کے عہد کی ایک تختی پر لکھا ہے۔

اگر سیدھے ہاتھ کی طرف تیل کا پورا دائرہ بن جائے، تو اس شخص کو سفر پیش آئیگا، اور اس میں اسے مالی منفعت بھی ہوگی۔ اگر وہ شخص مریض ہے، تو صحتیاب ہوجائیگا۔ اگر تیل کے دو دائرے بن جائیں، ایک بڑا اور دوسرا چھوٹا، تو اس کی بیوی کے لڑکا پیدا ہوگا۔ اور اگر وہ مریض ہے تو تندرست ہوجائیگا۔ اگر تیل پانی کی پوری سطح پر پھیل جائے، تو مریض کی موت واقع ہوجائیگی اور سفر کی صورت میں بھی تمام مسافر موت کا شکار ہوجائینگے۔

مصر میں آج بھی اسی طرح قہوے کی پیالی سے قسمت کا حال بتانے کا رواج ہے۔ یعنی جب کوئی شخص قہوہ پی چکتا ہے، تو وہ پیالی اُلٹا دیتا ہے۔ اس سے تہ میں پڑا ہوا قہوے کا تر سفوف حرکت میں آجاتا ہے اور پیالی کی دیواروں پر مختلف شکلیں بن جاتی ہیں۔ بعض لوگ انھیں شکلوں کو دیکھ کے قہوہ پینے والے کی قسمت کا حال بتاتے

ہیں۔ انھیں عربی میں عراف کہتے ہیں۔

(۵) جانوروں کی انتڑیاں اور جگر

دیوتاؤں کی خوشنودی کے حصول کے لیے اکثر بھیڑ کی قربانی کی جاتی تھی۔ مختلف تیوہاروں پر بھی جانور ذبح کرنے کا رواج تھا اور لوگ منتیں بھی مانتے رہتے تھے۔ ذبح شدہ جانور کی انتڑیوں کی ترتیب اور جگر کی شکل سے مقسوم پڑھا جاتا تھا۔ اس مقصد کے لیے خاص طور پر جگر کا استعمال بہت عام تھا۔ جگر کے مختلف حصوں کا نہایت توجہ سے تفصیلی نقشا کھینچا جاتا تھا اور ہر ایک حصہ کی شکل، وضع قطع، مقام، دوسرے حصوں سے اس کا تعلق، ان سب باتوں کا بغور مطالعہ کیا جاتا اور ان کی بنا پر حکم لگایا جاتا تھا۔

نہ صرف یہی بلکہ مٹی کے بنے ہوئے جگر کے سیکڑوں نمونے دستیاب ہوئے ہیں اور بیشمار ایسی تحریریں بھی ملی ہیں، جن میں ان کے معائنے کے طریقے اور ان سے نتائج اخذ کرنے کا مفصل بیان ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ نمونے بالکل اسی طرح مبتدیوں کی تعلیم کے دوران میں استعمال ہوتے تھے، جیسے آج کل طبی کالجوں میں جسم کے مختلف حصوں کے اصلی یا نقلی نمونوں سے طلبہ کی تعلیم کا کام لیا جاتا ہے۔

(۶) تیر:

بابلیوں کے ہاں کسی کام یا مہم کا فیصلہ کرنے میں تیروں سے بھی مدد لی جاتی تھی۔ اسلام سے پہلے عربوں میں بھی یہ رسم ملتی ہے۔ اس کا طریقہ ہمیشہ یہ ہوتا تھا، کہ پورے کا پورا سوال پیش کرکے اس کا جواب ہاں یا نہ میں طلب کر لیا جاتا تھا۔ مثلاً کیا میں اس سفر پر جاؤں یا نہ جاؤں؟ فلاں کام کروں یا نہ کروں؟ اس کے بعد تیر نکالا جاتا۔ ہر ایک تیر پر ہاں یا نا کا نشان بنا ہوتا تھا۔ جو تیر نکل آتا اس کے مطابق عمل کرتے۔ حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا عبدالمطلب نے اپنے بیٹے عبداللہ (آنحضرت صلعم کے والد) کو قربانی سے بچانے کے لیے اسی طرح کی فال نکلوائی تھی۔ (۱) قرآن میں جہاں "ازلام" کا ذکر ہے (المائدہ ۵۔ ۳)

وہاں عربوں کی اسی رسم کی طرف اشارہ ہے۔

تورات میں بھی اسی طرح کا واقعہ ملتا ہے۔ جب اخب شام پر حملہ کرنے کے لیے سوال کرتا ہے، تو اس کے الفاظ ایسے ہیں کہ جواب اثبات یا نفی میں ملنے سے مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ وہ پوچھتا ہے: کیا میں رموت جلاد کے مقابلے کے لیے جاؤں؟ اسے اس کا جواب اثبات میں دیا گیا تھا (سلاطین الاوّل، ۲۲: ۶)

بابلیوں کے ان چیزوں سے فال لینے کا ذکر تورات میں بھی آیا ہے (حزقیال، ۲۱: ۲۱-۲۳)

(۷) ستارے

ستاروں اور چاند سورج کی نقل و حرکت سے انسانی قسمت معلوم کرنے کا رواج بھی دنیا کی تمام قدیم قوموں میں رہا ہے، بلکہ ابھی تک بعض ملکوں میں اس کے باقیات ملتے ہیں۔ بچّے کی پیدائش پر زائچہ بنانے کی رسم کی بنیاد بھی اسی اصول پر قائم ہے، کہ ولادت کے وقت آسمان میں مختلف ستاروں کی ترتیبِ مکانی کا اثر اس کی آیندہ زندگی پر ہوتا ہے۔ بابلی بھی اسی عقیدے کے پیرو تھے۔ ہم دیکھ چکے ہیں، کہ انھوں نے اپنے مختلف دیوتاؤں کی سکونت کے لیے آسمان کے حصّے مخصوص کر رکھے تھے۔ ذکورہ غالباً رسدگاہ کا کام بھی دیتا تھا جس کی بلند چوٹی سے بارو ستاروں کے چڑھنے اترنے کے اوقات اور اسی طرح کی دوسری باتیں معلوم کرتا تھا۔ اور یہ تو امرِ واقع ہے، کہ ہر ایک مندر میں ایک کمرہ اس کام کے لیے مخصوص ہوتا تھا، کہ وہاں سے چاند کی نقل و حرکت کا معائنہ کیا جا سکے۔

سورج گرہن اور چاند گرہن کو بہت اہمیت حاصل تھی۔ خاص طور پر چاند گرہن کو بہت خطرناک خیال کیا جاتا تھا۔ اس کے آغاز سے متعلّق یہ روایت ملتی ہے:

> اِنلیل دیوتا نے سِن اور شمس اور عِشتار تینوں کے ذمّے یہ فرض لگایا تھا کہ وہ آسمانوں کی دیکھ بھال رکھیں، لیکن سات بدروحوں (شیطانوں) نے سِن پر حملہ کر دیا اور اسے گھیر لیا، جس سے چاند گرہن

میں آگیا۔ اس حادثے سے تمام دیوتاؤں میں کھلبلی مچ گئی۔ جب انلیل کو چاند دیوتا کی مصیبت کا علم ہوا تو اس نے اپنے ایلچی ننسک کو اِیا کے پاس اطلاع دینے کو بھیجا۔ (اِیا، جیساکہ بیان ہوچکا ہے، ہر طرح کے جادو اور سحر کا دیوتا ہے)۔ اِیا نے بہت افسوس کا اظہار کیا اور آخر اپنے بیٹے مردوخ کو بھیجا، کہ جاؤ، دیکھو کیا معاملہ ہے۔ مردوخ نے واپس آکے اِیا کو سارا حال بتایا اور اس سے مشورہ کیا کہ اب کیا کیا جائے۔ حسب معمول اِیا نے اس سے کہا، کہ تم سب کچھ جانتے ہی ہو اور آخر میں اسے بعض منتر اور سحر سکھلائے، جن کی مدد سے سِن کو آزاد کرایا جاسکتا تھا۔ مردوخ نے ان پر عمل کیا اور اس طرح چاند کو ان شیطانوں کے چنگل سے چھٹکارا دلایا۔

چاند گرہن سے متعلق قدیم ہندوؤں کا نظریہ بھی اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں۔

بعد کے زمانوں میں جب کبھی چاند گرہن ہوتا، پجاری زور زور سے چیخیں مارتے۔ کلو پجاری اپنے آلاتِ موسیقی نکال لیتے۔ ان کا اعتقاد یہ تھا کہ اس سے چاند دیوتا پر جو مصیبت نازل ہوگئی ہے، دور ہوجائیگی اور اسے اس سے نجات مل جائیگی۔

اسی طرح سورج گرہن اور زہرہ (عشتار) کے شروق و غروب سے افراد اور قوم کی قسمت سے متعلق فیصلے کرتے تھے۔

گرہن سے متعلق کچھ خوش اعتقادی عربوں کے ہاں بھی ملتی ہے، جس کا ثبوت یہ ہے کہ جب حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے ابراہیم کی وفات ہوئی ہے، تو اتفاق سے اس دن سورج کو گرہن لگ گیا۔ لوگوں نے عقیدۃً خیال کیا کہ یہ ابراہیم کی وفات کے باعث ہوا ہے کیونکہ وہ خیال کرتے تھے کہ یہ گرہن کسی بڑے آدمی کی موت کی نشانی ہوتا ہے۔ جب آنحضرت صلعم کو اس کی خبر پہنچی تو آپؐ نے

فرمایا کہ چاند، سورج کا گرہن قانونِ قدرت کے مطابق ہوتا ہے، ان کا کسی کے مرنے جینے سے کوئی تعلق نہیں۔ (متفق علیہ)

(۸) موسم :

بادلوں کی کڑک اور بجلی کی چمک، پانی کے برسنے اور قوسِ قزح کے نکلنے کو بھی اسی مقصد کے لیے استعمال کرتے تھے۔ بادل کے گرجنے کا تعلق مہینے کے دن سے تھا اور کوندے کے لپکنے کا آسمان کے حصے سے۔ اسی طرح بارش سے متعلق یہ دیکھا جاتا تھا کہ وہ کونسے دن ہوئی ہے اور ان سے مختلف نتائج اخذ کیے جاتے تھے۔ قوسِ قزح اگر شہر کے بالائی حصے میں ہوتی، تو مبارک خیال کی جاتی تھی، ورنہ بُری۔ اسی طرح زلزلے سے بھی فال لیتے تھے۔

آپ نے ملاحظہ کیا کہ دنیا جہان کی ہر ایک چیز سے قسمت کے اچھی بُری ہونے پر حکم لگایا جاتا تھا اور یہ نتیجہ تھا اس اعتقاد کا کہ یہ تمام چیزیں کسی دیوی یا دیوتا کی سرگرمیوں کا مظہر ہیں اور چونکہ یہ دیوتا بنی نوعِ انسان کے ہمدرد بھی تھے اور مخالف بھی، اس لیے ان کی کارگزاریوں کا مطالعہ ازبس ضروری تھا، تاکہ ان کے مخالفانہ اقدام سے بچنے کے لیے وقت پر پیش بندی کی جا سکے۔

جادو ٹونا منتر :

دنیا کی دوسری قدیم اقوام کی طرح بابلیوں کا بھی یہی عقیدہ تھا کہ بیماری یا جسمانی تکلیف کسی بدروح یا جن کے جسم میں گھس جانے سے پیدا ہوتی ہے۔ ان کی بہت بڑی تعداد تھی۔ عموماً ان کی مورتیاں اس شکل کی ہیں کہ دھڑ انسان کا ہے اور سر کسی جانور کا۔ اصل میں یہ بھی دیوتاؤں ہی کی اولاد تھے۔ چنانچہ ان میں سے جو سات خاص طور پر مشہور تھیں اور خطرناک بھی، انھیں آنو کی اولاد بتایا گیا ہے۔ ان کے سر ان جانوروں کے ہیں :۔ شیر، چیتا، کتا، بھیڑ، مینڈھا، پرندہ، سانپ۔ ہر ایک بیماری اور وبا انہی سے منسوب تھی۔ کسی کے سر درد ہو کہ بدہضمی، بخار ہو کہ زکام، اس کا ایمان تھا کہ یا تو اس مرض کی بدروح اپنے آپ اسے تکلیف دینے

کے لیے اس کے جسم میں داخل ہوگئی ہے، یا کسی جادوگر (یا جادوگرنی) نے جس کے زیرِ اثر وہ بد روح ہے، اُسے اس کے جسم میں داخل کر دیا ہے۔

چونکہ عام خیال یہ تھا کہ یہ بد روحیں نچلے طبقے کی ہستیاں اور دوسرے بڑے دیوتاؤں کے خادم اور غلام ہیں، اس لیے یہ اعتقاد بھی نادر نہیں تھا کہ ممکن ہے، دیوتا ہی نے اس شخص کو کسی جرم کی سزا دینے کو اپنی خادم بد روح کو اُسے ایذا پہنچانے کا حکم دے دیا ہو۔ جونہی کوئی شخص سنِ بلوغ کو پہنچتا، اسے اس کے پیدائشی نام کے علاوہ ایک خاص نام دے دیا جاتا تھا۔ اُس دن سے وہ کسی نہ کسی دیوتا کی حمایت اور حفاظت میں آ جاتا اور "فلاں دیوتا کا بندہ" کہلاتا تھا۔ عقیدہ یہ تھا کہ یہ دیوتا ہر وقت اس کے ساتھ بلکہ اسی کے جسم میں رہتا ہے۔ اور ہر طرح کی تکلیف اور مصیبت اور بیماری سے اس کی حفاظت کرتا ہے۔ جونہی وہ آدمی کسی "گناہ" کا ارتکاب کرتا، دیوتا اسے چھوڑ کے چل دیتا۔ اب چونکہ اس کی حفاظتی ڈھال نہیں رہی تھی، اس لیے ہر طرح کی بد روح اور جن اور شیطان اس پر حملہ کر سکتا تھا اور اس کی ظاہری نشانی یہ تھی کہ وہ کسی بیماری میں مبتلا ہو جاتا۔

ظاہر ہے کہ بیماری سے چھٹکارا پانے کا ایک ہی طریقہ تھا کہ یہ بد روح بیمار کے جسم سے نکل جائے۔ اس لیے سب سے پہلی درخواست مریض کی طرف سے یا تو اس دیوتا سے ہوتی، جس کی خادم وہ بد روح ہوتی تھی، یا مریض اپنے ذاتی حامی دیوتا کی پوجا پاٹ کر کے اس سے اسے نجات دلوانے کی خواہش پیش کر دیتا۔ اگر اسے اس میں کامیابی نہ ہوتی تو خیال کیا جاتا کہ بد روح نے کسی دیوتا کے حکم پر نہیں، بلکہ یا تو خود بخود ایسا کیا ہے یا یہ کسی جادوگر کی کارستانی ہے۔ اس کے بعد چھو منتر اور جادو ٹونوں کا دور چلتا۔

اس کا طریقہ یہ تھا کہ بالعموم مقدس دریاؤں — دجلہ اور فرات — کا پانی منگوا کر اس پر منتر پڑھتے اور اسے مریض پر چھڑک دیتے، یا اُسے پلا دیتے۔ اگر ان

دریاؤں کا پانی میسّر نہ آتا تو پھر کسی چشمے کے پانی کو ترجیح دی جاتی، جہاں وہ سیدھا زمین سے نکل رہا ہو۔

کئی منتر ملے ہیں، جن میں کسی خاص بدروح کا نام لے کر اس سے کہا گیا ہے کہ تم اس مریض کے جسم سے نکل جاؤ۔ منتر کے آخر میں کسی دیوتا (بالعموم شمس یا اِیا، نُسک یا مردوخ) کا نام ہے کہ تمھیں اس دیوتا کی قسم ہے کہ فوراً اس مریض کے جسم سے نکل جاؤ۔ بعض اوقات اس کے ساتھ کچھ رسوم بھی ادا کی جاتی تھیں۔ ان کی شکلیں مختلف تھیں۔ مثلاً اُس جن یا بدروح کی یا جادوگر کی مُورتی بنائی جاتی۔ اس پر کچھ منتر پھونکنے کے بعد اسے جلا دیتے، یا دریا میں بہا دیتے، یا کسی اور طرح ضائع کر دیتے۔ یہ گویا ظاہر میں اس کی طاقت کے زائل کیے جانے اور مریض کے اچھا ہو جانے کا اعلان تھا۔ عام طور پر یہ مورتیاں مٹی یا آٹے یا کولتار کی بناتے تھے۔ بعض دھات کی بنی ہوئی مورتیاں بھی ملیں ہیں۔

بعض اوقات اس مورتی کو ضائع کرنے سے پہلے اس سے وہی سلوک کیا جاتا جو کسی جیتے جاگتے آدمی کو ایذا پہنچانے کے لیے کیا جائیگا۔ مثلاً اس کے سوئیاں چبھوتے۔ اس کے مُنہ میں زہر ٹپکاتے۔ اس کی آنکھیں نوچ ڈالتے یا دوسرے اعضا کاٹ دیتے اور اس کے بعد اسے جلا یا ڈبو دیتے۔ یہ گویا اس بدروح یا جادوگر کو دِق کیا جارہا ہے اور خیال یہ تھا کہ وہ اس سے تنگ آکر بھاگ جائیگی۔

اسی طرح بیماری کو کسی جانور کے جسم میں منتقل کرنے کی کوشش کی جاتی۔ بھیڑ کا میمنا یا کوئی پرندہ لاکے اسے مریض کے بستر کے پاس کھڑا کر دیتے۔ جھاڑ پھونک کرنے والا منتر پڑھتا اور بدروح کو حکم دیتا کہ مریض کو چھوڑ کر اس جانور کے جسم میں داخل ہو جائے۔ اس کے بعد اس جانور کا گوشت کھانا ممنوع تھا کیونکہ وہ اس بدروح کی وجہ سے ناپاک ہو جاتا تھا۔ عام طور پر اسے کسی دیوتا کی بھینٹ چڑھا دیتے تھے۔ لیکن یہ قربانی نہیں ہوتی تھی، بلکہ اس کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ دیوتا آیندہ اس بیماری کو مریض کے پاس جانے سے روکیں۔ کبھی کبھی اس جانور کے ٹکڑے

کر کے اسے آگ میں بھی جلا دیتے تھے۔

حضرت مسیح ناصری علیہ السلام کا ایک واقعہ بھی اسی طرح کا بیان ہوا ہے۔ جب وہ گیدرین میں دو ایسے آدمیوں سے ملے، جن پر جِن سوار تھے، تو انھوں نے ان جنوں کو ان کے جسم سے نکل جانے کا حکم دیا۔ اس پر وہ نکل کر سوروں کے جسم میں داخل ہو گئے اور سوروں کا یہ پورے کا پورا ریوڑ ان کے اثر کے ماتحت پہاڑ کی گھاٹی سے نیچے پانی میں کود پڑا اور ڈوب کر تباہ ہو گیا۔ (متی، ۸: ۲۸-۳۴)

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ کسی قسم کی دوا استعمال نہیں کی جاتی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارا موجودہ طریقہ علاج انہی منتروں اور ٹوٹکوں سے شروع ہوا۔ بلکہ اگر ہم اس پر غور کریں، کہ آج کل کا نظریہ کہ ہر ایک بیماری کی اصل علّت جسم میں اس کے جراثیم کی موجودگی ہے، تو قدیم خیال کہ بیماری جسم میں کسی بد روح یا جن کی موجودگی کا نتیجہ ہے، اس سے کچھ زیادہ مختلف بھی نہیں۔ اور چھو منتر ہو یا کوئی دوا، مقصود بھی دونوں کا ایک ہی ہے کہ یہ جن یا جراثیم جسم سے جلد سے جلد خارج کیے جائیں۔

الغرض بابل میں بھی مریض کو دوا دی جاتی تھی اور اس کے ساتھ منتر بھی پڑھے جاتے تھے، تاکہ وہ جلد اثر کرے۔ اگر یہ خوش ذائقہ اور خوشبو دار ہوتی، تو اس کا مقصد یہ تھا کہ وہ بد روح اس سے خوش ہو کر نکل جائے۔ اور اگر بد ذائقہ اور بدبو دار ہوتی تو اس سے تنگ آ کر۔ یہ معالج اور پجاری (اور عام طور پر یہ ایک ہی شخص ہوتا تھا) کی مرضی پر منحصر تھا، کہ وہ کونسا علاج پسند کرتا ہے۔ دنیا کی تمام دوائیں تجربے کی بنا پر معلوم ہوئی ہیں اور آج بھی تمام امراض کا علاج آزمائشی طریقے سے معلوم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جب بابلی طبیب نے دیکھا کہ کسی مرض میں کوئی خاص دوا مفید ثابت ہوتی ہے، تو اس نے نتیجہ نکالا کہ یہ بد روح اس دوا سے بھاگ جاتی ہے۔ آیندہ اس نے اس تجربے کی بنا پر دوسرے مریضوں کو بھی دوا دی۔ وہ منتر ضرور پڑھتا تھا اور تعویذ بھی دیتا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ اس نے دوا کا استعمال بھی جاری رکھا، جو اس کے تجربے کی بنا پر اس مرض کی

بد روح (جراثیم) ناپسند کرتی تھی، اور جس کے استعمال کے بعد وہ مریض کو چھوڑ کے بھاگ جاتی تھی۔ ہمارے علم نے ہمیں یہ بتایا کہ منتر کے بغیر محض دوا سے بھی یہ کام کیا جا سکتا ہے، لہٰذا ہم نے منتر پڑھنا ترک کر دیا۔

اس طرح بابلیوں نے اپنے تجربے سے بہت سے مفردات کے خواص معلوم کر لیے، جنھیں وہ مختلف امراض میں استعمال کرتے تھے۔ چنانچہ ان کی جو تحریریں ملی ہیں، اُن میں کئی جڑی بوٹیوں اور معدنیات کا طریقۂ استعمال اور اثر درج ہے۔ وہ آنکھ اور دانت کے درد، معدے اور پٹھوں کی بیماریوں اور پھوڑے پھنسی کا علاج انہی دواؤں سے کرتے تھے۔ مختلف زہروں، خاص طور پر سانپ اور بچھو کے کاٹے کا کامیاب علاج بھی انھیں معلوم تھا۔

اخلاقی تعلیم :

اب تک جو کچھ لکھا گیا ہے، اس سے یہ خیال ہو سکتا ہے، کہ شاید بابلی مذہب محض توہمات پر مشتمل تھا یا پھر چند رسوم کا مجموعہ تھا، جو انسان کو مہد سے لحد تک ادا کرنا پڑتی تھیں۔ اور ان کے ہاں اخلاق یا نیکی بدی کا کوئی تصور نہیں تھا۔ لیکن یہ خیال درست نہیں ہوگا۔ مثلاً قانونِ حمورابی کی تمہید کے یہ الفاظ دیکھیے:

> انو اور بعل نے مخلوق کا دل خوش کرنے کو، مجھ شہرۂ آفاق بادشاہ اور خدا ترس حمورابی کو مامور کیا، کہ زمین پر عدل قائم کرو، فرمایوں اور شریروں کو نیست و نابود کر دو۔ زبردستوں کو زیردستوں پر ظلم کرنے سے باز رکھو۔ تاکہ بلوان فرزندانِ نیکی کے سروں پر سورج دیوتا کی طرح چمکوں اور زمین کو نور سے بھر دوں۔

اس کا یہ مطلب ہے، کہ حمورابی کے زمانے میں یہ مشہورِ عام عقیدہ تھا کہ دیوتا دنیا میں اخلاقی اصولوں کی فتح کے حق میں ہیں۔ اور اس بادشاہ نے جو قانون وضع کیا، وہ ان دیوتاؤں کی اسی خواہش کے مطابق تھا اور اس کا مقصد بھی یہی تھا کہ اس کی مدد سے لوگوں کے اخلاق بہتر بنائے جائیں۔

اسی طرح ان کے ہاں ثواب اور گناہ کا تصور بھی بالکل ناپید نہیں۔ یہ ٹھیک ہے، کہ مرورِ زمانہ سے لوگوں کا یہ اعتقاد بن گیا تھا کہ یہ بیماریاں اور وبائیں، امساکِ باراں اور سیلاب، قحط اور دوسری مصیبتیں اس لیے آتی ہیں کہ دیوتا ہماری بداعمالیوں سے ناراض ہیں۔ اور یہ ناراضی بھی عام طور پر پادشاہ اور حکمران ہی سے منسوب کی جاتی تھی، جو ان کے خیال میں دیوتا کا نمایندہ اور اس کا منظورِ نظر تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ جب بابل پر غیر ملکی قبضہ ہوگیا اور وہ لمبے عرصے تک غیروں کی محکومی میں بسر کرنے پر مجبور ہوگئے، تو قدرتی طور پر ان کے دل میں یہ خیال گزرا کہ ایک وہ دن تھا کہ ہم اتنے طاقتور اور چار کھونٹ کے حکمران تھے، اور ایک آج کا دن ہے کہ ہم آزادی کا سانس تک نہیں لے سکتے۔ آخر یہ کیا ہوگیا کہ ہم اپنی آزادی کھو بیٹھے ہیں اور اب ہمارے وہ دیوتا کیوں ہماری مدد نہیں کرتے جن کے زیرِ سایہ بابل اپنی تمام حریف حکومتوں سے بازی لے گیا تھا۔ اس کا جواب بھی خود انھیں میں سے بعض لوگوں نے دیا کہ یہ تمھارے گناہوں کی سزا ہے۔

رہا یہ سوال کہ وہ کس طرح کا فعل گناہ خیال کرتے تھے، تو اس میں شبہہ نہیں کہ عوام کے عقیدے میں، کسی مسلّمہ رسم کی خلاف ورزی، یا کسی مقدس جگہ کی بے ادبی یا کسی خاص موقع پر دیوتا کے حضور مناسب قربانی یا بھینٹ کا پیش نہ کرنا ہی گناہ تھا، جس کے نتیجے میں دیوتا اس سے ناراض ہوجاتے تھے۔ لیکن اسی کے ساتھ بعض اخلاقی جرائم کا بھی ذکر موجود ہے۔ مثلاً صلۂ رحمی یا رشتہ داروں کے خلاف کوئی بات کرنا گناہ خیال کیا جاتا تھا۔ جھوٹ بولنے اور بے رحمی اور ایذادہی کو بھی برا سمجھا جاتا تھا۔ عِشتار دیوی کی عبادت کی ایک دعا ہے:

اے دیوی! میں تمھارا پرستار ہوں، میری خطا بخش دے۔
میرے گناہ اور ظلم اور میری شرمناک حرکتوں سے چشم پوشی فرما، اور لغزشوں سے درگزر کر۔ میری بدعنوانیوں پر دھیان نہ دے۔ میری عبادت قبول کر۔ میری بیڑیاں کاٹ دے اور مجھے نجات عطا کر۔

اسی طرح کی ایک اور مناجات ملی ہے، جو غالباً اشورنبی پال کے زمانے کی

ہے۔ اس کا مرکزی خیال یہ ہے، کہ انسان کے لیے یہ معلوم کرنا بہت مشکل ہے، کہ دیوتا کیا پسند کرتے ہیں۔ اس لیے وہ اپنی جہالت سے گناہ کا مرتکب ہوجاتا ہے۔ اصل لفظ یہ ہیں:

انسان بہرا ہے، وہ بالکل جاہل ہے، انسان اور دوسری مخلوق بھی۔ آخر اس کا علم ہی کیا ہے؟ اسے کیا معلوم، کہ وہ گناہ کا کام کر رہا ہے یا ثواب کا۔ اے میرے مالک! اپنے اس ناچیز بندے کو لغزش سے بچائیے۔ وہ دلدل میں پھنس گیا ہے۔ اس کی دستگیری فرمائیے۔ میری برائی کو اچھائی میں بدل ڈالیے۔ میں نے جو جرم کیا ہے، ہوا کو حکم دیجیے کہ اسے اڑا لے جائے۔ اور میری بدکاریاں پرانے کپڑے کی طرح دور کر دیجیے۔ میرے گناہ کو گردیجیے کہ میں آپ کی مدح کے گیت گاؤں۔ اے کاش، آپ کا دل، سگی ماں کی طرح مجھ پر مہربان ہو جائے۔ آپ سگے ماں باپ کی طرح مجھ سے مطمئن ہوجائیں۔

اگرچہ اس مناجات کا آخر تک یہی انداز نہیں اور آگے اس میں بعض خرافات بھی ملتی ہیں۔ لیکن ان خیالات کی موجودگی اتنا تو ظاہر کرتی ہے کہ لاکھ مسخ شدہ سہی، ساتویں صدی قبلِ مسیح میں ان کے ہاں نیکی بدی کا ایک خیالی معیار ضرور پیدا ہو چلا تھا۔ اور ان کا عقیدہ محض مادی تصور اور ادائی رسوم ہی تک منحصر نہیں رہا تھا۔

گناہ کے ساتھ لازمی طور پر حیات بعد الموت کا خیال آتا ہے۔ تقریباً تمام وہ مذاہب، جن میں نیکی بدی کا عقیدہ ہے، ان میں ایک دوسری دنیا کا تصور بھی موجود ہے۔ ان کی تعلیم یہ ہے، کہ اگرچہ انسان کے بیشتر اعمال کا نتیجہ اسی دنیا میں نکل آتا ہے، لیکن آخری فیصلہ موت کے بعد کسی اور مقام پر ہوتا ہے، جب ان اعمال کو سامنے رکھ کر روح کے آیندہ قیام کا تعین کیا جاتا ہے۔ بابلیوں کا اعتقاد بھی یہی تھا، کہ انسان جو کچھ بھی کرتا ہے، اچھا ہو کہ برا، دیوتا اس سے خوش یا ناراض ہو کر

فوراً اِسی زندگی میں اس کا حساب چُکا دیتے ہیں۔ اگر خوش ہوئے، تو انعام مل جائیگا۔ اور ناراض ہوئے، تو ہم کسی نہ کسی تکلیف یا مصیبت میں پھنس جائینگے۔ اُن کے اس عقیدے میں روحانیت کا کوئی شائبہ نہیں تھا۔ یہ ثواب اور عذاب، دونوں شروع سے آخر تک مادّی تھے، اپنے تصوّر میں بھی اور تنفیذ میں بھی۔ رہی موت! تو اُن کے نزدیک موت کے بعد اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ جہاں تمام انسان ابد تک رہینگے۔ یہاں سے نہ نکلنے کا راستہ ہے نہ واپس لوٹنے کا۔

لیکن ایک زمانہ آیا کہ وہ سوچنے پر مجبور ہو گئے۔ جب انھوں نے دیکھا کہ کئی نیک آدمی، ساری عمر مصیبتوں میں مبتلا رہتے ہیں، اور ان کے مقابلے میں بدمعاش گلچھرّے اڑاتے پھرتے ہیں، تو قدرتی بات تھی، کہ وہ اس فرق پر غور کرنے لگتے کہ آخر یہ کیا اندھیر ہے۔ اگر دیوتا ہی ہر ایک چیز کا انتظام کرتے ہیں، اور ہمارے اعمال کی اچھائی برائی کا معیار وہی ہے، جو ہمیں بتایا جاتا ہے، تو وہ کیوں نیکوں کو راحت و آرام عطا نہیں کرتے اور بدمعاشوں کو ان کے کیفرِ کردار کو نہیں پہنچاتے۔ اس پر اگرچہ ان میں سے بعض ضرور یہ ماننے لگے کہ سب دیوتا انصاف پسند نہیں، بلکہ وہ ظلم بھی کرتے ہیں۔ لیکن اکثریت اس عقیدے پر جم گئی کہ یہاں کے بعد بھی کوئی زندگی ہے جہاں نیک کو اس کی نیکی کی جزاء اور بد کو اس کی بدی کی سزا ملتی ہے۔

کتابیات

1. Babylonian Religion and Mythology: L.W. King (London, 1898).
2. Religion of Ancient Egypt and Babylonia: A.H. Sayce (Edinburg, 1902)
3. Aspects of Religious Beliefs and Practice in Babylon and Assyria: Morris Jastrow Jr. (New York, 1911)

4. Legends of Babylon and Egypt: L.W.King, (London, 1916).
5. Myths and Legends of Babylonia: Lewis Spencer, (London, 1928).
6. Sumerian Mythology: S.N.Kramer (Philadelphia, 1944).
7. Kingship and the Gods: Henri Frankfort (Chicago, 1948).
8. Babylonian & Assyrian Religion: S.H.Cook, (London, 195f3).

پانچواں باب

بابلی زبان وادبیات

مسماری/میخی رسم الخط:

اگرچہ یورپی سیاح بہت زمانے سے عراق اور ایران سے دلچسپی کا اظہار کر رہے تھے، اور انھوں نے یہاں کی پرانی عمارتوں اور کھنڈروں کا جائزہ بھی لیا اور ان سے متعلق کتابیں بھی لکھیں، لیکن سب سے اول مغرب میں عراقِ قدیم کی تحریروں کا تعارف کرانے والا شخص ایک اطالوی پیٹرو ڈیلا والے (Pietro della Valle) تھا۔ جب وہ سترھویں صدی عیسوی کے شروع میں ان ممالک کے سفر سے یورپ واپس گیا، تو اپنے ساتھ چند پرانی اینٹیں بھی لیتا گیا، جن پر خطوط کے ذریعے نقش ونگار بنے ہوئے تھے۔ اس کے بعد جب مختلف یورپی علما نے عراق کے آثار کا غائر مطالعہ شروع کیا، تو انھوں نے دیکھا کہ ہر جگہ اسی طرح کے نقوش کندہ ہیں۔ ابتدا میں وہ اس بات کا فیصلہ نہ کر سکے کہ یہ کیا چیز ہیں۔ لیکن جلد ہی معلوم ہوگیا کہ یہ تحریریں ہیں اور چونکہ ان کی بنیاد ایک ایسی لکیر پر تھی جس کی شکل میخ یا مسمار کی سی ہے، اس لیے سب سے پہلے ۱۷۰۰ء میں ایک جرمن عالم انجلبرٹ کیمفر (En-gelbert Kaemfer) نے اسے خط میخی/مسماری (Cuneiform) کے مناسب نام سے موسوم کیا (Cuneus) (میخ، مسمار، پیکان) اور بعد کو یہ رسم الخط اسی نام سے مشہور ہوگیا۔

کتبوں کا پڑھنا:

جب ان کتبوں کے پڑھنے کا مرحلہ پیش آیا تو معلوم ہوا کہ یہ ایسا آسان کام نہیں۔ ان تحریروں کا پڑھنا مصری ہیروغلیفی کے پڑھنے سے زیادہ مشکل تھا۔ موخر الذکر سے متعلق بہت بڑی سہولت یہ تھی کہ یہ زبان یونانیوں کو معلوم تھی اس کے علاوہ قبطی زبان ابھی تک موجود ہے، جو گویا ہیروغلیفی کی بیٹی اور وارث ہے۔ اس لیے جب ایک دفعہ دروازہ کھل گیا تو سب مقدمے حل ہو گئے اور مصر کی اس قدیم زبان کا خزانہ منظرِ عام پر آگیا۔ لیکن خطِ میخی کے بارے میں ایسی کوئی آسانی موجود نہیں تھی، نہ تو یہی معلوم تھا کہ آیا کسی اور قوم نے بھی اس زبان میں کچھ لکھا ہے یا نہیں اور نہ اس کے بعد کی کسی اور زبان سے اس کا تعلق یا رشتہ ہی معلوم تھا۔

ایران کے قدیم دارالخلافے پرسی پولس کے کھنڈروں میں ان تحریروں کے متعدد نمونے دستیاب ہوئے تھے۔ ایک جگہ اوپر تلے اسی رسم الخط میں تین عبارتیں تھیں، لیکن کچھ پتا نہیں چلتا تھا کہ یہ کس موضوع سے متعلق ہیں۔ مدت تک ماہرینِ السنہ ان کتبوں کے پڑھنے اور ان کے مطالب سمجھنے کی کوشش کرتے رہے۔ اگرچہ ان میں سے ہر ایک نے اپنی بساط بھر ہمارے علم میں اضافہ کیا، لیکن اصل مسئلہ کہ یہ زبان کیا ہے، اور اس کے حروفِ تہجی کیا ہیں، اور اسے کیسے پڑھا جائے، اس بارے میں ان کے تمام نظریے اٹکل اور قیاس سے زیادہ نہیں تھے اور تحریریں بدستور سربستہ طلسم بنی رہیں۔ لیکن داد دینا پڑتی ہے، ان اصحاب کی مستقل مزاجی اور صبر کی کہ ان مشکلوں اور ناکامیابیوں کے باوجود وہ ہمت نہیں ہارے اور برابر اس گتھی کے سلجھانے میں لگے رہے اور آخر کار وہ انھیں پڑھنے میں کامیاب ہو گئے۔

سب سے پہلے ۱۷۶۵ء میں نائی بوہر (Niebuhr) نے پرسی پولس کے کتبوں کے معاینے کے بعد یہ رائے قائم کی کہ اگرچہ یہ تمام کتبے ظاہر میں ایک سے ہیں، لیکن اپنی تفصیلات میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ان میں سے کچھ ایسے تھے جو نسبتاً آسان رسم الخط میں تھے۔ ان میں صرف چالیس کے قریب حروف استعمال

ہوئے تھے۔ کچھ ایسے تھے جو زیادہ پیچیدہ تھے اور ان میں حروف کی تعداد بھی زیادہ تھی۔ بعد کو ثابت ہوا کہ یہ عیلامی زبان تھی۔ تیسری قسم بابلی زبان کی تھی جس میں اور زیادہ الجھاؤ تھا اور اس میں خطوط اور نقاط بھی کثرت سے استعمال ہوئے تھے۔ کئی جگہ یہ تینوں کتبے ایک ساتھ بھی پائے گئے اور قدرتاً یہ خیال کیا گیا کہ ان میں ایک ہی مضمون تین مختلف زبانوں اور رسم الخط میں لکھا گیا ہے۔ دقّت یہ تھی کہ ان میں سے کسی زبان سے متعلّق بھی کچھ معلوم نہیں تھا۔

اس مہم کو سر کرنے میں اوّلیت کا سہرا ایک جرمن پروفیسر جورج فریڈرک گروٹ فنڈ (Georg Fridrich Grote Fend) کے سر ہے۔ وہ گوٹنجن یونی ورسٹی میں یونانی زبان کے پروفیسر تھے۔ انھوں نے ۴ ستمبر ۱۸۰۲ع کو یونی ورسٹی اکیڈمی کے سامنے ایک مقالہ پڑھا، جس میں پہلی مرتبہ اس زبان کے چند اصول بیان کیے گئے، لیکن چونکہ وہ مشرقی زبانوں سے نابلد تھے، اس لیے وہ اپنی تحقیقات کو کامیابی سے ختم نہ کر سکے۔ اس کے علاوہ دوسرے علما نے بھی ان کے نتائج پر کوئی خاص توجہ نہیں دی اور یوں یہ کام جہاں کا تہاں پڑا رہا۔ اس میں شبہہ نہیں کہ ان کے نظریے اور نتائج بھی تمامتر درست نہ تھے۔ اس کے بعد دوسرے عالموں نے ان کی تصحیح کی، جس سے بالآخر یہ تمام چیزیں پڑھی گئیں۔ لیکن بابلی اثریات اور میخی خط کا قفلِ ابجد کھولنے میں پروفیسر گروٹ فنڈ کا نام اور ۴ ستمبر ۱۸۰۲ع کی تاریخ زندۂ جاوید رہیگی۔

اس کے بعد نقشِ رستم کے کتبوں سے کچھ مدد ملی۔ یہ کتبے یونانی اور پرانی پہلوی میں ہیں۔ جب فرانسیسی مستشرق دساسی (De sacy) نے انھیں حل کیا، تو اس سے میخی کتبوں کے پڑھنے کا کام بھی ایک قدم اور آگے بڑھ گیا۔ اسی زمانے میں ایک دوسرے فرانسیسی مستشرق دیوپیروں (Buperron) نے اوستا کے گہرے مطالعے سے پرانی فارسی (پہلوی) کے بعض تاریک گوشوں پر روشنی ڈالی۔ غرض ان دونوں کی تحقیقات نے بھی میخی خط کو قابلِ فہم بنانے میں بہت سہولت مہیّا کی۔

یوں کام آہستہ آہستہ ہوتا رہا اور آخر متعدّد عالموں کی سالہا سال کی مسلسل

محنت کے نتیجے میں یہ عقدہ حل ہو گیا۔ اس کی قرأت کے اصول اور الفاظ کے معنی متعین ہوئے اور یوں دنیا کے علم میں ایک نئے باب کا اضافہ ہو گیا۔ اگرچہ اس سلسلے میں بہت سے حضرات کے نام لیے جا سکتے ہیں، جنھوں نے اس میدان میں قابل قدر کام کیا، لیکن ان میں سر ہنری رالنسن (Sir Henry Rawlinson) کی مساعی اور خدمات خاص طور پر بہت نمایاں اور تعریف کے قابل ہیں۔ وہ ابھی محض ۲۳ سالہ جوان تھے کہ ۱۸۳۳ء میں فوجی افسر کی حیثیت سے بھرتی ہو کر ایران پہنچے۔ انھیں اپنے کام کاج کے سلسلے میں اکثر دورہ کرنا پڑتا تھا، وہ جہاں بھی گئے، انھوں نے پرانی عمارتوں پر یہ میخی رسم الخط دیکھا۔ آدمی تھے ذہین اور متجسس طبیعت کے، انھوں نے ان میں سے چند ایک کی نقل لے لی اور ان پر غور کرنے لگے۔ وہ گروٹ فنڈ کی ابتدائی تحقیق سے بالکل ناواقف تھے۔ انھوں نے خود آزادانہ کام شروع کیا اور اپنی محنت اور فراست سے میخی خط کی کلید معلوم کر لی۔ انھیں ایک اور بات نے بھی بہت مدد دی۔ وہ بعض قدیم زبانوں سے بھی خوب واقف تھے، بالخصوص ژند کے بہت اچھے عالم تھے اور ژند قدیم فارسی سے اتنی ہی قریب ہے جتنی قدیم فارسی، میخی زبان سے۔ اسی لیے وہ اس کام کو مکمل کرنے میں کامیاب ہو گئے، جو گروٹ فنڈ نہیں کر پائے تھے۔ لیکن یہ بات ماننا پڑے گی کہ رالنسن کو بھی یہ کلید محض حسنِ اتفاق سے مل گئی۔ انھیں ہمدان کے قریب کوہ الوند پر دو کتبے ملے۔ یہ انھی تین زبانوں میں تھے، جو پرسی پولس میں پائی گئی تھیں۔ جب ان میں سے نسبتہً آسان زبان کے دونوں کتبوں پر غور کیا گیا، تو معلوم ہوا کہ بعض الفاظ کے معمولی فرق کو چھوڑ کر باقی عبارت تقریباً ایک سی ہے۔ رالنسن نے قیاس کیا، کہ ہو نہ ہو، یہ فرق والے لفظ بعض بادشاہوں کے نام ہیں، اور خوبیِ قسمت سے ان کا یہ قیاس صحیح نکلا۔ بعد کو معلوم ہوا کہ وہ تین بادشاہوں ہشتاسپ اور دارا اور کیخسرو کے نام ہیں۔ اس طرح انھیں ایک ہی جگہ اس زبان کے حروفِ تہجی میں سے چودہ معلوم ہو گئے۔ مزید محنت اور ژند کے ساتھ مقابلہ کرنے سے انھوں

نے آسان کتبوں کو مکمل طور پر پڑھ لیا، جس سے پتا چلا کہ یہ سب پرانی فارسی میں تھے۔

لیکن ابھی تک دونوں زیادہ مشکل زبانوں کے کتبے حل طلب باقی تھے۔ میڈیا کی سرحد پر ایک مشہور پہاڑی بے ستون نامی ہے۔ یہ سطح سمندر سے (۱۷۰۰) فٹ اونچی ہے۔ اس کے ایک مقام پر جو (۳۰۰) فٹ کی بلندی پر واقع ہے، دارا ہشتاسپ نے ۵۱۶ قبل مسیح میں ایک کتبہ کندہ کرایا تھا، جس میں اس نے اپنے دورِ حکومت کے کارناموں اور دشمنوں پر فتوحات کا بیان کیا ہے۔ یہ کتبہ بھی تین زبانوں میں ہے اور چونکہ خاصا لمبا ہے اور اس میں کثرت سے اسمائے معرفہ آئے ہیں، اس لیے اس سے اصل گتھی کے سلجھانے میں بہت مدد ملنے کی امید تھی۔ لیکن اس پر غور و خوض کرنے کے لیے یہ اشد ضروری تھا کہ اس کی نقل لی جائے۔ رالنسن نے بڑی جرأت سے کام لیا اور مشکلات کی پروا نہ کی۔ ان چٹانوں پر چڑھنا اور پھر وہاں بیٹھ کے اس کتبے کو نقل کرنا بڑی جان جوکھوں کا کام تھا۔ انھوں نے ان رکاوٹوں کو اپنے مقصد کے راستے میں حائل نہ ہونے دیا اور ۱۸۳۵ء میں کام شروع کر دیا۔ اس کے بعد جب بھی فرائضِ منصبی سے وقت ملتا، وہ اس جگہ پہنچ جاتے۔ اس کام میں ان کے دس بارہ برس صرف ہو گئے۔ آخرکار ۱۸۴۷ء میں انھوں نے بے ستون کا پورا کتبہ اور اس کا مکمل ترجمہ اور اس کی گرائمر کا تفصیلی بیان شائع کر دیا۔

لیکن مختلف ملکوں کے ماہرین کی سرگرمیوں اور کوششوں کے باوجود ایسے لوگوں کی کمی نہیں تھی، جو ان کے اصولوں اور قاعدوں کو خرافات کے مجموعے سے زیادہ وقعت نہیں دیتے تھے۔ آخر ۱۸۵۷ء میں انگلستان کی مشہور رائل ایشیاٹک سوسائٹی نے باہمی مشورے سے فیصلہ کیا کہ وقت آگیا ہے کہ اس بات کا امتحان لیا جائے کہ اب تک جتنا کام ہوا ہے، وہ کس حد تک علمی معیار پر پورا اترتا ہے۔ اور کیا مختلف علما کے نتائج میں اتنی مماثلت اور باقاعدگی پائی جاتی ہے کہ وہ مسلّمہ

بنیادی اصولوں کا کام دے سکیں۔ چنانچہ سوسائٹی نے اشوریات کے چار ماہرین (۱) فاکس ٹالبوٹ، (۲) ایڈورڈ ہنکس، (۳) سر ہنری رالنسن، اور (۴) یول آوپیر کے پاس ایک نیا تاریخی کتبہ ترجمے کے لیے بھیجا، جو ابھی تک شائع نہیں ہوا تھا۔ ان چاروں نے ایک دوسرے سے پوچھے بغیر اس کا ترجمہ کیا اور اسے بند لفافے میں سوسائٹی کو واپس بھیج دیا۔ چھ ماہرین کی ایک کمیٹی نے ان ترجموں پر نقد و جرح کی اور آخر وہ اس فیصلے پر پہنچے کہ معمولی اختلاف سے قطع نظر، چاروں ترجمے بنیادی طور پر یکساں اور ایک دوسرے سے بالکل قریب ہیں۔ اب مزید شک و شبہہ کا کوئی مقام نہیں تھا۔ تمام معترضوں کا منہ بند ہو گیا اور ثابت ہو گیا کہ جس نہج پر کام ہو رہا ہے، وہ صحیح ہے اور اساسی اصولوں میں سب کا اتفاق ہے۔

مزید تفصیل نہ صرف بہت اصطلاحی ہو جائے گی، بلکہ عام قارئین کے لیے اس میں کوئی دلچسپی بھی نہیں۔ مختصراً یوں سمجھیے کہ یہ زبان بھی مصری ہیروغلیفی کی طرح تصویری اصول پر مبنی ہے اور بائیں سے دائیں کو لکھی جاتی تھی۔

بابلی زبان عربی ہے:

اس امر میں سب علما کم و بیش شروع سے متفق تھے کہ بابلی زبان سامی گروہ سے ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ یہ زبان نہ صرف سامی الاصل ہی ہے، بلکہ بالکل عربی ہے۔ البتہ اتنا فرق ہے کہ یہ آج سے چار ہزار برس پہلے کی عربی ہے۔ ہمارا تجربہ بتاتا ہے کہ سو برس کی قلیل مدّت میں بھی زبان میں اتنی تبدیلی ہو جاتی ہے کہ ظاہراً بالکل نئی زبان معلوم ہونے لگتی ہے۔ انگریزی ہی کو دیکھیے شیکسپیئر تک جانے کی ضرورت نہیں کہ وہ آج سے تین سو برس پہلے گذرا ہے۔ پچھلی صدی کے مصنّفین میں سے کسی کو لے لیجیے۔ ان میں سے کسی کی زبان، طرزِ تحریر، اسلوب اِنشا وہ نہیں، جو ہمیں آج کل کے ادیبوں کے ہاں ملتا ہے۔ لیکن اس تبدیلی اور اختلاف کے باوجود ہم کبھی نہیں کہتے کہ یہ کوئی دوسری زبان ہے۔ اور یہ حقیقت ہے، کہ بنیادی طور پر زبان وہی ہے، یعنی اس کے

اصول نہیں بدلے۔ ہاں اس کی ظاہری شکل و صورت بدل گئی ہے۔ نئے نئے لفظ عالم وجود میں آگئے ہیں اور کتنے پرانے لفظ متروک ہو گئے ہیں۔ اور یہ ہونا بھی چاہیے تھا۔ زبان آلہ ہے، ہمارے اظہار خیال کا۔ اور خیال پیدا ہوتے ہیں عالمگیر تمدن سے، مقامی گرد و پیش کے حالات سے، ذاتی تجربے اور شخصی امیال و عواطف سے۔ اور یہ سب چیزیں جامد نہیں، بلکہ متحرک ہیں۔ اس لیے یہ لازمی بات ہے، کہ جیسے جیسے ہمارے تمدن اور حالات اور تجربات میں تبدیلی واقع ہو، ویسے ہی ہمارے خیالات اور ان کے اظہار کے لیے جو زبان ہم استعمال کرتے ہیں، اس میں بھی تبدیلی ہوتی جائے۔

مثال کے طور پر اردو کو لیجیے۔ دکنی زبان کو چھوڑ دیجیے، کہ یہ بہت ابتدائی دَور ہے اور زبان ابھی تعمیری مراحل طے کر رہی تھی۔ لیکن میر اور سودا اور درد کے زمانے سے متعلق آپ یہ نہیں کہہ سکتے۔ اب زبان پختہ ہو چکی تھی اور وہ ہر طرح کے خیالات کے اظہار پر قادر تھی۔ لیکن کیا میر و میرزا کی زبان وہی ہے، جو داغ اور امیر کی زبان تھی۔ بلکہ کیا داغ اور امیر کی بھی وہی زبان ہے، جو آج ہماری نئی پود لکھ رہی ہے، حال آنکہ ان میں نصف صدی کا وقفہ بھی نہیں۔

اگر سو دو سو برس میں زبان کا یہ حال ہو جاتا ہے، تو ہم کیسے خیال کر سکتے ہیں کہ پانچ چار ہزار برس پہلے کی عربی اور قرآن کی عربی میں کوئی تفاوت نہیں ہو گا اور مزید برآں اس میں کیا شبہہ ہے کہ قرآن کی زبان اور موجودہ عربی میں بھی کوسوں کا فاصلہ ہے۔

میں ذیل میں صرف فصل الف کے چند الفاظ لکھتا ہوں، اس التزام کے ساتھ کہ ان کے قدیم معانی اور موجودہ صورت اور معانی بھی ساتھ درج کر دیے گئے ہیں۔ اس سے آپ اندازہ لگا سکینگے کہ میرا یہ دعویٰ کہاں تک صحیح ہے کہ بابلی زبان دراصل عربی ہے۔

بابلی زبان	معنی	موجودہ عربی	معنی
اب (۱)	باپ	اب ابو	باپ
ابوب	سیلاب، طوفان	ہبوب	طوفانِ باد
اپل	بیٹا	خلف	بیٹا، جانشین، پیچھے آنے والا
اپیر	زمین، کرۂ ارض	(۲) ارض	زمین
		عفر	مٹی گرد
		عفر	خاک میں ملنا، لتھڑنا، زمین پر پٹکنا
		حفرہ	گڑھا، سوراخ
		حفر	گڑھا کھودنا
ات	تو (ضمیر واحد غائب)	انت	تو (ضمیر واحد غائب)
ات	فوج، لشکر	عتاد	سامانِ حرب
اجار	کرایہ پر لینا	اجر	کرایہ پر لینا
اجر	کرایے کا ملازم	اجیر	کرایے کا ملازم
اُجر	علاقہ، گرد و نواح	جار (۳)	پڑوسی، ہمسایہ
اجزو	خراج	جزیہ (۴)	خراج (جو ذمیوں سے لیا جاتا ہے)

(۱) بابلی الفاظ میں آخری حرف عام طور پر مضموم ہوتا ہے

(۲) جہاں اس طرح ایک سے زیادہ لفظ دیے گئے ہیں، اس کا یہ مطلب ہے کہ یہ تمام الفاظ پرانے بابلی لفظ کے قریب المعنی ہیں، اور عین ممکن ہے کہ یہ سب اسی کی مختلف شکلیں ہوں۔

(۳) اردو کا یار (دوست) اسی کی بدلی ہوئی شکل ہے

(۴) اس سے ثابت ہوا کہ جزیہ عربی میں دخیل نہیں بلکہ شروع سے اس زبان میں مستعمل ہے۔

اخ	بھائی، پہلو، کنارہ (دریا)	اخ	بھائی
اخاذ	لینا، پکڑنا	اخذ	لینا، پکڑنا
احاط	پہلو، گردوپیش کا علاقہ	احاط	گھیرنا
اخر (جمع اخرات)	مستقبل	اخّر	دیر کرنا، روکنا، حائل ہونا
اخو	مخالف، اجنبی، مختلف	عدو	دشمن۔ مخالف
ادو	میرِ قافلہ، کپتان	قائد (۲)	رہ نما، میرِ قافلہ، سپہ سالار
ادی	تک (حرف جار)	حتیٰ	تک (حرف جار)
ادیس	نیا ہونا (کسی چیز کا)	حدیث	نیا، قریب العہد، جدید
(۳) اس	نیا، قریب العہد (قسم کا)		
اُذن	کان	اُذن	کان
اُر	دن، دن کا اجالا	رائی	دیکھنا
		رائع	دن دہاڑے، روز روشن
		ری	اچھی شکل، خوبصورت منظر
ارب	محصول، آمدنی	رَبا	بڑھنا
		رِبا	سود، بیاج
		اربہ	مالیہ، لگان
		ضریبہ	محصول، ٹیکس
		ربح	جیتنا، کمانا، نفع حاصل کرنا
		رِبح	جیت، نفع
اراض	نیچے کی طرف جانا، نیچے بھیجنا	ارض	زمین، نچلی چیز، نچلا حصّہ
		ارضیہ	کسی چیز کی تہ

(۲) آج بھی تقریباً تمام عربی ممالک کے دارجہ میں ق کی آواز الف کی سی ہے۔

(۳) اس بکسر کا مطلب یہ ہے کہ یہ لفظ اپنے ماقبل سے مشتق ہے۔

اراک	لمبا ہونا، دیر سے آنا	اخر	دیر کرنا، ملتوی کرنا
۔ اراکو	پیچھے	آخر	آخری
		وراء	پیچھے
۔ ارک	بعد	ارک	بیٹھنا
اربع	چار (عدد)	اربع	چار (عدد)
		اربعہ	
ارد	غلام، نوکر	عرض (۱)	کمینہ، بے ہودہ شخص
		عَرض	کسی چیز کا عام حصّہ
		ابنِ ارض	وہ شخص جس کے ماں باپ کا علم نہ ہو۔
ارخ	مہینا	اَرّخ	تاریخ ڈالنا
۔ ارخشم	ماہانہ، ماہواری		
ارخس (ارعس)	تیزی سے، جلدی سے	سریع	تیزی سے
اِرشت	زمین	ارض	زمین
ارق	سبز	روق، ریق	ہر چیز کا شروع کا اچھا حصّہ، رونق (جوانی کی)
		اخضر	سبز
ارد (۲)	جرم، قصور، جرمانہ	ران	بدکار ہونا، گندہ ہونا
اِرنت	فتح، کامیابی	ران (علی رب)	غالب آنا

(۱) عربی میں ض کا تلفظ دال سے بہت ملتا جلتا ہے۔ ہمارے ہاں اس میں اور ذال کے تلفظ میں بہت کم فرق کیا جاتا ہے جو درست نہیں۔

(۲) رِن (سنسکرت)۔ قرض

اُرو	لانا، بھیجنا، منگوانا، بھجوانا۔	رائی	دیکھنا
		احضر	پیش کرنا، حاضر کرنا
اِریب	داخل ہونا، اندر لانا	قرب (۱)	نزدیک آنا
اِرِیس (اریش)	بیج بونا، پودا لگانا	حرث	ہل چلانا، زمین جوتنا
		غرث	بونا، درخت لگانا
اِرلیس	مانگنا، طلب کرنا، درخواست کرنا	عرض	طلب کرنا، پیش کرنا
اساب (اثاب)	رہنا، مقیم ہونا، جائے قیام	عاش	رہنا سہنا، جینا، زندگی کرنا
است	مشکل، ناقابل گزار	سد	مضبوط دیوار، روک، بند، پہاڑ
		[illegible]	سخت، مضبوط، مشکل، قوی
است	بیوی	ست	عورت، بیوی
		ستیدہ	
اِسد	بنیاد، نیو	اساس	بنیاد، نیو
اشر	ذلیل، حقیر، عاجز، مسکین، معمولی۔	اسیر	قیدی
اِشل	رسا	سلالہ	اولاد، نسل، خاندان
		حبل	رسی
اسیر	گھیرنا، قید کرنا، گرفتار کرنا۔	اسر	قید کرنا، گرفتار کرنا
اِسیب	جادوگر (۲)		
اِش	لکڑی	خشب	لکڑی

(۱) یہاں بھی ق کا تلفظ الف کا سا ہے۔
(۲) آسیب (فارسی) ۔جادو۔ٹونا۔

اَشرت	منصوبہ، تجویز، تدبیر	شوریٰ	مشورہ صلاح، رائے
		مشورہ	نصیحت
اِشید	فصل یا کھیتی کاٹنا	حصد	فصل یا کھیتی کاٹنا
اصنان	دانہ، غلہ	صنو (ج: اصنان)	ایک جڑ میں سے نکلے ہوئے متعدد درختوں میں سے ایک۔
اِقل	کھیت	حقل	کھیت
اکال	کھانا (فعل)	اکل	کھانا (فعل)
اُکلو	کھانا (اسم) خوراک	اکل، اکلہ	کھانا (اسم) خوراک، طعام
اکل	کاتب، سیکرٹری	عاقل	عقلمند آدمی
ال	شہر، قصبہ	حِلہ	گاؤں، قریہ، دِہ
		آل	خاندان، قبیلہ، اولاد
		اہل	گھر، مکان
اُل	کلمۂ نفی، نہ	لا	کلمۂ نفی
الاد	جننا	ولد	جننا
الاک	جانا	الک (۱)	کسی دوسرے کی طرف بھیجنا
الپ	بیل	اِبل	اونٹ
اِلک	حکم دینا، اقتدار یا اختیار حاصل ہونا	مَلک	قابض ہونا
		مُلک	حکم، اختیار
اُم	ماں، والدہ	اُمّ	ماں، والدہ
اُم	پس، اس طرح، مندرجۂ ذیل	ثُمّ	پھر، اس کے بعد
		اَمّا	لیکن (حرف شرط وتاکید)
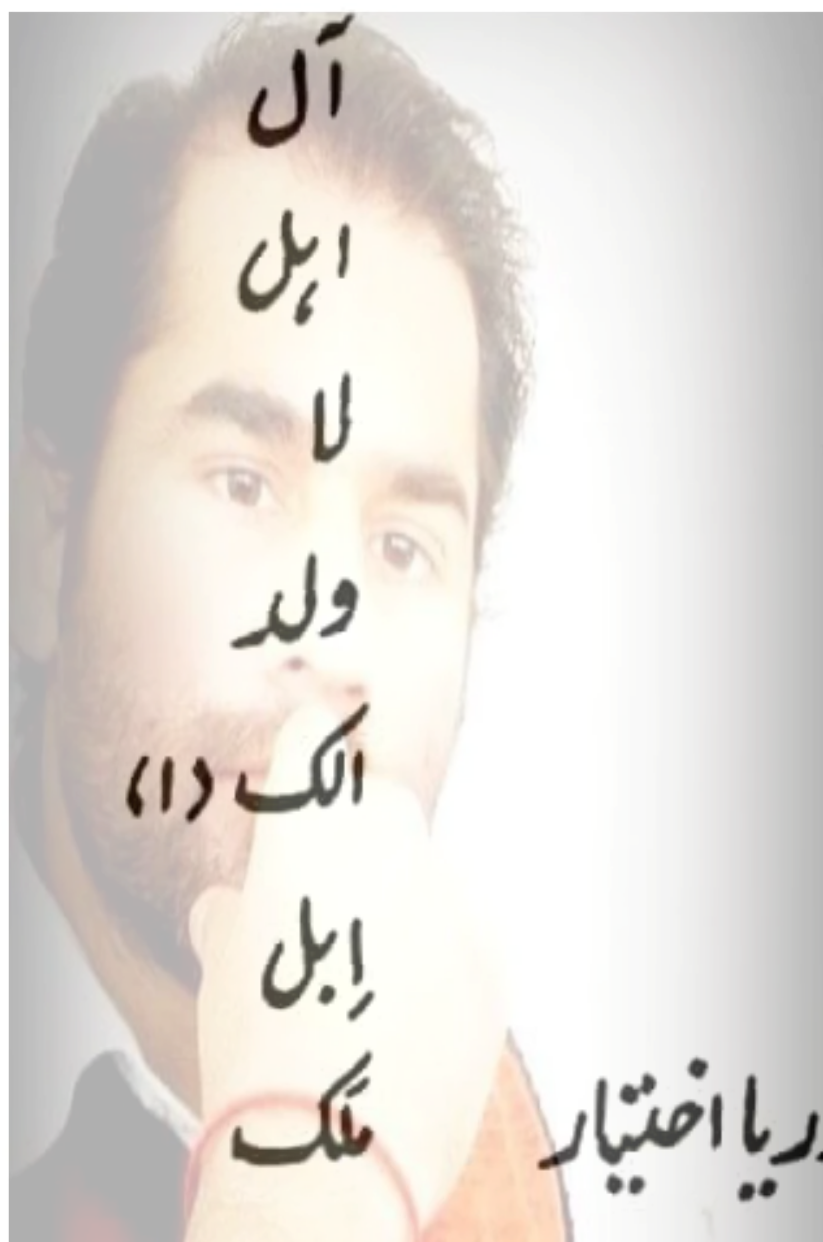
(۱) مَلک (فرشتہ) اسی سے مشتق ہے یعنی وہ جو بھیجا جائے

اِما	اندر، کہاں، جہاں کہیں	ما	کیا
		اِنّی	کہاں، کب، کیسے
امات	لفظ، چیز، مادہ	مادّہ	چیز
اوات	قضیہ، مقدمہ		اصل، بنیاد، قانون کی دفعات
اَمت	باندی، لونڈی	اَمت، اَمتہ	باندی، لونڈی، کنیز
اُمت	فوج، لشکر	اُمّت، اُمّتہ	، قوم، لوگ، گروہ، جتھا
امار	دیکھنا، معاینہ کرنا، پانا	رائی	دیکھنا، معاینہ کرنا
		مرآۃ	آئینہ
اِن	وقت، اس وقت	آن	وقت، زمانہ
۔اِنومشو }		حین	اس وقت
۔اِمیذ }		حینئذٍ	تب، اس وقت، کسی وقت
اناک	میں (ضمیرِ واحد متکلم)	اَنا	میں
انان		الآن	اب
اِنما	جب	حینما	جب، جب کبھی
		اینما	جہاں کہیں
انّو	یہ (اشارہ)	اَن، اِنّہ	یہ، وہ (اشارہ)
اُوم	دن	یوم	دن
۔اومشم	روزانہ	یومی	روزانہ
اِلیشو	باہر جانا، باہر نکلنا، باہر لانا، خارج ہونا۔	شیّع	وداع کرنا، رخصت کرنا، مشایعت کرنا
		شاع	پھیلانا، شائع کرنا
۔شیت } ۔موشو }	مخرج، نکلنے کی جگہ	شتّ	بکھرنا، پراگندہ ہونا، منتشر ہونا
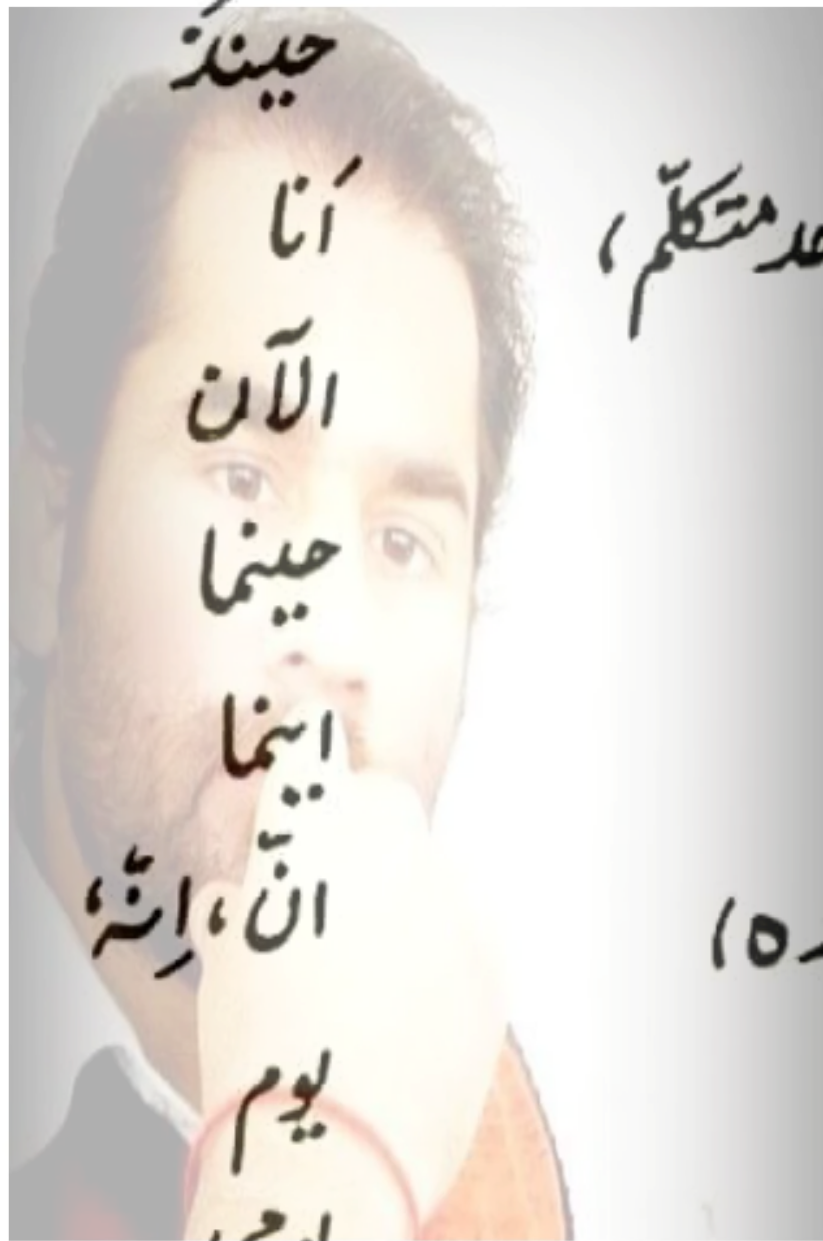
بابلی	معنی	عربی	معنی
ایکل	محل	قلعہ	قلعہ، کوٹ
		حقل	بڑا کھیت، جاگیر
ایل (مذکر)	دیوتا	اِلاہ	دیوتا، معبود
اِیلت (مونث)	دیوی	اِلاہہ	دیوی
اِیلّپ	جہاز	فُلک	کشتی
اَیٔل	روشن	لالاء	چمکنا
		لؤلو	چمکدار موتی
		ولّع	روشن کرنا، چمکانا

بعض الفاظ ایسے ہیں جو دنیا بھر کی زبانوں میں ایک سے ہیں۔ مثلاً بعض قریبی رشتے ہیں۔ اب، ابا، باپ، بابو، وغیرہ۔ یہی حال اعداد کا ہے یہ بھی بیشتر سب جگہ ملتے جلتے ہیں۔ لیکن آپ نے ملاحظہ کیا ہوگا کہ بابلی اور عربی زبانوں میں یہ مماثلت ان ابتدائی کلمات ہی تک محدود نہیں، بلکہ اس کا دائرہ بہت وسیع ہے جو عام حالات میں ناممکن ہے۔ یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ دونوں زبانیں ایک ہیں، البتہ نئی اور پرانی کا فرق ہے۔

۲- ادبیات

بابل میں مختلف مقامات کی کھدائی سے ایسی تختیوں کی بہت بڑی تعداد دستیاب ہوئی ہے، جن پر کوئی نہ کوئی تحریر یا دستاویز پائی جاتی ہے۔ لیکن اگر ہم ان میں سے قانونی اور تاریخی اور علمی دلچسپی کی تحریریں الگ کردیں، تو بہت کم ایسی باقی رہ جاتی ہیں، جن کا موضوع خالص ادبی ہے کیونکہ یہ تمام کی تمام کسی نہ کسی حیثیت سے بلاواسطہ

---

۵ اور ان کی بھی بہت بڑی تعداد ملی ہے۔

یا بالواسطہ طور پر مذہب اور عوام کے معتقدات سے متعلق ہیں۔ ان میں یا تو ان کے دیوی دیوتاؤں کے کارناموں (اور کرتوتوں) کا حال بیان ہوا ہے یا پھر ایسی نظمیں ہیں جو اگر اونچے درجے کی ہیں، تو وظائف و اوراد، حمد و ثنا، مناجات وغیرہ بھی جا سکتی ہیں۔ اور اگر اس سے نچلی سطح پر اتر آئیں، تو جادو ٹونے اور جھوٹ منتر سے زیادہ نہیں۔

ان سب کی دو خصوصیتیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اوّل تو یہ کہ ہمیں ان میں سے کسی ایک کے بھی مصنف کا نام معلوم نہیں۔ ان میں سے بیشتر نینوا کے بادشاہ اشور بنی پال (۶۶۸-۶۲۶ ق م) کے کتابخانے سے ملی ہیں۔ اس بادشاہ نے ملک بھر کی نئی پرانی کتابوں کی نقلیں دارالخلافے کے مرکزی کتابخانے میں جمع کر لی تھیں۔ اب یا تو کاتبوں اور نقل کرنے والوں نے بے احتیاطی سے کام لیا اور تحریر کے ساتھ مصنّف اور مؤلف کا نام نہیں لکھا۔ یا پھر اصل نسخوں میں بھی یہ کمی تھی اور وہ اس میں بیقصور ہیں۔

دوسری قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اب تک کوئی ایک بھی ایسی تحریر نہیں ملی جسے ہم "ادب برائے ادب" کی صنف میں جگہ دے سکیں۔ اب یہ تو ماننے کی بات ہے نہیں کہ بابلی لوگوں کے پاس مذہب کے علاوہ، دلچسپی کا کوئی اور سامان نہیں تھا۔ مثلاً مصر ہے۔ یہاں بھی ہمیں مذہبی کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ ملا ہے۔ لیکن اس کے علاوہ نظم و نثر میں ادبیات کی دوسری قسمیں بھی مفقود نہیں۔ افسانے ہیں، ڈرامے ہیں، غزلیں ہیں۔ غرض خالص دنیوی قسم کی تحریریں بھی بڑی تعداد میں ملی ہیں۔ اس کے برعکس بابل میں مذہبی یا نیم مذہبی چیزوں کے علاوہ اور کوئی چیز ہے ہی نہیں۔ شعر و شراب، راگ رنگ، عشق و محبت کے مضمون پر تحریریں بالکل معدوم ہیں۔ ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ یہ لوگ مذہب کے اتنے گرویدہ اور دلدادہ تھے کہ وہ کسی اور بات سے متعلق سوچتے ہی نہیں تھے۔ ہمیں معلوم ہے کہ وہ شراب بھی پیتے تھے اور عورتوں سے عشق بازی بھی کرتے تھے۔ ان میں خون خرابہ بھی ہوتا تھا اور وہ عام جذباتِ رشک و حسد سے بھی مبرّا نہیں تھے۔ چنانچہ ایسی تصویروں کی کمی نہیں، جن کا موضوع خالص

انسانی الفت و محبت اور دوسری دلچسپیوں کے سوائے اور کچھ قرار دیا ہی نہیں جاسکتا۔ ممکن ہے مستقبل میں کسی اور جگہ کی کھدائی سے یہ کمی بھی پوری ہو جائے، لیکن اب تک جو کچھ دستیاب ہوا ہے، اس میں یہ صنفِ ادب بالکل نہیں ملتی۔

جو تحریریں کم و بیش مکمل حالت میں ملی ہیں، ان میں سے زیادہ اہم اور قابلِ ذکر یہ ہیں۔

(۱) افسانۂ جلجِ موس (قصۂ طوفان اسی کا ایک حصہ ہے)۔

(۲) داستانِ خلق۔

(۳) عِشتار دیوی کا پاتال کا سفر۔

(۴) تائبِ اِنلیل کی آپ بیتی۔

۱۔ افسانۂ جلجِ مُوس:

یہ بابلی ادب کی سب سے طویل نظم ہے۔ اس میں ایک پرانے ہیرو جلجِ مُوس کے حالات بیان ہوئے ہیں۔ یہ ایک بارہ تختیوں پر لکھا ہوا ملا ہے، جن سے متعلق یہ خیال کیا گیا ہے، کہ غالباً ان میں سے ہر ایک سال کے کسی خاص مہینے میں پڑھی جاتی تھی۔ یہ نظم نیم تاریخی، نیم ادبی حیثیت رکھتی ہے، بالکل اسی طرح جیسے ہندستان کے پرانے ادب میں راماین اور مہا بھارت ہیں۔ بلکہ مہابھارت سے اس کی ایک اور مماثلت بھی ہے، یعنی نظم کے ہیرو جلجِ مُوس کے گرد جو واقعات اور حالات جمع کر دیے گئے ہیں، سب جگہ ان کا تعلق سخت اور مضبوط نہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ جوں جوں زمانہ گزرتا گیا، بعد کے مؤلف اور شارح اصلی تحریریں اَدل بدل کرتے رہے اور اس طرح دنیا جہان کے قصّے جلجِ مُوس سے منسوب کر دیے گئے۔ کبھی تو اضافہ شدہ بات ایسی کھپ گئی کہ کہیں سے بے جوڑ معلوم نہیں ہوتی۔ اور کسی جگہ یہ پیوند ایسا اُوپری قسم کا ہے، کہ صاف معلوم ہو جاتا ہے، کہ یہ بعد کو اضافہ ہوئی ہے۔ اردو میں اس کی مثال فسانۂ آزاد ہے۔ سرشار نے مشرق و مغرب کے قصّوں کا تانا بانا میاں آزاد کے گرد تَن دیا ہے، جو کہیں تو اتنا مضبوط ہے کہ کسی کو انگلی رکھنے

کی گنجائش نہیں اور کتنی جگہ یہ تعلق محض سرسری ہے۔

بہرحال اب افسانۂ جلجمیش سنیئے۔

افسانے کے آغاز ہی میں جنوبی سومر کا شہر اریخ کسی دشمن کے محاصرے میں ہے۔ باشندے سخت پریشان اور گھبرائے ہوئے ہیں۔ یہ نہیں کھلا کہ یہ دشمن کون تھا اور اہلِ اریخ کو کیسے اس سے نجات حاصل ہوئی۔ اس کے بعد یک لخت ہم جلجمیش[1] سے دوچار ہوتے ہیں، جو شہر پر حکمران ہے، لیکن رعایا اس کے ظلم وستم اور سخت گیری سے نالاں ہے۔ نوجوانوں کو اس نے پکڑ پکڑ کے فوج میں بھرتی کر لیا اور دوشیزاؤں کو اپنے دربار کی زینت بنا لیا۔ افسانے کے الفاظ ہیں:-

"جلجمیش نے باپ کے پاس بیٹا نہیں چھوڑا،

نہ جوان کے لیے معشوقہ، نہ شوہر کے لیے اس کی بیوی"

مخلوق نے تنگ آکے دیوتاؤں سے فریاد کی کہ کسی طرح ہمیں اس مصیبت سے نجات دلائیے۔ اس پر سب دیوتا مل کر اُرُورُو دیوی کے پاس گئے، کہ آپ ہی (مردوخ کے ساتھ) انسانوں کی تخلیق کے لیے ذمہ دار ہیں، اب آپ ہی کوئی اور شخص پیدا کریں، جو جلجمیش کا مقابلہ کر سکے۔ چنانچہ اُرُورُو نے ایک اور ہستی پیدا کی، جس کا نام ایابنی[2] تھا۔ اگرچہ ایابنی میں دیوتاؤں کی صفات تھیں، لیکن اس کی شکل عجیب وغریب اور ڈراونی قسم کی تھی۔ سارے جسم پر لمبے لمبے بال، جیسے عورتوں کے سر پر ہوتے ہیں۔ سر اور اوپر کا دھڑ اور بازو مرد کے، لیکن ٹانگیں اور نیچے کا حصۂ جسم درندوں کا سا۔ وہ جنگل میں جانوروں اور درندوں ہی کے ساتھ رہتا تھا۔ جلجمیش کو بھی خبر مل گئی کہ دیوتاؤں نے اس کے مقابلے کے لیے ایابنی کو پیدا

---

[1] پہلے اس نام کو ازدوبر پڑھا گیا تھا، اسی لیے شروع کے ترجموں میں اس تحریر کا عنوان افسانۂ ازدوبر ملتا ہے۔

[2] بعض اصحاب نے اس کا تلفظ انکیدو کیا ہے۔

کیا ہے۔ اس نے سوچا کہ میں کیوں ہاتھ پر ہاتھ دھرے خاموش بیٹھا رہوں اور دشمن کو موقع دوں کہ وہ طاقت پکڑ جانے کے بعد مجھ پر حملہ آور ہو۔ چنانچہ اس نے فوراً ایک ماہر شکاری شیدو کو جنگل روانہ کیا کہ جیسے بھی بنے، اِیابنی کو گرفتار کر لاؤ۔ شیدو تین دن رات گھات لگائے بیٹھا رہا۔ اس نے اِیابنی کی نقل و حرکت کا بغور مطالعہ کیا، کہ وہ کب دوسرے جانوروں کے ساتھ گھاٹ پر پانی پینے آتا ہے اور اس کی چلنے پھرنے کی عادات کیا ہیں۔ اس نے اسے پھانسنے کے لیے جگہ جگہ گڑھے کھودے اور جال بچھا دیے، لیکن بےسود۔ اِیابنی بھی ایک کائیاں تھا۔ وہ ہر جگہ پھونک پھونک کے قدم رکھتا۔ جال کو توڑ پھوڑ دیتا اور گڑھے مٹی سے پاٹ دیتا۔

شیدو کو کھلے میدان میں نکل کے اِیابنی سے دو دو ہاتھ کرنے کی کبھی جرأت نہ ہوئی۔ اس نے محسوس کیا، کہ وہ تن تنہا اس کے سامنے نہیں ٹھہر سکیگا۔ چنانچہ اس نے واپس آکے جِلجِ مُوس کو صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ جِلجِ مُوس کو مایوسی تو بہت ہوئی، لیکن وہ حوصلہ نہیں ہارا۔ اب وہ ایک اور چال چلا۔ اس نے اریخ کے عِشتار دیوی کے مرکزی مندر کی ایک حسین و جمیل دیوداسی اوخت نامی شیدو کے ساتھ روانہ کردی اور اسے سمجھا دیا کہ جس جگہ اِیابنی ندی کے کنارے پانی پینے آتا ہے، وہاں کمین میں چھپ کے بیٹھ جاؤ۔ جس وقت وہ آئے، تم اپنے کپڑے اتار کے اس کے سامنے جاؤ اور اسے رِجھانے کی کوشش کرو۔ جب وہ تمھاری طرف مائل ہو، تو کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھو کہ وہ پوری طرح تم پر فریفتہ ہو جائے۔ اس صورت میں جنگل کے جانور اور درندے خود بخود اس کا ساتھ چھوڑ کے چل دینگے۔ پھر تم اسے دم دلاسا دے کے اپنے ساتھ لوا لاؤ۔ یہ چال پوری طرح کارگر ہوئی۔ اِیابنی جو شیدو کے جال میں نہیں آیا تھا، اوخت کے دامِ زلف میں ایسا پھنسا کہ وہ اسے انگلیوں پر نچانے لگی۔ جب اوخت نے دیکھا کہ اب یہ وحشی رام ہوگیا ہے اور کہیں نکل کے نہیں جا سکتا تو اس سے کہنے لگی کہ تم یہاں جنگل میں کیوں رہتے ہو۔ تم ایسے سُورما، ایسے عقلمند، دیوتاؤں کی صفات کے حامل، تمھیں تو چاہیے کہ چل کے شہر میں دوسرے آدمیوں کے ساتھ

بودوباش اختیار کرو، نہ کہ یہاں جنگل کے جانوروں کے ساتھ زندگی کے دن گزارو۔ اریخ میں جلجموس بادشاہ ہے۔ وہ ایک محل میں رہتا ہے، آؤ، چلو اس کے پاس۔ وہ تمھیں ہاتھوں ہاتھ لیگا۔ ایابنی کے منھ کو خون تو لگ ہی چکا تھا۔ جب تک اس نے عورت نہیں دیکھی تھی وہ جنگل کے چوپاؤں ہی کے ساتھ مگن تھا۔ اب وہ بھی ایک رفیق اور ساتھی کی ضرورت محسوس کرنے لگا تھا۔ جب اوخت نے اسے یہ مشورہ دیا تو وہ اس کے ساتھ جلجموس کے پاس اریخ چلنے پر رضامند ہو گیا۔ یہاں جلجموس نے اس کی مناسب آو بھگت کی اور باہمی گفت گو سے تمام غلط فہمیاں دور ہو گئیں اور وہ ایک دوسرے کے دلی دوست بن گئے۔

جب جلجموس کو اس طرف سے اطمینان ہو گیا، تو اس نے اریخ کے روایتی دشمن عیلام[۵] سے پرانا حساب چکانے کی ٹھانی۔ چنانچہ ایابنی کی مدد سے اس نے عیلام پر حملہ کر دیا۔ یہاں کا بادشاہ خمباب تھا۔ یہ مہم ہر طرح کامیاب رہی اور دونوں دوست خمباب کو قتل کر کے واپس لوٹے۔

یہاں تک تو خیر گذری، لیکن اب انھیں گردشِ ایام نے آن گھیرا۔ جلجموس کے حسن و شباب اور شان و شوکت کو دیکھ کر عِشتار دیوی اس پر عاشق ہو گئی۔ اس نے اسے دعوت دی کہ مجھ سے شادی کر لو، تو میں تمھیں دیوتاؤں کا ہمسر اور ان کا مخدوم بنا دونگی۔ لیکن جلجموس نے اس کی دعوت حقارت سے ٹھکرا دی۔ اور اسے طعنہ دیا کہ تم نے آج تک جن نصف درجن قسمت کے ماروں سے شادی کی ہے، اُن کا کیا حشر ہوا ہے اور انھیں تم نے کس کس عذاب اور تکلیف سے موت کے گھاٹ اُتارا ہے کہ اب مجھ پر نظرِ کرم ہوئی ہے۔ مجھے اس شرف سے معاف ہی رکھو۔ کہاں تو عِشتار اس پر دل و جان سے فدا ہو رہی تھی اور کہاں اس کے طعنے مہنے سُن

---

۵ بعض مضمون نگاروں نے اسے عیلام کی جگہ امانوس سے جنگ بیان کیا ہے۔ امانوس آج کل ترکی کا جنوبی اور سوریا کا شمالی علاقہ ہے۔

کے وہ جل اٹھی۔ اس نے تہیہ کر لیا کہ اسے اس تحقیر کا مزہ چکھاؤنگی۔ وہ روتی بسورتی اپنے والد انو دیوتا کے پاس گئی اور اس سے شکایت کی کہ جلجموس نے میری محبت کو ٹھکرا کے میری سخت ہتک کی ہے، اسے اس کی سزا ملنا چاہیئے۔ انو نے پہلے تو اس کے غصے کی آگ پر پانی ڈالنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ ہوا کے گھوڑے پر سوار تھی، اس نے ایک نہ سنی اور اصرار سے مطالبہ کیا کہ ایک عظیم الجثہ اور طاقتور سانڈ پیدا کیا جائے، جو جلجموس کو ملیا میٹ کر دے۔ انو بیٹی کی ضد سے مجبور ہو گیا اور اس نے علو نامی سانڈ پیدا کیا۔

دونوں دوستوں نے مل کر اس سانڈ کو بھی ٹھکانے لگا دیا۔ اب عشتار ایابنی کے بھی خلاف ہو گئی اور سب سے پہلے اس نے اسی کو ختم کیا۔ ایابنی کی موت سے جلجموس کا زبردست بازو ٹوٹ گیا۔ لیکن عشتار نے اسے بھی نہیں چھوڑا۔ جب اور کوئی داؤ نہ چلا، تو اسے قسم قسم کی بیماریوں میں مبتلا کر دیا۔ جلجموس نے دیکھا کہ اگر میں جلد ان کا علاج نہیں کرتا، تو میں بھی ایابنی کے ساتھ جا ملونگا۔ اس پر اس نے اپنے ایک مورثِ اعلیٰ اُت ناپشتم کی تلاش شروع کی، جو ماضی میں موت پر فتح پانے میں کامیاب ہو گیا تھا اور اب دیوتاؤں کی طرح امر تھا اور موت اس کے نزدیک نہیں پھٹک سکتی تھی۔

بہت مصیبتیں جھیلنے اور ہفتخواں طے کرنے کے بعد وہ اُت ناپشتم کے پاس پہنچا۔ اس نے اُت ناپشتم سے دریافت کیا کہ موت سے چھٹکارا پانے کا کیا طریقہ ہے؟ اُت ناپشتم نے جواب دیا کہ یہ ناممکن ہے جب تک دنیا قائم رہیگی، بنی آدم کو موت سے مفر نہیں۔ اس پر جلجموس نے کہا کہ اگر یوں ہے، تو آپ بھی تو بنی نوعِ انسان کے فرد ہیں، آپ کیسے عمرِ جاودانی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے؟ اس کے جواب میں اُت ناپشتم نے اپنے حالات سنائے، جو قصۂ طوفان کے نام سے مشہور ہیں (اور جنھیں ہم تفصیل سے آگے لکھ رہے ہیں)۔ پھر اس نے کہا کہ میں تمھیں موت کے چنگل سے تو نہیں بچا سکتا، البتہ تمھارے تمام امراض دور کر کے تمھیں دوبارہ تندرست بنا سکتا ہوں۔ اس کے بعد اس نے جلجموس کو پتا دیا کہ فلاں جگہ ایک بوٹی ملتی ہے، جس کے کھانے سے انسان اپنی عمر لمبی کر سکتا ہے۔ یہ سنتے ہی جلجموس اس بوٹی کی تلاش میں روانہ ہو گیا۔ بڑی سرگردانی

کے بعد وہ اسے لے کے اریخ واپس آرہا تھا کہ راستے میں جب وہ ایک ندی کے کنارے پانی پینے کو بیٹھا تو ایک دیو اس بُوٹی کو چُرا کے لے بھاگا۔ جلجِ موس نے اس دیو سے (جس کی شکل اژدھے کی تھی) اسے حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن وہ اس میں کامیاب نہیں ہوا اور آخر کار بے نیلِ مرام اریخ واپس چلا آیا۔

آخری چند سطروں میں وہ ایابنی کو یاد کرکے روتا ہے اور اسی پر یکایک نظم ختم ہوجاتی ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد بھی کچھ واقعات ضرور ہونگے لیکن یہ دستیاب نہیں ہوئے۔

۲۔ قصۂ طوفان:

یہ قصّہ دراصل افسانۂ جلجِ موس ہی کا حصّہ ہے۔ اس کے اور بھی کتنے الگ نسخے دستیاب ہوئے ہیں۔ ان میں سب سے پُرانا سُومری عہد کا ہے، جہاں یہ بہت سادہ ہے۔ لیکن جوں جوں زمانہ گزرتا گیا، زیبِ داستان کے لیے اس میں اضافے ہوتے گئے۔

ہم نے دیکھا کہ جب جلجِ موس نے عِشتار دیوی کی پیشکش ٹھکرادی، تو اس نے ناراض ہوکر جلجِ موس کو مختلف موذی امراض میں مبتلا کردیا۔ جلجِ موس کی جان کے لالے پڑگئے۔ دہ جا بجا علاج کے لیے مارا مارا پھرنے لگا۔ وہ چاہتا تھا، کہ کہیں سے کوئی ایسی دوا ملے جس کے استعمال سے انسان موت کے پنجے سے رہائی پاسکے۔ آخرکار پوچھ گچھ سے اسے معلوم ہو، کہ اس کا ایک مورثِ اعلیٰ اُت ناپشتم حیاتِ ابدی حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا تھا اور وہ ابھی تک زندہ ہے۔ جلجِ موس اس کی تلاش میں روانہ ہوا اور ہر طرح کی مشکلوں پر قابو پاکر وہ اس کے پاس پہنچ گیا۔ جب اس نے اُت ناپشتم سے درخواست کی کہ بتائیے، آپ نے کیسے موت پر فتح پائی، تو اس نے ایک طوفانِ عظیم کا واقعہ بیان کیا، جس سے صرف وہ اور اس کا خاندان ہی نجات پاسکے تھے۔ یہ حصّۂ نظم یوں شروع ہوتا ہے:

جلجِ موس نے اس سے کہا، اُت ناپشتم سے، اس دور دراز کی جگہ میں

"اُت ناپشتم! میں تو دیکھتا ہوں
"آپ بھی دیکھنے میں کچھ انوکھے نہیں جیسا میں ہوں، ویسے آپ ہیں۔ آپ
کچھ مختلف نہیں، جیسا میں ہوں، ویسے آپ ہیں۔
فرمائیے تو کہ آپ نے دیوتاؤں کی سبھا میں کیسے رسائی حاصل کی اور
کس طرح ابدی زندگی پائی؟
جواب میں اُت ناپشتم نے یہ واقعہ سنایا:۔
جلج موس! آؤ میں تم سے ایک پوشیدہ راز بیان کرتا ہوں،
اور دیوتاؤں کے فیصلے کا بھی میں تم سے ذکر کرونگا۔
شروپک[۵] شہر، تم اس شہر کو جانتے ہی ہو،
یہی جو فرات کے کنارے پر واقع ہے
یہ شہر بہت پرانا ہے۔ اس کے مقامی دیوتاؤں نے
بڑے دیوتاؤں کو آمادہ کیا، کہ وہ اس پر طوفان نازل کریں۔
اور یہ منصوبہ باندھا کس نے؟ ان کے باپ انوُ نے،
اور ان کے مشیر، سُورما اِنلیل نے،
اور ان کے ایلچی، ننیب نے
اور ان کے پیشوا، اِن نوجی نے۔
روشن دماغ دیوتا ایا بھی ان سے متفق ہوگیا۔
اسی نے ان سب کا فیصلہ سرکنڈوں کے چھپّر[۶] میں بیان کیا۔
ارے سرکنڈوں کے چھپّر! سرکنڈوں کے چھپّر! دیوار! دیوار!

---

۵ اب اس جگہ فارہ کے کھنڈر ہیں چند سال ہوئے، یہاں کھدائی ہوئی ہے۔
۶ یعنی وہ چھپّر، جس میں اُت ناپشتم رہتا تھا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ لوگ طوفان کے زمانے میں کس طرح کے مکانوں میں رہتے تھے۔

سرکنڈوں کے چھپّر! سُن۔ اری دیوار! سُن۔
اے شروپک کے باسی! اے اُوبر توت کے بیٹے[۵]
مکان کو ڈھادے اور ایک کشتی تیار کر۔
گھر بار چھوڑ دے اور اپنے بچاؤ کی صورت کر۔
ترک کر دے، جو کچھ تمھارے پاس ہے اور اپنی جان کی فکر کر۔
کشتی میں سب زندہ چیزوں کے بیج جمع کر۔
کشتی جو تم تیار کرو،
اس کی لمبائی اور چوڑائی اور گہرائی ناپ لو، تاکہ
اس کا طول اور عرض مطابق رہے
سمندر کے، اور اسے اوپر سے ڈھک لو۔

جب ایا دیوتا نے یوں اُت ناپشتم کو متنبہ کیا اور اس سے کشتی تیار کرنے کو کہا، تو قدرتی طور پر اسے شہر کے دوسرے لوگوں کی فکر ہوئی، کہ اگر انھوں نے دریافت کیا کہ تم یہ کشتی کس لیے بنا رہے ہو، تو میں کیا جواب دونگا۔ اس نے یہی بات ایا سے کہی تو جواب ملا، کہ تم کہہ دینا، شروپک کا دیوتا انلیل مجھ سے ناراض ہوگیا ہے۔ اس لیے میرا ارادہ ہے کہ یہ شہر چھوڑ کے دریا میں جا رہا ہوں، وہاں کا دیوتا دیا مجھ پر مہربان ہے اور اس سے مجھے کسی قسم کا خطرہ نہیں۔ ساتھ ہی ایا نے اسے یہ مشورہ دیا کہ کشتی میں ہر طرح کے جانور، مچھلی، اناج، غلّہ وغیرہ جمع کر لینا۔ چنانچہ اُت ناپشتم نے ایک سات منزلہ کشتی تیار کی اور اس پر اپنی تمام جمع پونجی، چاندی سونا، ڈھور ڈنگر، سب کچھ لاد دیا اور آخر میں اپنے اہل و عیال اور نوکروں چاکروں کو سوار کر کے تیار ہوگیا۔ اس کے بعد اُت ناپشتم نے طوفان کی جو سرگذشت بیان کی ہے، وہ گویا پوری نظم کی جان ہے:

شمس نے وقت مقرر کیا تھا

---

[۵] اس سے خود اُت ناپشتم مراد ہے۔

جب رات کا اندھیرا چھا جائے اور موسلادھار بارش ہونے لگے،
تو اپنی کشتی پر سوار ہو جاؤ اور اس کے دروازے بند کر لو۔
مقررہ وقت آن پہنچا۔
جب وہ آگیا، تو میں آثار سے سمجھ گیا،
کہ آج ہی کا وہ خطرناک دن ہے، جس سے میں ڈر رہا تھا۔
میں کشتی پر چڑھ گیا اور میں نے دروازے بند کر لیے۔
کشتی کے چلانے کا کام میں نے بُزر کرجل کے سپرد کیا۔
اور وہ عظیم الشان عمارت[۵] اور جو کچھ اس میں تھا، اسے سونپ دی۔
جب سورج نکلا،
ہر طرف آسمان پر کالے بادل گھر آئے،
اَداد گرجنے لگا۔
نبُو اور لُوجل اس کی ہراول میں آگے بڑھے۔
اَرا نے جہاز کا بادبان توڑ پھینکا۔
ننیب نے بھی کوچ کیا اور دھاوے کا حکم دے دیا۔
انو ناکی نے اپنی مشعلیں اٹھالیں،
جن سے زمین پر روشنی ہوتی تھی۔
اَداد کی گرج آسمان تک گونجنے لگی۔
اور ہر طرف روشنی کی جگہ اندھیرے نے لے لی۔
ایک دن اور رات طوفان رہا۔
زور آور اور تند حملے ......
لوگوں پر ٹوٹ پڑے،

---

[۵] اس سے سات منزلہ کشتی مراد ہے۔

بھائی، بھائی کو نہیں دیکھ سکتا تھا۔

اور وہ جو آسمان میں تھے، وہ بھی ایک دوسرے کو نہیں پہچانتے تھے۔

خود دیوتا بھی اس طوفان سے گھبرائے ہوئے تھے۔

انھوں نے بھاگ کے انو کے آسمان[1] میں پناہ لی۔

دیوتا، ایک حلقے میں کتّوں کی طرح سمٹ گئے۔

عِشتار، ایسی دھاڑیں مار مار کے رونے لگی، جیسے دردِ زہ میں مبتلا ہو،

دیوتاؤں کی ملکہ زور زور سے چیخنے لگی:

" اس دن پر لعنت ہو،

جب میں نے دیوتاؤں کی سبھا میں اس برائی پر صاد کیا تھا۔

میں نے دیوتاؤں کی سبھا میں کیوں یہ فیصلہ کیا!

لوگوں کے تباہ کرنے کو میں جنگ کا حکم دے دیتی۔

کیا میں نے انھیں اس لیے پیدا کیا تھا[2]!

کہ وہ مچھلیوں کی طرح سمندر کو پُر کریں"۔

جو کوئی بھی انوناکی میں تھا، اس کے ساتھ رونے لگا۔

دیوتا سر پہ ہاتھ رکھ کے بیٹھ گئے، زار زار رونے اور غمگین،

اُن کے لب بند . . . .
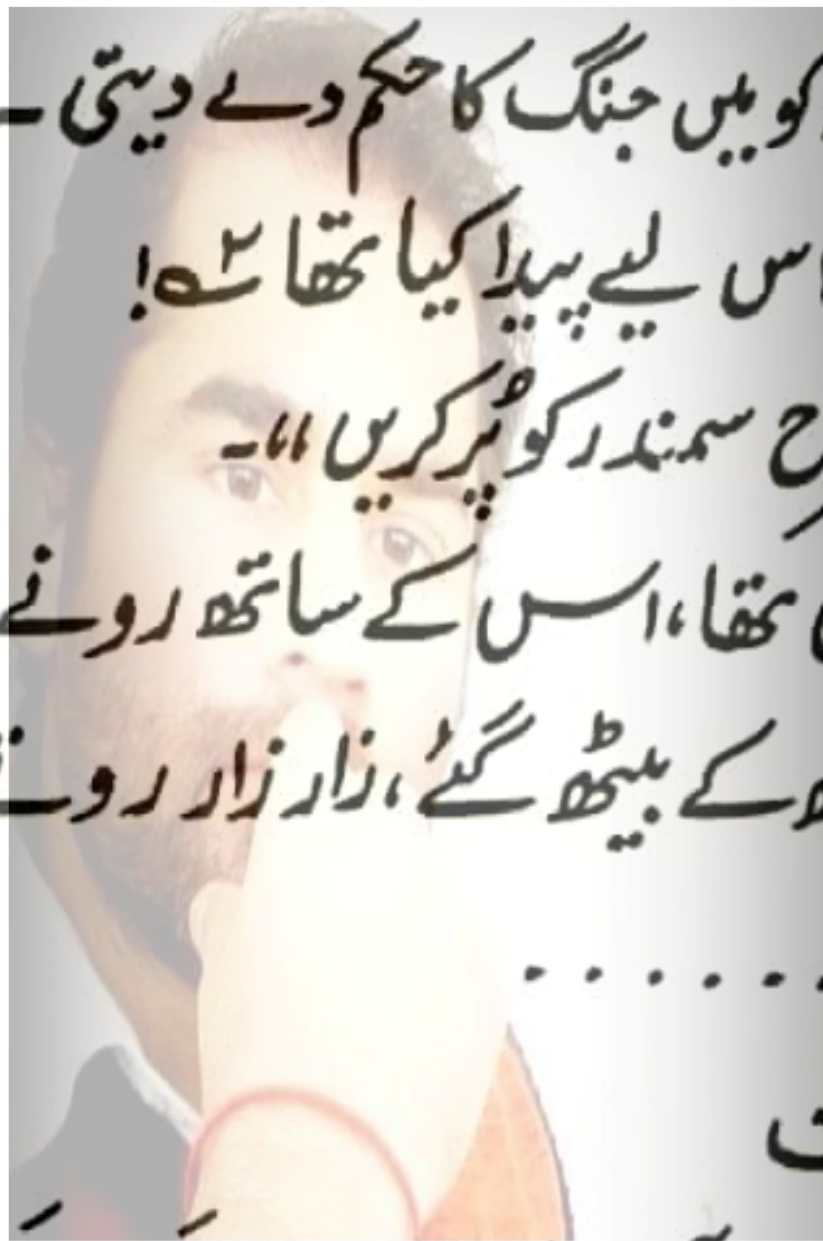
چھ دن اور چھ رات

طوفان اور بارش اور آندھی کا زمین پر دور دورہ رہا۔

جب ساتواں دن ہوا، تو بارش اور آندھی میں کمی ہوئی۔

سمندر کا طوفان تھم گیا، پانی رُک گیا اور آندھی نرم پڑ گئی۔

---

[1] آسمان کا سب سے بلند مقام۔

[2] یہ اس لیے کہ عِشتار افزائشِ نسل کی دیوی ہے۔

میں نے دن کو دیکھا، گڑگڑاہٹ بند ہو رہی تھی۔
دنیا کے لوگ مٹی میں تبدیل ہو گئے تھے۔
ایک احاطے کی طرح .... ہو گئے تھے۔
میں نے ایک کھڑکی کھولی اور روشنی آ کے میرے چہرے پر پڑی
میں سر جھکا لیا اور بیٹھ گیا اور رونے لگا۔
آنسو، میرے چہرے پر بہنے لگے۔
میں نے سمندر پر ہر طرف نظر دوڑائی۔
بارہ (میل) کے فاصلے پر زمین دکھائی دی
نصر پہاڑی پر آ کے کشتی ٹھہر گئی۔
نصر نے کشتی کو پکڑ لیا اور وہ ہل نہیں سکتی تھی
ایک دن، دو دن ــ نصر پہاڑی،
تین دن، چار دن ــ نصر پہاڑی،
پانچ دن، چھے دن ــ نصر پہاڑی ۵
جب ساتواں دن آیا،
میں نے ایک فاختہ آزاد چھوڑ دی۔
فاختہ یہاں گئی، وہاں گئی۔
جب اسے اُترنے کی کوئی جگہ نہ ملی، تو واپس آ گئی۔
میں نے ایک ابابیل آزاد کر دی۔
اسے بھی جب کہیں جگہ نہ ملی، تو واپس لوٹ آئی۔
میں نے ایک کوّا آزاد چھوڑ دیا،
کوّا گیا اور اس نے اُترتا پانی دیکھا

۵ـ مراد یہ ہے کہ پہاڑی پر چھے دن قیام رہا۔

اس نے کچھ دانہ دُنکا چُگا اور کائیں کائیں کی، لیکن لوٹ کے نہیں آیا۔
اس پر میں نے چار طرف سب پرندے چھوڑ دیے اور قربانی کی
میں نے پہاڑ کی چوٹی پر قربانی پیش کی۔
میں نے سات مرتبہ سات انگیٹھیاں قرینے سے رکھیں
ان کے نیچے سرکنڈے اور دیودار کی لکڑی اور مہندی بچھائی۔
دیوتاؤں نے اس کی بُو سونگھی
دیوتاؤں نے اس کی مہکتی خوشبو سونگھی۔
اور مکھیوں کی طرح آ کے قربانی کرنے والے کے گرد جمع ہو گئے۔"

اب دیوتاؤں نے محسوس کیا کہ ہم نے کیسا ہولناک فیصلہ کیا تھا اور وہ اس پر افسوس سے ہاتھ ملنے لگے۔ عشتار، دیوی ماتا کی حیثیت سے، بنی نوعِ انسان کی تباہی پر سب سے زیادہ جزع فزع کرتی ہے:

وہ جونہی دیوتاؤں کی ملکہ پہنچی،
اس نے گلے کا ہار ہاتھ میں لیا جو انُو نے خاص طور پر اس کے لیے تیار کیا تھا۔
اے دیوتاؤ! سن لو، کہ جیسے میں ان گلے کے موتیوں کو نہیں بھول سکتی،
اسی طرح میں ان دنوں کو بھی یاد رکھوں گی، میں انھیں کبھی نہیں بھلا سکتی۔
بیشک سارے دیوتا قربانی میں آئیں۔ لیکن اِنلیل نہیں آ سکتا،
کیونکہ اسی نے بے سوچے سمجھے یہ طوفان بپا کیا،
اور میرے لوگوں کی تباہی کا فیصلہ کیا،
جونہی اِنلیل پہنچا،
اس نے کشتی دیکھی، تو وہ غصّے سے آگ بگولا ہو گیا۔
وہ اچنبھے سے بگڑنے لگا۔
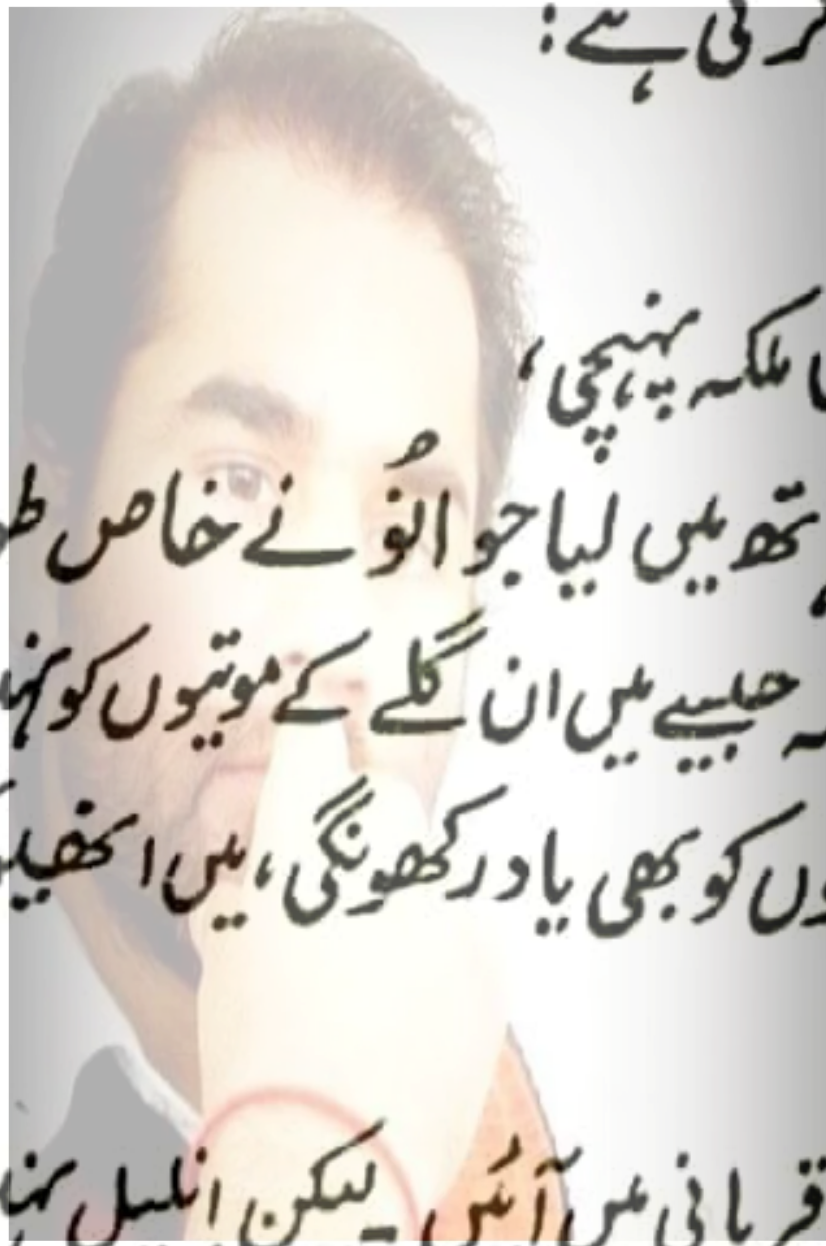
یہ کون ہے، جو جان بچا کے نکل گیا؟
کیا میں نے نہیں کہا تھا کہ کوئی آدمی بچنے نہ پائے،
ننیب نے مُنہ کھولا اور گویا ہوا۔
وہ سُورما انلیل سے کہنے لگا:
"اِیا کے سوائے اور کون ہے جو کوئی دوسری تجویز پیش کر سکے۔
یقیناً وہ سب کچھ جانتا ہے۔
اب اِیا نے لب کھولے اور گویا ہوا:
وہ سورما اِنلیل سے کہنے لگا:
"تم سپہ سالار ہو اور دیوتاؤں کے دست و بازو۔
لیکن کہو تو کہ بے سوچے سمجھے تم نے یہ طوفان کیوں بپا کیا؟
بیشک گنہگار کو سزا دو،
بدکار کو اس کی بدی کا مزہ چکھاؤ،
لیکن تمھارے دل میں اتنا رحم تو ہونا چاہیے کہ جڑ بنیاد سے نہ تباہ کردو،
سب کچھ تو غارت نہ کردو۔
اتنا بڑا طوفان لانے کی جگہ،
ببروں کو کُھلا چھوڑ دیتے، مخلوق کم ہو جاتی۔
طوفان لانے کی جگہ،
گیدڑ چھوڑ دیتے، مخلوق کم ہو جاتی طوفان لانے کی جگہ،
قحط نازل کر دیتے اور زمین کو اپنے قابو میں کر لیتے۔
طوفان لانے کی جگہ،
اِرا[1] آجاتا اور زمین کو ویران کر ڈالتا۔

---

[1] وباؤں اور بیماریوں کا دیوتا۔

میں نے کسی سے دیوتاؤں کے فیصلے کا راز فاش نہیں کیا۔
میں نے تو صرف اُت ناپشتم کو ایک خواب دکھایا تھا، وہ اس سے خود بخود
سمجھ گیا کہ دیوتا کیا کرنے والے ہیں۔
اب چاہیے کہ اس سے متعلّق کوئی مشورہ کرو،
اس فصیح و بلیغ تقریر سے اِنلیل کچھ نرم پڑ گیا۔ چنانچہ وہ خود کشتی پر گیا اور اس
نے اُت ناپشتم اور اس کی بیوی کو دائمی زندگی عطا کی۔ اُت ناپشتم کے الفاظ ہیں:
اِنلیل کشتی پر چڑھ آیا
اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور مجھے اوپر چڑھا لایا ۱
وہ مجھے اوپر لایا اور پھر میری بیوی سے بھی میرے ساتھ گھٹنے ٹیکنے کو کہا۔
اس نے ہماری پیشانیاں چھوئیں، ہم دونوں کے وسط میں کھڑا ہو گیا اور
ہمیں برکت دی۔
"آج تک اُت ناپشتم محض ایک آدمی تھا۔
آج سے اُت ناپشتم اور اس کی بیوی، دیوتاؤں کے برابر ہیں۔
اُت ناپشتم، دُور، دریاؤں کے سنگم کے پاس رہیگا۔
اس کے بعد وہ مجھے ساتھ لائے اور یہاں سنگم پر رہنے کو چھوڑ گئے۔
طوفان کا قصّہ یہاں ختم ہو جاتا ہے۔ اور اس کے بعد پھر جلجمیش کی سرگزشت
شروع ہو جاتی ہے۔
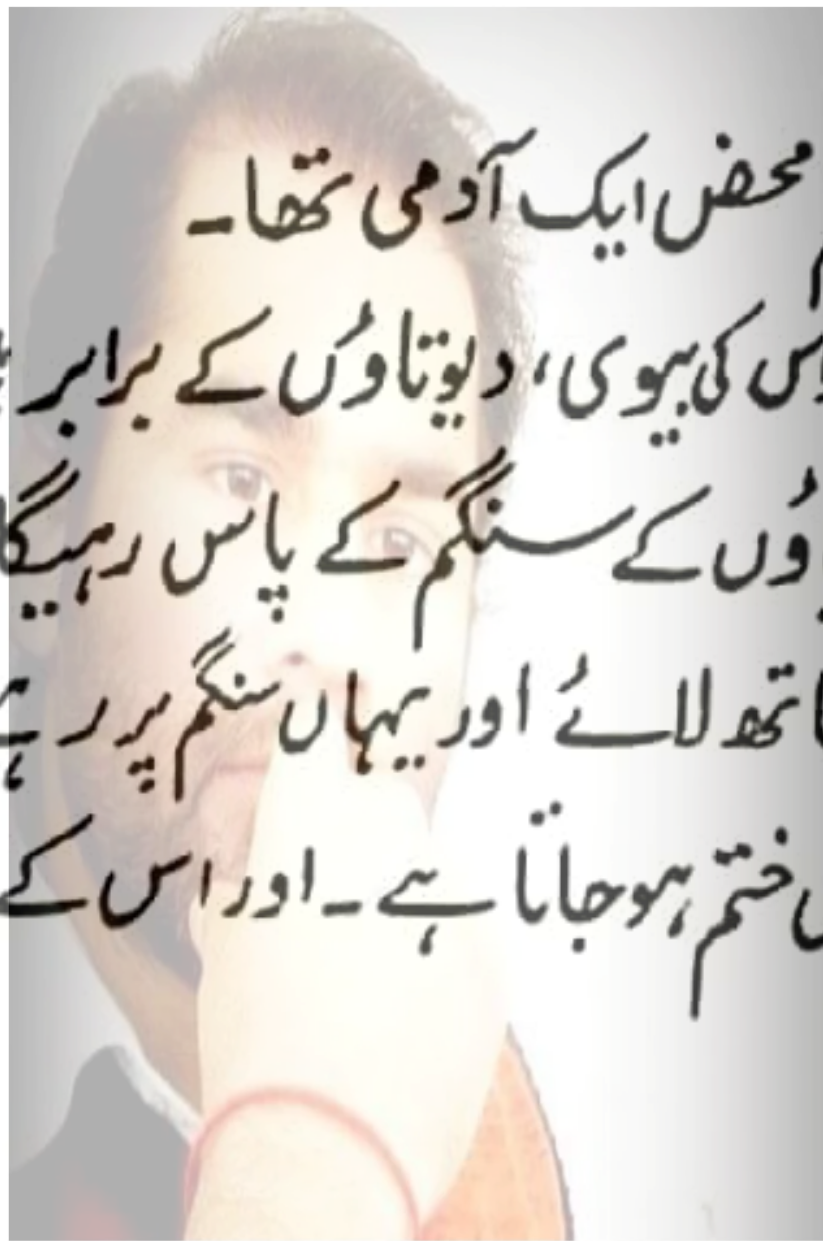
۳۔ داستانِ خلق

تقریباً تمام پرانی قوموں کے ہاں تخلیق اور دنیا کی ابتدا
سے متعلّق کوئی نہ کوئی نظریہ بھی ضرور ملتا ہے، جسے انھوں نے کسی نہ کسی شکل میں قلمبند کیا
ہے۔ ہندوؤں کے ہاں یہ مختلف پُرانوں میں ہے۔ یہودیوں کے ہاں تورات کی کتاب پیدائش

---

۱ یعنی زمین پر۔

کا آغاز ہی اس بیان سے ہوا ہے۔ بابلیوں کا نظریہ بھی ہمیں دو مختلف جگہ ملا ہے۔

چوتھی صدی قبلِ مسیح کے اختتام اور تیسری صدی قبلِ مسیح کے آغاز میں بابل میں بعل دیوتا کے مندر میں ایک پجاری بیروسوس نامی تھا۔ اس نے ایک کتاب "بابل کی تاریخ" تصنیف کی، جس میں ابتدائے آفرینش سے اپنے زمانے تک کے حالات تھے۔ اس کی اصلی کتاب تو ضائع ہوگئی ہے، لیکن اس کے جو اقتباس بعض یونانی مؤرخوں اور مصنفوں نے اپنی کتابوں میں درج کیے ہیں، وہ ہمارے سامنے ہیں۔ مثلاً دنیا کے آغاز اور مخلوق کے وجود میں آنے کا مندرجہ ذیل بیان جس سے ہمیں ان لوگوں کے اس بارے میں معتقدات کا علم ہوتا ہے، ہمیں یوزی بیئس کی کتاب میں ملتا ہے جو خود اسے اسکندر پالی ہسٹور کے حوالے سے لکھتا ہے:-

شروع میں نیستی تھی۔ نہ دنیا تھی نہ اور کوئی چیز۔ ہر طرف کامل تاریکی تھی۔ صرف ایک چیز کا وجود تھا یعنی ہر طرف پانی ہی پانی تھا۔ کچھ مدت بعد اس پانی میں عجیب و غریب مخلوق پیدا ہونے لگی۔ عجب الخلقت، ڈراؤنی اور ہیبت ناک۔ مثلاً ایک آدمی ہے، اس کے دو سر ہیں اور چار پیر۔ یا ایک اور آدمی ہے، اس کے دو سر ہیں، ایک مرد کا، دوسرا عورت کا۔ اور دونوں کے الگ الگ پیر ہیں۔ یا ان کے جسم ملی جلی انسانی اور حیوانی خصوصیات کے حامل ہیں، آدھا دھڑ انسان کا ہے اور آدھا کسی جانور کا۔ اس تمام مخلوق پر ایک عورت حکمران تھی، جس کا نام تامت (بابلی سمندر) تھا۔ بعل دیوتا نے اس عورت کو قتل کر دیا اور اس کے جسم کے دو ٹکڑوں سے زمین اور آسمان بنا لیے۔

جب وہ زمین بنا چکا، تو اسے خیال آیا کہ اب اسے بسانا بھی چاہیے۔ چنانچہ اس نے ایک دوسرے دیوتا کو حکم دیا کہ میرا سر کاٹ ڈالو اور اس سے جو خون بہے، اس میں مٹی ملا کے گوندھ لو۔ اس گندھی ہوئی مٹی سے انسان اور حیوان بناؤ۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ گلا کٹ جانے

سے بعل مر گیا۔ بلکہ یہ محض مٹی گوندھنے کی خاطر اس کا خون حاصل کرنے کا طریقہ تھا۔ اس کے بعد اس نے ستارے اور چاند سورج بنائے۔

یہ ہے وہ داستان جو بیروسوس نے بیان کی ہے۔ چونکہ ہمیں اس کی اصلی کتاب نہیں ملی اور صرف اس کا اقتباس اور وہ بھی دوسرے تیسرے واسطے سے دیکھنے کو ملا ہے، اس لیے ہوسکتا ہے کہ شروع میں بیروسوس نے جو کچھ لکھا تھا، بعد کے مصنفوں نے اس کے سمجھنے میں غلطی کی ہو یا دانستہ اس میں کچھ تبدیلی کر دی ہو۔

خوش قسمتی سے جب نینوا کے کھنڈروں سے اشور بنی پال کا کتب خانہ برآمد ہوا، تو اس ذخیرے میں سے بعض تختیاں ایسی ملیں، جن پر تخلیق کا افسانہ لکھا تھا۔ سب سے پہلے برٹش میوزیم (لندن) کے ایک معاون جورج اسمتھ نے ایک مضمون میں اس کی طرف توجہ دلائی۔ پھر انھوں نے اصل متن ترجمہ سمیت شائع کر دیا۔ جس سے اس موضوع پر مزید روشنی پڑی۔ اپنی مکمل صورت میں یہ کم از کم سات تختیاں رہی ہونگی۔ افسوس کہ ان میں سے صرف چوتھی مکمل ہے۔ باقی چھے بہت ٹوٹی پھوٹی حالت میں ہیں اور اس طرح متن کا بہت سا حصہ ضائع ہو گیا ہے۔ بہر حال جو کچھ ملا ہے، وہ بھی ہمارے مقصد کے لیے کافی ہے۔ اس سے کم از کم ایک بات صاف ہو جاتی ہے کہ بیروسوس نے جو کچھ لکھا وہ بہت حد تک صحیح اور بابلیوں کے معتقدات کی درست ترجمانی ہے۔

بابلیوں کے نزدیک شروع میں کامل بے نظمی تھی۔ ہر طرف پانی ہی پانی محیط تھا۔ اس بے نظمی کی نمائندہ دو ہستیاں اپسو (بحر عمیق) اور تیامت (جگت ماتا) تھیں۔ ان کے علاوہ کوئی اور وجود نہیں تھا۔ اس پر بہت زمانہ گزر گیا، تو دیوتا پیدا ہوئے۔ پہلے لخم اور لخام آئے اور ان کے قرنوں بعد انشر اور کیشر اور پھر یکے بعد دیگرے دوسرے عظیم الشان دیوتا عالم وجود میں آئے۔ لیکن اب تیامت (جو گویا ان سب کی ماں تھی اور جس نے اب ایک بڑے اژدھے کی شکل اختیار کر لی تھی) اور اپسو ان دیوتاؤں کے خلاف ہو گئے۔ انھیں تباہ کرنے کے لیے انھوں نے خوفناک اور خونخوار دیووں کی نسل پیدا کی۔ تاکہ ان کی مدد سے ان سب کا صفایا کر دیں۔ ادھر دیوتاؤں کا سرغنہ

انشر تھا۔ اس نے اپنی جماعت کی حمایت کا کام انو کے سپرد کیا۔ لیکن اسے کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ تیامت کا جتھا بدستور روز بروز طاقت پکڑتا گیا اور یوں دیوی دیوتاؤں کی ہستی خطرے میں پڑ گئی۔ اس پر انشر نے ایا کو ان کا مقابلہ کرنے کے لیے مقرر کیا لیکن بےسود، وہ بھی اس طاقتور دشمن کے سامنے نہ ٹھہر سکا۔ سب سے آخر انشر نے ایا کے بیٹے مردوخ کو بلایا اور اس سے درخواست کی کہ وہ کسی طرح دیوتاؤں کو اس مصیبت سے نجات دلائے۔ اس کے لیے انشر نے دیوتاؤں کا خاص اجلاس بلایا اور ان کے سامنے سپہ سالاری کے فرائض مردوخ کو تفویض کیے۔ چنانچہ ہر طرح کے ہتھیار سج کر مردوخ اس مہم پر روانہ ہوا۔ اس نے تیامت کے لشکر کو شکست دی۔ خود تیامت کو قتل کر دیا اور اس کے ساتھیوں کو گرفتار کر کے لے آیا۔ پھر اس نے تیامت کے جسم کو چیر کر اس کے دو ٹکڑے کر دیے۔ ایک ٹکڑے سے اس نے چھت (آسمان) بنایا، جس کا مقصد یہ تھا کہ اوپر کا پانی نیچے نہ آنے پائے۔ پھر آسمان کے کناروں پر چوکیدار اور پاسبان بٹھائے، جن کا فرض یہ تھا کہ وہ اوپر کا پانی نیچے نہ آنے دیں۔ اس کے بعد اس نے اجرامِ فلکی پیدا کیے۔ تاکہ ان سے موسموں کا حساب رہ سکے اور رات پر چاند کو حکمران مقرر کیا۔ اس کے بعد وہ زمین کی تخلیق کی طرف متوجہ ہوا اور بالترتیب سبزی، حیوانات، ڈھور ڈنگر، رینگنے والے جانور اور انسان پیدا ہوئے۔

اب نظم کے بعض حصّوں کا تفصیلی ترجمہ سنیے:

پہلی تختی

"جب اوپر آسمان کا ابھی نام بھی نہیں تھا،
نہ نیچے خشک زمین کا نام تھا[۱]
اپسو، ان کا مورثِ اعلیٰ

---

[۱] "کسی چیز کا نام رکھنا، اس کے وجود پر دلالت کرتا تھا۔

ممو، اور تیامت، ان سب کی ماں ^ا^

ان تینوں کے پانی یکجا ہوئے۔

ابھی کسی کھیتی کا پتا نہیں تھا، کونپل تک نہیں پھوٹی تھی۔

کسی دیوتا کا وجود نہیں تھا۔

کسی کا نام تک نہیں رکھا گیا تھا

کسی کی تقدیر نہیں لکھی گئی تھی ^۲^

تب آسمانوں میں دیوتا پیدا ہوئے۔

لخم اور لخام آگے آئے

اسی پرجگ بیت گئے...... ^۳^

انشر اور کیشر پیدا ہوئے ^۴^

جب بہت دن گزر گئے۔ تو وہ آگے آئے.......

انو ان کا بیٹا......

انشر اور انو.......

نودی مد ^۵^ جسے اس کے ماں اور باپ......

جو بہت عقلمند اور عالم، بہت طاقتور، بے ہمتا....

---

^ا^ اپسی اور ممو اور تیامت۔ تینوں کم و بیش ہم معنی ہیں یعنی پانی اور سمندر۔ ممکن ہے کہ شروع میں ایک نام ہو اور بعد کو متعدد افسانوں کی آمیزش سے سب نام یکجا ہو گئے ہوں۔

^۲^ یہ دیوتاؤں کا فرض تھا کہ وہ ہر ایک فرد کی قسمت کا فیصلہ کر کے اسے معرضِ تحریر میں لائیں۔

^۳^ نقطوں کا یہ مطلب ہے کہ یہ سطر نامکمل ہے۔

^۴^ انشر، جو کچھ بلندی پر ہے اور کیشر، جو کچھ نیچے ہے۔ گویا یہ دونوں بعد کی تمام مخلوق کے مورثِ اعلیٰ ہیں۔

^۵^ سمندر کے دیوتا اِیا کا ایک صفاتی نام ہے۔

پھر قائم کیے گئے"۔

اس کے بعد کم از کم سات سطریں ایسی ہیں جو ٹھیک طور پر پڑھی نہیں گئیں۔ سیاق سے البتہ معلوم ہوتا ہے کہ جب اس ابتدائی مخلوق کو دیوتاؤں کی پیدائش کا علم ہوا تو ان میں کھلبلی مچ گئی۔ کیونکہ وہ جان گئے کہ اب ہماری آزادی اور سرداری کا خاتمہ ہے۔ اس پر اَپس اور مُمّو دونوں تیامت سے مشورہ کرنے گئے کہ کس طرح دیوتاؤں کو قابو میں رکھا جائے:

پھر اَپس، ان عظیم الشان دیوتا کا مورث
اپنے ایلچی مُمّو سے کہنے لگا:
اے مُمّو! میرے کلیجے کی ٹھنڈک
آؤ، تیامت کے پاس چلیں۔
وہ دونوں گئے اور تیامت کی تعظیم بجالائے۔
دیوتاؤں سے متعلق منصوبہ بنا کر......
اَپس نے مُنہ کھولا اور بولنے لگا۔
اس برگزیدہ نے تیامت سے یہ لفظ کہے:
......ان کی کارروائی میرے خلاف،
مجھے دن کو چین نہیں، رات کو آرام نہیں۔ میں ان کی نسل کاٹ ڈالنا
چاہتا ہوں،
تاکہ یہ شور و غل بند ہو اور ہم پھر سکھ کی نیند سو سکیں"۔
جب تیامت نے یہ سنا،
تو وہ غصّے سے لال پیلی ہو گئی اور انتقام، انتقام پکارنے لگی۔
وہ جوش کے مارے کانپنے لگی۔
اس کے دل میں بُرے بُرے خیالات آنے لگے۔
"آؤ، جو کچھ ہم نے پیدا کیا ہے، اُسے نیست و نابود کر ڈالیں۔ اس کے

بعد ہم آزاد ہو جائینگے ،،
ممّو نے جواب دیا اور اَپس کو صلاح دی ،
اس کی صلاح بھی مخالفانہ تھی ۔
،، دیکھو، ان کی نسل طاقتور ہے ۔ آؤ اسے برباد کر دیں ۔
پھر تم دن کو آرام کر سکو گے ،
اور رات کو میٹھی نیند سو سکو گے ،،
اَپس نے یہ سنا اور اس کا چہرہ چمک اٹھا ۔
وہ دیوتاؤں ۔۔۔ اپنی اولاد ۔ کی برائی سوچنے لگا ،،

اس کے بعد کوئی پچاس سطروں میں اَپس اور ممّو کی دیوتاؤں سے لڑائی کا حال لکھا ہے، جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ دونوں گرفتار ہو جاتے ہیں ۔ سمندروں کا دیوتا ایا، دیوتاؤں کے لیے کمک لے کر پہنچ جاتا ہے اور اس کی معاونت اس مرحلے پر فیصلہ کن ثابت ہوتی ہے ۔

غرض کہ دیوتاؤں کے خلاف جو سازش ہوئی تھی، وہ بُری طرح ناکام رہی ۔ ان کے دشمنوں کو بُری طرح زک پہنچی اور وہ آیندہ سر اٹھانے کے قابل نہ رہے ۔ لیکن ابھی خطرہ پوری طرح زائل نہیں ہوا تھا کیونکہ گو اَپس اور ممّو ٹھکانے لگ گئے، لیکن تیامت ابھی تک آزاد تھی ۔ وہ خوب جانتی تھی کہ وہ دن دور نہیں، جب مجھے بھی دیوتاؤں سے ٹکر لینا اور اپنے کیے کی سزا بھگتنا پڑیگی ۔ چنانچہ وہ مقابلے کی تیاریاں کرنے لگی ۔ اس نے آہستہ آہستہ مختلف قسم کے خوفناک اور زہریلے اژدھوں اور سرکش دیووں کی ایک بڑی فوج جمع کر لی اور ان سب کی کمان اپنے شوہر کنگو کے ہاتھ میں دے دی

فوج کا حال سنیئے :
وہ کوسنے دیتے، تیامت کے شانہ بشانہ کوُچ کرتے ،
اور غیظ و غضب میں بھرے، رات دن منصوبے سوچتے ۔
وہ جوش و خروش سے حملے کرتے، طیش میں بھرے ہوئے ۔

انھوں نے اپنی طاقت مجتمع کر کے صف بندی کر لی۔
اُم خبور[1] ۔ تمام مخلوقات کی ماں۔
ناقابلِ تسخیر ہتھیار لے کے آئی، اس نے دیو پیکر عفریت لا کھڑے کیے۔
جن کے دانت بہت تیز اور زہریلے تھے۔
اس نے ان کے جسموں میں خون کی جگہ زہر بھر دیا۔
اس نے ڈراؤنے اژدھوں کو اور بھی خوفناک بنانے کو،
ان کے جسم چمکیلے اور قد غیر معمولی طور پر بڑے کر دیے۔
تاکہ جو کوئی انھیں دیکھے اس پر ہیبت طاری ہو جائے۔
اس لڑائی کے لیے مختلف قسم کے گیارہ اژدھے، بے شمار عجیب الخلقت جانور، سانپ اور بچھو پیدا کیے۔ اور طوفان اور آندھی کو ان کی مدد کے لیے مقرر کیا۔ انھیں طرح طرح کے بے خطا اسلحہ مہیا کیے۔ پھر ان سب پر اپنے خاوند کِنگو کو سپہ سالار بنایا۔ قسمت کے نوشتے اُس کے سپرد کیے، جس کا مطلب یہ ہے کہ تمام مخلوق کی حیات و ممات اس کے قبضے میں دے دی۔

دوسری تختی

دیوتاؤں کو ان تیاریوں کا علم ہوتا ہے۔
تیامت کیل کانٹے سے لیس ہو گئی۔
اس نے اپنی اولاد[2] سے برائی سوچی۔
آپس کا انتقام لینے کی خاطر تیامت نے یہ برائی سوچی۔

---

[1] تیامت کا لقب معلوم ہوتا ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ کسی دوسرے افسانے میں تیامت کی جگہ یہی نام استعمال ہوا ہو۔
[2] اولاد سے دیوتا مراد ہیں۔

جب اس نے یہ فوج تیار کر لی، تو اِیا کو خبر ملی۔
اِیا نے یہ خبر سنی۔
اس پر رنج وغم کی گھٹا چھاگئی اور وہ حزن والم کے نیچے دب گیا۔
دن گزرتے گئے اور آخر جب اس کا غصّہ کم ہوا،
وہ اپنے والد ۔ انشر ۔ کے پاس گیا۔
وہ انشر ۔ اپنے پیدا کرنے والے کی خدمت میں حاضر ہوا۔
تیامت کی ساری کارگزاری اور منصوبے کا کچّا چٹھّا اس سے بیان کیا۔
"ہماری والدہ تیامت ہم سے نفرت کرنے لگی ہے۔
اس نے بعض دیوتاؤں کو بھی ساتھ ملا لیا ہے۔
ہاں، وہی دیوتا جنھیں آپ نے پیدا کیا تھا، اس کے پہلو بہ پہلو ہم پر چڑھے آرہے ہیں۔

ان آخری سطروں سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ غالباً خود دیوتاؤں کے گروہ میں پھوٹ پڑ گئی تھی اور ان میں سے بھی کچھ ٹوٹ کر تیامت سے جا ملے تھے۔ بہرحال جب انشر کو اس خطرناک صورتِ حالات کا علم ہوا، تو اس نے اِیا ہی کو تیامت کا مقابلہ کرنے کا حکم دیا۔ یہ اِیا ہی تھا جس کی مدد سے دیوتاؤں نے اَپسو اور ممّو کو زیر کیا تھا۔ لیکن ایا نے یہ ذمّہ داری لینے سے انکار کر دیا۔ اس پر انشر نے اپنے دوسرے بیٹے انُو کو بلا بھیجا اور اس سے کہا کہ تمھارا فرض ہے کہ جا کے تیامت کا مقابلہ کرو۔ کیونکہ اگر کہیں وہ کامیاب ہوگئی، تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا، کہ کائنات میں ابتری اور بدنظمی پھیل جائیگی۔ اس کے برعکس دیوتاؤں کی فتح کے معنی یہ ہیں کہ امن وامان اور نظم ونسق قائم رہیگا۔ لیکن انُو نے بھی یہ بھاری پتھر چوم کے چھوڑ دیا۔ اخیر میں مردوخ کی طلبی ہوئی۔ انشر نے اسے مخاطب کیا:

تم میرے دلاور بیٹے ہو،
.... جنگ کے لیے کمر کس لو۔

.... تمھیں دیکھتے ہی امن قائم ہو جائیگا "

شاہ [۵] کا چہرہ اپنے والد کی بات سنتے ہی کھل اٹھا۔

وہ نزدیک آیا اور انشر کے روبرو کھڑا ہو گیا۔

انشر نے اسے دیکھا اور اس کا دل مسرّت سے بلّیوں اچھلنے لگا۔

اس نے اس کا بوسہ لیا اور ہر قسم کا خوف اس کے دل سے غائب ہو گیا۔

اس نے انشر سے کہا "آپ کے مُنھ کی بات سچّی ہو،

اب مجھے اجازت دیجیے کہ میں جا کے آپ کے حکم کی تعمیل کروں۔

اس تختی کے آخری الفاظ ہیں :

اے میرے بیٹے ! اے علم کی مورتی !

جلد اپنی مہم پر روانہ ہو جاؤ،

تمھارا خون نہیں بہیگا، تم یقیناً زندہ و سلامت واپس لوٹو گے "

شاہ اپنے والد کے یہ الفاظ سن کر بہت مسرور رہا۔

اسے دلی مسرّت ہوئی اور اس نے اپنے والد سے کہا،

" اے دیوتاؤں کے مخدوم ! آپ سب دیوتاؤں کی تقدیر کا فیصلہ کرتے ہیں

اگر میں آپ کا انتقام لینے میں کامیاب ہو جاؤں،

اگر میں تیامت پر فتح پالوں اور آپ کا حکم بحال کردوں،

تو دیوتاؤں کی مجلس بلائیے اور سب کے سامنے برتری کا اعلان کر دیجیے،

تاکہ جب آپ مجلس میں خوشی خوشی و شادہ آرا ہوں،

تو آپ کی جگہ میں قسمتوں کا فیصلہ کر سکوں،

اور جو کچھ میں کہوں، اسے کوئی ٹال نہ سکے،

اور میرا کہا، نہ بدلا جائے، نہ منسوخ ہو

---

[۵] مردوخ مراد ہے۔

تیسری تختی

اس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے کہ انشرا پنے خادم جاآج کے ذریعے دیوتاؤں کو پیغام بھیجتا ہے، جس میں تیامت کی سرکشی، اس کے دَل بادل لشکر کی چڑھائی، کنگنج کی کمان اور ان کے عزائم کا بیان ہے؛

اس پر سب اکٹھے ہو کے آئے،
عظیم الشان دیوتا، سب کے سب، وہ تقدیروں کا فیصلہ کرنے والے
وہ انشر کے سامنے حاضر ہوئے، انجمن گاہ ان سے بھر گئی۔
وہ مجلس میں ایک دوسرے سے ہم آغوش ہوئے،
اور ضیافت میں کھانے پینے کی تیاریاں کرنے لگے۔
انھوں نے روٹی کھائی اور شراب ملائی۔
میٹھی شراب نے ان کے حواس پر قبضہ کر لیا۔
انھوں نے خوب پی اور شراب ان کی رگ رگ میں رچ گئی۔
وہ زور زور سے باتیں کرنے لگے، جوش میں بپھرے ہوئے۔
اور انھوں نے مردوخ، اپنے انتقام لینے والے، کی قسمت کا فیصلہ کر دیا۔

چوتھی تختی

مردوخ کیل کانٹے سے لیس ہو کر تیامت اور اس کے جتھے کے خلاف نکلا۔ تیر کمان اور گرز اور نیزہ ہاتھ میں لیے، برق و رعد اور چار کھونٹ کی آندھیاں اس کے جلو میں چلیں۔ وہ مسلح ہو کے وہ طوفانی رتھ پر سوار ہوا، جس کے آگے باد پیما گھوڑے جُتے تھے۔ جب اس کی تیامت سے مڈبھیڑ ہوئی، تو انھوں نے پہلے تو ایک دوسرے سے طعنہ بازی اور گالی گلوچ کی۔ اس کے بعد مردوخ نے تیامت کو للکارا، کہ آؤ، میرے تمھارے دو دو ہاتھ ہو جائیں۔ جب تیامت نے یہ سنا، تو وہ جوش میں آپے سے باہر ہو گئی اور جنونیوں کی سی باتیں کرنے لگی۔

تیامت، غصّے میں چیخنے لگی۔

وہ سر سے پانو، تک کانپنے لگی اور اس کا عضو عضو تڑپنے لگا۔
اس نے منتر پڑھا اور افسوں پھونکا۔
جنگ کے دیوتاؤں کو مدد کے لیے پکارا۔
وہ میدان جنگ میں بڑھے، اور ایک دوسرے کے آمنے سامنے آن پہنچے۔
خداوند[۱] نے جال پھینکا اور اُسے[۲] گھیر لیا۔
خطرناک آندھی جو اس کی پشت پر کھڑی تھی اس کے مُنھ پر دے ماری۔
تیامت نے اپنا مُنھ پورے کا پورا کھول دیا تھا۔
قبل اس کے کہ وہ اسے بند کر پائے، مردوخ نے خطرناک آندھی اس کے
حلق میں گھسیڑ دی۔
اس کا پیٹ خطرناک آندھی سے بھر گیا،
اس کا قلب پکڑا گیا، اس کا مُنھ کھلے کا کھلا رہ گیا۔
اس پر مردوخ نے پھرتی سے نیزے کا وار کیا اور اس کا پیٹ چاک کر ڈالا
اس کی انتڑیاں کاٹ ڈالیں، اس کے دل کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔
اس نے اسے پچھاڑ دیا اور موت کے گھاٹ اتار دیا۔
اس نے اس کی لاش زمین پر ٹپک دی اور خود اس پر کھڑا ہو گیا۔
جب اس نے تیامت کی یہ گت بنائی، جو سپہ سالار تھی۔
تو اس کی فوج بھی تتر بتر ہو گئی، اس کی چنڈال چوکڑی بکھر گئی،
اور دیوتاؤں نے جو اس کے معاون تھے، اس کے مددگار تھے،
ڈر کے مارے، کانپتے ہوئے، پیٹھ پھیر دی۔
وہ اپنی جان بچانے کو بھاگ کھڑے ہوئے۔
لیکن (مردوخ نے) انھیں بھی گھیر لیا اور وہ بچ کے نہ جا سکے۔

---

[۱] مردوخ [۲] تیامت

اس نے ایک ایک کو گرفتار کر لیا اور ان کے ہتھیار توڑ ڈالے۔
انھیں جال میں پکڑ لیا اور وہ پھندے میں پھنس گئے۔
دشمنوں سے نمٹنے کے بعد مردوخ فتح کے پھریرے لہراتا واپس آیا۔ اس نے تیامت کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے اور ان سے طرح طرح کی چیزیں بنائیں
اس نے اسے مچھلی کی طرح دو حصّوں میں چاک کر ڈالا۔
ایک حصّہ لے کر اس سے آسمان کا سرپوش بنایا
اس کی چٹخنی چڑھا دی اور اس پر ایک پہرہ دار مقرّر کیا۔
اور اسے تاکیدی حکم دیا کہ آسمانوں کا پانی نہ بہنے پائے۔
اس نے آسمانوں کا دورہ کر کے خوب معاینہ کیا۔
یہاں اس نے اپس کے مقابلے میں نودی مدے کا محل تیار کرایا۔
سمندر کی ہیئت اور حدود کی بھی جانچ پڑتال کی،
اور اس کے جوڑ پر ای شرارہ کا محل قائم کیا۔
ای شرارہ کا محل بطور آسمان قائم کیا۔
اور اس کے مختلف حصّوں میں انُو اور انلیل اور ایا نے سکونت اختیار کی۔

پانچویں تختی

اب پیدائش اور تکوین کا دور شروع ہوا، آسمان کی تخلیق کے بعد ستارے وجود میں آئے، موسموں کی حدود قائم ہوئیں، سال کی تقسیم مہینوں میں ہوئی اور دن رات پیدا ہوئے، یہ سب کچھ مردوخ نے کیا، لیکن یوں معلوم ہوتا ہے کہ مصنّف کا یہ مدّعا نہیں کہ مردوخ نیستی سے ہستی پیدا کر رہا ہے، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اس نے ازلی غیر منظم ہیولیٰ کو نظم و نسق میں تبدیل کر دیا:
اس نے مختلف دیوتاؤں کے مقام مقرّر کیے۔

---

[1] ایا ہی کا دوسرا نام ہے۔

ان کے لیے الگ الگ ستارے قائم کیے اور دو دو جُڑواں ستارے اپنی
اپنی جگہ نصب کیے۔
اس نے سال کی حدبندی کی اور اسے حصّوں میں تقسیم کیا۔
اس نے سال کے بارہ مہینوں کے لیے تین ستارے متعیّن کیے [۱]
سال کے دنوں کے لیے اس نے تصویریں بنائیں [۲]
اس نے نبیرو [۳] کا مقام مقرّر کیا، تاکہ دوسروں کو بھی اپنی اپنی جگہ پر رکھ
سکے۔
نہ کوئی غلط راہ پر جائے، نہ غلطی کر سکے۔
اس نے اِنلیل اور اِیا کا مقام اس کے نزدیک بنایا۔
اس نے دونوں طرف بڑے بڑے پھاٹک نصب کیے۔
پھر دائیں طرف اور بائیں طرف مضبوط چٹخنیاں لگائیں،
اور آسمان کے بیچ میں اس نے قطب قائم کی۔
درمیان میں چاند کو روشن اور منوّر بنایا اور رات اس کے سپرد کی۔
اس نے رات کا قبضہ اس کے ہاتھ میں دے دیا، تاکہ دنوں کا شمار رہ سکے۔
اور ہر مہینے بلاناغہ وہ اسے تاج [۴] پہناتا۔
اس کے بعد چاند کی مختلف شکلوں اور ہلال سے بدر تک کے مرحلوں کا بیان ہے۔
تختی کا آخری حصّہ شکستہ ہے۔ قیاس چاہتا ہے کہ اس حصّہ میں ستاروں کی پیدائش اور فضا کی تکمیل کا حال درج ہوگا۔ آخر کی چند سطروں میں دیوتا، مردوخ سے درخواست

---

[۱] گویا ہر چار مہینوں پر ایک ستارے کا تسلّط تھا۔
[۲] ستاروں کے جھرمٹ یا برجِ فلکی۔
[۳] عطارد، جو سب میں روشن ترین ستارہ اور گویا سب ستاروں کا سردار ہے۔
[۴] ہلال کی طرف اشارہ ہے۔

کرتے ہیں، کہ بیشک ہر طرف اطمینان اور امن و امان کا دور دورہ ہوگیا ہے، لیکن کائنات ابھی تک خالی ہے اور کوئی ہمیں پوچھنے والا نہیں۔ نہ کوئی آکے ہماری بڑائی کرتا ہے، نہ بھینٹ چڑھاتا ہے۔

چھٹی تختی

اس پر مردوخ انسان کی پیدائش کا فیصلہ کرتا ہے۔ اس تختی کی صرف شروع کی چند سطریں موجود ہیں، باقی حصہ ضائع ہوگیا ہے۔

اس کے دل میں نئی مخلوق پیدا کرنے کا خیال آیا۔
اس نے مُنہ کھولا اور اِیا سے گویا ہوا۔
اور جو کچھ وہ اپنے دل میں فیصلہ کرچکا تھا، اس سے بیان کیا۔
"میں اپنا خون لونگا اور ہڈی بناؤنگا۔
میں انسان پیدا کرونگا، انسان جو۔۔۔۔۔۔۔۔
میں انسان پیدا کرونگا، جو زمین میں رہیگا،
تاکہ دیوتاؤں کی پرستش ہوسکے، تاکہ ان کے نام کے مندر بنیں۔

بقیہ حصے میں، جو ٹوٹ گیا، غالباً زمین، نباتات، سبزی ترکاری، پہاڑوں، جانوروں وغیرہ کی پیدائش کا حال درج ہوگا۔

ساتویں تختی

اب مردوخ کا کام ختم ہوگیا۔ تیامت کی فوج تہ تیغ ہوگئی۔ اور جو موت کے مُنہ سے بچ نکلی وہ با جولاں قیدیں پڑی تھی۔ دیوتاؤں نے خوشی کے شادیانے بجائے اور اپنے محسن اور نجات دہندہ کا شاندار خیر مقدم کیا۔ انھوں نے اسے پچاس مختلف القاب اور خطاب دیے (جو سب کے سب صفاتی نام ہیں)، ہر ایک دیوتا بھری سبھا میں کھڑے ہو کے عقیدت کا اظہار کرتا اور اپنی خصوصیات اور اختیارات مردوخ کے نام منتقل کرنے کا اعلان کرتا ہے۔ آخری سطریں ہیں:

یہ حالات رہتی دنیا تک یاد رہیں، بڑے بوڑھے انھیں بیان کریں۔
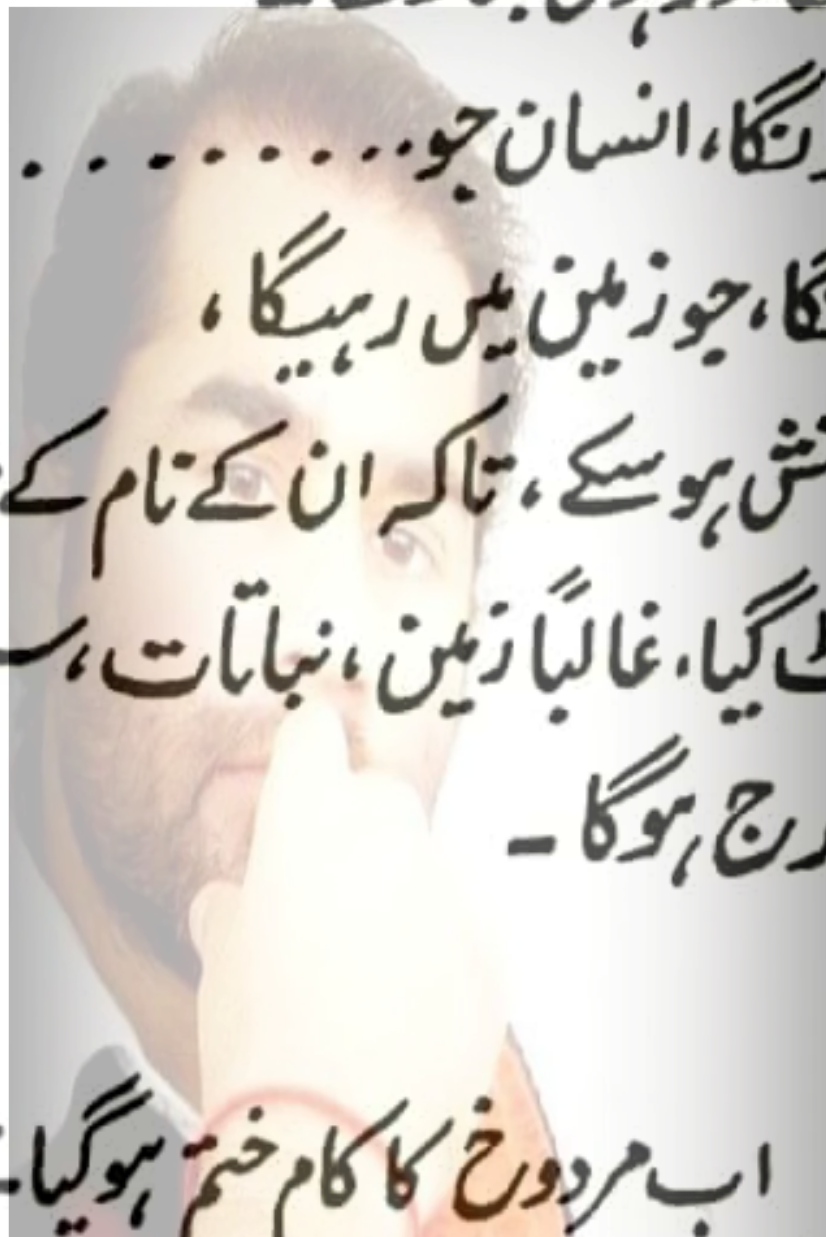
عقلمند اور دانا ان پر مل کے غور کریں۔
چاہیے کہ ماں باپ انھیں دہرائیں اور اپنی اولاد کو سکھائیں۔
چاہیے کہ کسان اور چرواہے اپنے کان کھول کے انھیں سنیں۔
اور مردوخ، دیوتاؤں کے سردار، کے حالات پر خوش ہوں۔
تاکہ ان کی زمین زرخیز ہو اور خوشحالی میں اضافہ ہو۔
مردوخ کی بات پکی اور اس کا کہا اٹل ہے۔
وہ جو کہہ دے، کوئی دیوتا اسے منسوخ نہیں کر سکتا۔
وہ نظر ڈال کے منہ نہیں پھیر لیتا،
اور اس کے غضب کے سامنے کوئی دیوتا نہیں ٹھہر سکتا۔
لیکن اس کا قلب وسیع ہے اور دل حلیم
گناہگار اور بدکار اس کے سامنے ۔۔۔۔۔۔

افسوس کہ اس کے آگے کی چھپے سطریں بہت مخدوش ہیں اور ان کا ترجمہ ممکن نہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس کے بعد مردوخ کے رحم وکرم اور عفو وچشم پوشی کا بیان ہے اور نظم مردوخ کی مدح پر ختم ہو جاتی ہے۔

ان آخری الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ غالباً بابل میں یہ نظم کتھا کے طور پر بیان ہوتی تھی، بالکل اسی طرح جیسے آج بھی رامائن اور مہابھارت کی کتھا کا رواج ہندوؤں کے ہاں ہے۔ لوگ جمع ہوتے ہونگے، جہاں پجاری یا کاہن یہ نظم پڑھتے اور اس کے مطالب ان کے سامنے مذہب واخلاق کی تعلیم دینے کے لیے بیان کرتے ہونگے۔

یہاں ایک اور بات کا اظہار بے محل نہیں ہوگا:

مختلف دیوتاؤں کی صفات جس طرح بتدریج مردوخ کو تفویض ہوئی ہیں اور جتنے ناموں (۵۰) سے اسے یاد کیا گیا ہے، اس کا نتیجہ یہ نکلا، کہ مردوخ نہ صرف سب دیوتاؤں کا سردار ہی قرار پایا، بلکہ اب لوگ تمام مناجاتیں اور حمد وثنا کے گیت اسی کی مدح میں گانے اور لکھنے لگے۔ اگر ہم ان گیتوں کو دیکھیں، تو گمان تک نہیں ہوتا، کہ یہ

قوم توحید کی قائل نہیں اور یہ دیوتا ان کا واحد معبود نہیں۔ مثال کے طور پر دو ایک مختصر مناجاتیں سنیئے:

دیوتاؤں کا عظیم الشان سردار، صاحبِ جلال مردوخ،
اِن کا مشیر، اِآیا کا جگر گوشہ، صاحبِ سطوت حکمران!
اس کے حکم کے سامنے اِیجی[1] کا سر خم ہے،
اس کے حضور انونا کی[2] سرنگوں ہے۔
ساری دنیا کا مالک، رحیم، موت و حیات کا پیدا کرنے والا،
دیوتاؤں کی قربانیوں کا محافظ، شہروں کا بانی،
سر چشموں کی طرف رہنمائی کرنے والا، چشموں کو چلانے والا،
زمین کا مالک، ارض و سما کا بادشاہ، خوشحالی عطا کرنے والا،
دیوتا، جس کے بغیر دنیا کا انضباط نہیں ہو سکتا۔
تم شریروں کے مسکن دیکھتے ہو اور ان کی طاقت کا قلع قمع کر دیتے ہو
زمین میں یا آسمان میں اور کون دیوتا تمھاری برابری کر سکتا ہے؟
تم سب دیوتاؤں پر فائق ہو،
دیوتاؤں کے درمیان تمھارا فیصلہ ناطق ہے،
تم اِیا سے بھی برتر ہو، جس نے تمھیں پیدا کیا۔

یہ شروع کا زمانہ ہے۔ اگرچہ مردوخ کی تمام دیوتاؤں پر برتری تسلیم کر لی گئی ہے لیکن ابھی تک دوسرے دیوتاؤں کا نام بھی مقابلے کے لیے لیا جا رہا ہے۔ مرورِ زمانہ سے یہ تسمہ بھی کٹ جاتا ہے۔ اور اب صرف مردوخ ہی مردوخ رہ جاتا ہے۔

کون تمھاری نظر سے بچ کے جا سکتا ہے!
تمھارا کلام ایک وسیع جال کی مانند ہے، جس میں آسمان اور زمین گھرے ہوئے ہیں

---

[1] ارواحِ سماوی [2] ارواحِ ارضی

یہ سمندر کو محیط ہے اور سمندر میں اس سے جوش پیدا ہوتا ہے۔

یہ دلدلی زمینوں کا احاطہ کیے ہوئے ہیں اور دلدلیں تڑپ رہی ہیں۔

فرات کی لہروں پر اس کا قبضہ ہے۔

مردوخ کا کلام دریا کی تہ میں ہیجان پیدا کرتا ہے۔

اے میرے مالک! آپ سب کے حاکمِ اعلیٰ ہیں، کون آپ کی برابری کر سکتا ہے۔

اے مردوخ! آپ سب دیوتاؤں کے سردار ہیں۔

یہ گویا قوم کے توحید کی طرف عَود کرنے کے مرادف تھا۔ لوگ جو اب تک سیکڑوں دیوی دیوتاؤں کی عبادت کر رہے تھے، اب پھر سے ایک دیوتا کے سامنے جھکنے لگے، جو ان سب دیوتاؤں کا سردارِ اعلیٰ تھا، جو اُن سب کی صفات کا حامل اور ان کی کمزوریوں سے بَری تھا۔

۴۔ عِشتار کا پاتال کا سفر

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، عِشتار کی حیثیت افزائش کی دیوی کی ہے۔ وہ نہ صرف بنی نوعِ انساں ہی کی ترقّی کے لیے ذمّہ دار ہے، بلکہ حیوانات اور نباتات میں بھی برگ و بار اور نسل کشی اسی کے دم قدم سے وابستہ ہے۔ اسی حقیقت کو ایک مشہور نظم میں مثال کے طور پر بیان کیا گیا ہے:

عِشتار چاند کی بیٹی نے قصد کیا،

اس زمین کا، جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا، جہاں اندھیرا ہی اندھیرا ہے

قصد کیا، عِشتار چاند کی بیٹی نے

تاریک مکان کا، جس میں اِرکلا رہتا ہے۔

مکان جس میں کوئی داخل ہو جائے، تو وہاں سے باہر نہیں نکل سکتا۔

اس سڑک کا، جس میں کوئی موڑ نہیں

اس مکان کا، جس میں داخل ہونے والے کے لیے کوئی روشنی نہیں۔

۵؎ پاتال (اور جہنّم) کا دوسرا نام ہے۔

اس جگہ کا، جہاں پھانکنے کو خاک، اور کھانے کو مٹی ملتی ہے۔
جہاں کوئی روشنی نہیں، وہ گھپ اندھیرے میں رہتے ہیں۔
اور جس کے دروازوں اور چٹخنیوں پر گرد جمی رہتی ہے [1]
عشتار، جب اس "بن واپسی" [2] کی سرزمین کے پھاٹک پر پہنچی۔
تو اس نے دربان سے کہا۔
"دربان، ارے دربان، دروازہ کھول،
اپنا دروازہ کھول، تاکہ میں اندر آسکوں"
اگر تم نے میرے اندر آنے کو دروازہ نہیں کھولا
تو میں اسے توڑ ڈالونگی، میں اس کے تالے چور چور کر دونگی،
میں دروازے کی چوکھٹ اکھاڑ پھینکونگی، اور اندر گھس آؤنگی۔
میں یہاں کے مُردوں کو جِلا دونگی، جو زندوں کو کھا جائینگے،
اور زندوں سے زیادہ مُردے ہو جائینگے،
دربان نے لب کھولے اور یوں گویا ہوا،
وہ عشتار دیوی سے یوں گویا ہوا،
"ٹھہرو، اے دیوی! اسے مت تباہ کر۔
میں ابھی جا کے اپنی ملکہ رشکی جَل کو اطلاع کرتا ہوں"
دربان اندر گیا اور اس نے (رشکی جَل کو) اطلاع کی،
"آپ کی بہن عشتار دیوی، دروازے پر کھڑی ہے"

---

[1] اس سے معلوم ہوگا کہ ان لوگوں کے عقیدے میں جہنم کا کیا تصور تھا۔ گرد جمنے کا یہ مطلب ہے کہ یہ دروازے ہمیشہ بند رہتے ہیں کیونکہ کوئی ان سے باہر نہیں جا سکتا۔

[2] وہ زمین جہاں سے کوئی انسان واپس نہیں آتا۔ گویا ان کے عقیدے میں جہنم دائمی تھی کہ جو ایک دفعہ اس میں پہنچ گیا، وہ اب وہاں سے نہیں نکل سکتا۔

. . . .

. . . .

جب رشکی جل نے سنا
تو وہ بید کی طرح تھر تھر کانپنے لگی۔
"اس کے دل میں کیا ہے؟ اس کے جگر میں کیا ہے؟
کہو تو، کیا وہ یہاں میرے ساتھ رہنے کو آئی ہے؟
مٹی کھانے، اور خاک پھانکنے کو،
(اگر یوں ہے) تو مجھے رونا آتا ہے، ان مردوں پر جو اپنی بیویوں کو
چھوڑ آئے ہیں
میرا دل جلتا ہے، ان بیویوں کے لیے، جو اپنے شوہروں کی آغوش
سے جدا ہو گئی ہیں۔
اور ان بچوں کے لیے، جو قبل از وقت ختم ہو گئے ہیں
دربان! جاؤ اس کے لیے پھاٹک کھول دو۔
اس کے بعد دربان نے جا کے دروازہ کھول دیا اور عِشتار کی مناسب پذیرائی کی۔

پاتال کے ایک کے بعد دوسرا، سات دروازے تھے۔ ہر ایک دروازے پر، دربان عِشتار کے لباس وغیرہ سے کوئی نہ کوئی چیز اتروا لیتا۔ اِس طرح اس نے یکے بعد دیگرے اس کے سر کا تاج، کانوں کے آویزے، گلے کا ہار، سینے کا زیور، کمر کا پٹکا، ہاتھ پاؤں کی انگوٹھیاں اور انوٹیں، اور سب سے آخر کا لباس تک، ایک ایک کر کے اتروا لیے۔ یہاں تک کہ آخر میں وہ الف ننگی ہو گئی۔ جب کبھی عِشتار اس سے اس کا سبب دریافت کرتی، وہ یہی جواب دیتا، کہ رشکی جل کا یہی حکم ہے، اور یہی یہاں کا دستور ہے۔ یہ دراصل استعارہ ہے، بہار کے بعد خزاں اور سردی کے موسم کا، جب دنیا بتدریج انحطاط پذیر ہوتی جاتی ہے۔ عِشتار دیوی ہے افزائشِ نسل اور بہار اور برگ و بار کی۔ اس لیے ہر ایک دروازے پر اس کی آرائش کی ایک ایک چیز اترنے سے مراد یہ ہے، کہ جوں جوں وہ دنیا سے

کہیں دُور، گویا پاتال کے اندر چلی گئی ہے، فطرت کی ہر ایک چیز کا رنگ و روغن اور حسن بھی ختم ہوتا چلا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ بالکل ننگی رُنڈ مُنڈ ہو کے رہ جاتی ہے۔

جب نوبت یہاں تک پہنچ گئی اور کائنات میں نشوونما کا سلسلہ بند ہو گیا، تو دنیا میں ہر طرف کہرام مچ گیا۔ دیوتاؤں کی مجلس میں بھی چہ میگوئیاں ہونے لگیں کہ کسی نہ کسی طرح عِشتار کو واپس لانا چاہیے، کہیں ایسا نہ ہو کہ زمین پر سے زندگی بالکل ہی ختم ہو جائے۔

یہ ٹھہری کہ ان کا ایک ایلچی رشکی جل کے پاس جا کے اس سے درخواست کرے کہ وہ عِشتار کو آزاد کر دے۔ پہلے تو رشکی جل بہت تلملائی کیونکہ وہ خیال کرتی تھی کہ اب جو یہ ایک مرتبہ میرے قابو میں آ گئی ہے، تو اسے یہاں سے واپس نہیں جانے دونگی۔ لیکن اس نے دیکھا کہ دیوتاؤں کی متفقہ درخواست کو رد کرنا بھی ممکن نہیں، تو اس نے اپنے مصاحب نامتر کو حکم دیا کہ جاؤ اور عِشتار پر آبِ حیات چھڑکو اور اسے باہر لے جا کر آزاد کر دو۔

اس پر نامتر تحت الثریٰ میں گیا اور عِشتار کو ساتوں دروازوں سے باہر نکال لایا۔ ہر ایک دروازے پر اس کے لباس یا آرایش کی جو چیز اس سے آتے وقت لی گئی تھی، وہ اسے واپس دی۔ اور اس طرح عِشتار سرتاپا ملبوس، زیوروں سے لدی پھندی، حسن و جمال کی دیوی بنی ہوئی دنیا میں واپس لوٹ آئی۔ دنیا نے گویا دوبارہ زندگی پائی، ہر ایک چیز پر تروتازگی آ گئی۔ باغ و راغ میں بہار کا دَور دورہ ہوا۔ انسان اور حیوان میں خواہشِ نشوونما عَود کر آئی۔

۵۔ تائب اِنلیل کی آپ بیتی
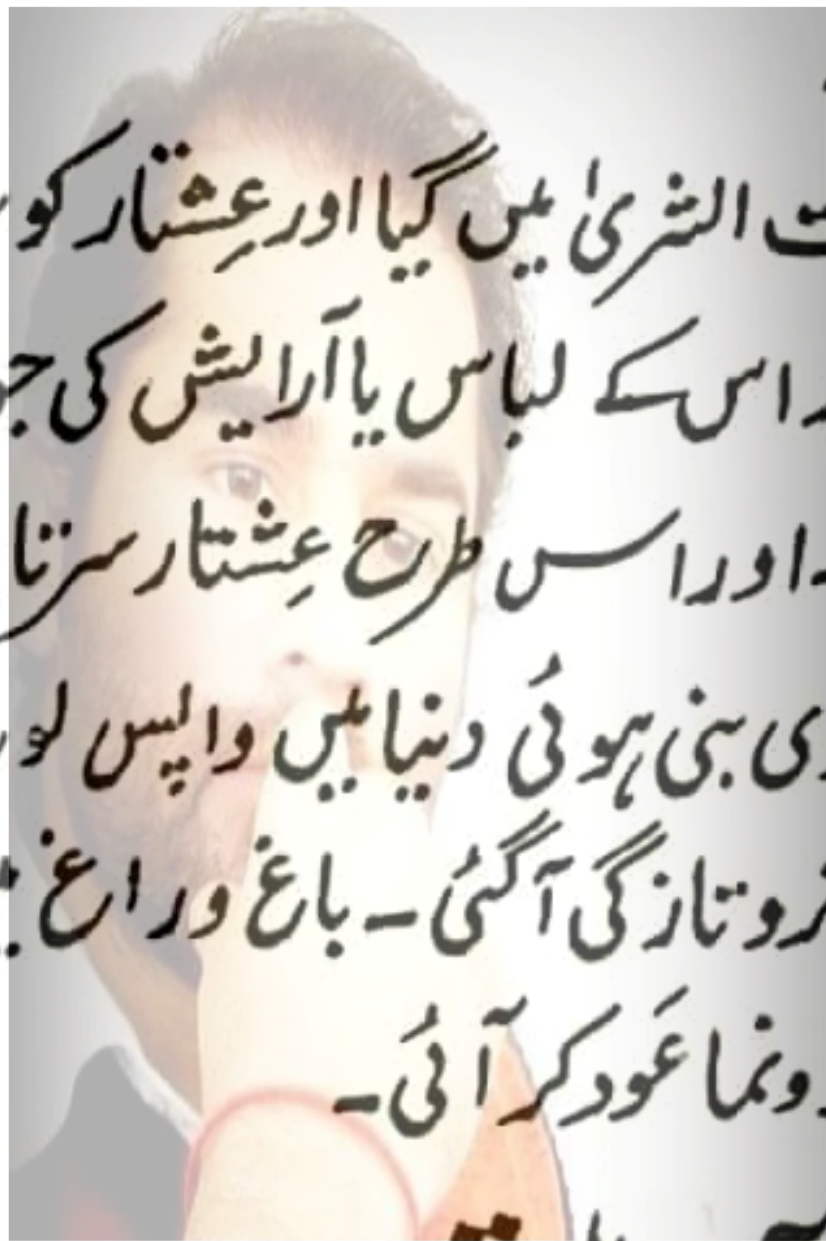
بابلی ادبیات میں ایک اور بہت دلچسپ نظم ملی ہے، جس میں ایک بادشاہ کا قصّہ بیان ہوا ہے۔ افسوس کہ یہ بہت ناقص حالت میں ہے، لیکن اس کا جتنا حصّہ ملا ہے، وہ بھی فلسفیانہ خیال آرائی کا بہت اچھّا نمونہ ہے۔

تائب اِنلیل نامی نِفَر کا بادشاہ تھا۔ وہ کہتا ہے میں دیوتاؤں کا فرمانبردار

اور خادم تھا، پوجا پاٹ میں مستعد اور رسوم کی ادائی میں محتاط۔ ہمیشہ وقت پر قربانی کرتا اور چڑھاوے میں کبھی کوتاہی نہ کرتا۔ اس کے باوجود مجھے ایسی بیماری لگ گئی کہ میرے جوڑ جوڑ میں درد ہونے لگا۔ معلوم نہیں مجھ سے کونسا قصور سرزد ہوا، جس کی سزا میں مجھے یہ بیماری لاحق ہوگئی۔ میں نے پجاریوں اور کاہنوں سے بھی رجوع کیا، لیکن کوئی اس کی کُنہ تک نہیں پہنچ سکا۔

پہلے اس کی بیماری کا حال سُنیئے:

میری آنکھ کی پتلی تاریک ہوگئی ہے، جیسے کسی دروازے کو قفل سے بند کر دیا جائے۔

میرے کان بند ہوگئے ہیں، جیسے بہرے آدمی کے ہوتے ہیں۔

میں بادشاہ تھا۔ لیکن اب میں غلام بن گیا ہوں۔

میرے ساتھی مجھ سے ایسا سلوک کرتے ہیں، جیسے میں پاگل ہوں۔

الٰہی! میری قبر کو میری امداد کے لیے بھیج،

میری فریاد سن لے اور میرا گڑھا تیار کر دے۔

میرے دن ٹھنڈی آہیں بھرتے اور میری راتیں روتے گزرتی ہیں۔

مہینا بھر چیخنا چلاّنا، اور سال بھر رنج والم۔

اس کے بعد وہ زندگی کے مصائب بیان کرتا ہے اور کہتا ہے کہ انسان کے لیے یہ بہت مشکل ہے کہ وہ دیوتاؤں کے کاموں کی مصلحت سے آگاہ ہوسکے اور انھیں خوش رکھ سکے۔

میں عمر کی مقررہ حد تک پہنچ گیا، بلکہ اس سے بھی گزر گیا تھا۔

میں جدھر رُخ کرتا، مجھے بُرائی ہی بُرائی دکھائی دیتی،

بدنفیسی بڑھ گئی تھی، اور انصاف کم ہوگیا تھا۔

میں نے اپنے دیوتا سے فریاد کی، لیکن مجھے اس کا دیدار نصیب نہ ہوا۔

میں نے اپنی دیوی سے فریاد کی، لیکن اس نے بھی مجھے آنکھ اٹھا کے نہ دیکھا۔

جوتشی بھی کوئی حکم نہ لگا سکا، کہ کل کیا ہونے والا ہے۔
میں نے قربانی پیش کی لیکن پجاری اس پر بھی میری کچھ مدد نہ کر سکا۔
میں نے غیب دان کاہن سے مدد مانگی، وہ بھی کچھ نہ بتا سکا۔
میں نے دعائیں کرائیں ختم کرائے، لیکن میری مشکل آسان نہ ہوئی۔
ایسی مثال تو پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آئی تھی۔
میں جس طرف کا بھی رخ کرتا، مصیبت میرا پیچھا کرتی۔

چونکہ وہ رسم و رواج کا سختی سے پابند اور عبادت میں ہمیشہ چاق و چوبند رہتا تھا، اس لیے اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ سزا جو مجھے مل رہی ہے، آخر یہ کس غلطی کی پاداش میں ہے۔

یہ تو ایسا ہے، جیسے میں نے کبھی دیوتا کا حصہ نہ نکالا ہو۔
یا کھانا شروع کرنے سے پہلے دیوی سے برکت نہ مانگی ہو،
اس کے سامنے سر نہ جھکایا ہو، اور بھینٹ نہ چڑھائی ہو،
جیسے کوئی ایسا شخص ہو، جس کے منہ سے کبھی دعا کی آواز تک نہ نکلی ہو،
جس نے کبھی دیوتا کے تیوہار کی پروا نہ کی ہو، اور نئے چاند کی رسم نہ منائی ہو۔
بے پروا ہو اور مورتیوں کو حقارت کی نظر سے دیکھے،
یا اپنی دیوی سے بے رخی برتے اور اس پر شراب نہ چھڑکے،
میں تو اس ظالم کے برابر بنا دیا گیا ہوں،

جس نے دیوتا کے مقدس نام کو کلنک لگایا ہو،
جو اپنے مالک کو بھول جائے،
میں تو سدا عبادت اور دعا ہی سے سروکار رکھتا تھا،
عبادت میرا مشغلہ تھا اور قربانی میرا شیوہ۔
دیوتاؤں کی عبادت کا دن میرے لیے عین راحت کا دن تھا،

دیوی کی پوجا کا دن مجھے دھن دولت سے زیادہ عزیز تھا،
شاہی عبادت ــــ اسی میں میری خوشی تھی؛
اور اسے بجا لانا ـ میری مسرّت،
میں نے اپنی رعایا کو تلقین کی کہ دیوتا کے نام کی بڑائی کرو،
دیوی کے نام کی عزت کرنے کی میں نے انھیں عادت ڈالی ـ
میں نے بادشاہ کی تعظیم و تکریم دیوتا سے نچلے درجے پر کردی،
میں نے مندروں کا احترام لوگوں کے ذہن نشین کیا،
اور یہ سب کچھ اس لیے کیونکہ میری نظر میں یہ چیزیں دیوتاؤں کے
دلپسند تھیں ـ

اس سے معلوم ہوگا کہ ان لوگوں کے نزدیک نیکی اور ثواب کے کیا کام تھے اور برائی اور گناہ کے کیا ـ اس نے اس کی پوری پابندی کی ـ لیکن اس کے باوجود ہوا کیا کہ اُسے موذی اور تکلیف دہ بیماریوں نے آن گھیرا ـ قدرتی طور پر اس کے دل میں یہ وسواس گذرنے لگے کہ دیوتاؤں کے من کی بات معلوم کرنا محال ہے ـ وہ پُراسرار طریقے پر سوچتے اور فیصلہ کرتے ہیں ـ

جو چیز ایک انسان کی نظر میں بھلی ہے، وہی دیوتاؤں کو ناپسند ہے،
انسان جس چیز کو رد کرتا ہے، دیوتا اسی کو پسند کرتے ہیں ـ
کون ہے، جو دیوتاؤں کی پسند کا احاطہ کر سکے ـ
دیوتاؤں کے طریقے پُراسرار ہیں، کون انھیں سمجھ سکتا ہے؟

ہم فانی انسان دیوتاؤں کی باتیں کیسے جان سکتے ہیں!
جو کل زندہ تھا، آج مُردہ ہے ـ
چُٹکی میں وہ غم کے سمندر میں غرق ہو جائے، آناً فاناً تباہ ہو جائے ـ
ایک لمحے وہ گاتا بجاتا اور خوش ہوتا ہے،
آنکھ جھپکنے کی دیر نہیں لگتی کہ وہ بَین کرنے والوں کی طرح رونے لگتا ہے ـ

انسان بھی دن رات کی طرح چولا بدلتا ہے،
اگر وہ پیٹ سے بھوکا ہو، تو لاش کی مانند ہے،
اگر وہ سیر ہو کے کھا چکے، تو اپنے آپ کو دیوتا سے کم نہیں سمجھتا۔
اگر سب کام ٹھیک ٹھاک چلتا جائے، تو وہ عرش کے تارے توڑنے لگتا ہے،
اگر کہیں کوئی مصیبت پیش آجائے، تو پھر وہ جہنم کا راستہ پوچھنے لگتا ہے۔

انسانی فطرت کے اس جائزے کے بعد وہ پھر اپنی بیماری اور تکلیف جزوی تفصیل سے بیان کرتا ہے، کہ کس طرح مرض نے اس کے تمام اعضاء پر قابو پایا، جس سے وہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گیا۔ نہ جھاڑ پھونک کرنے والے کو مرض کی اصلیت کا علم ہو سکا، نہ جوتشی کو۔ دشمن اس کی تکلیف کا حال سُن سُن کے پھولے نہیں سماتے تھے اور اس کے اپنے خاندان اور ملک کے لوگ غم و الم میں غرق ہوئے جاتے تھے۔ اُن کے نزدیک وہ مُردے سے بدتر تھا۔ غرض ہر ایک اس کی صحت کی طرف سے مایوس ہو گیا اور اس کی زندگی کے دن گننے لگا۔ یہ صورت تھی، جب ارباؤ دیوتا نے خواب میں آکے اسے مردوخ کا پیغام دیا کہ کوئی فکر کی بات نہیں۔ افسوس کہ تحریر یہاں سے مغشوش ہے۔ لیکن جو حصہ بچ گیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مردوخ نے اس پر رحم کھایا اور اس کی صحت بحال ہونا شروع ہو گئی۔ رفتہ رفتہ اس کے ہر ایک عضو کا مرض اور علّت رفع ہونے لگی۔ یہاں تک اس کی تندرستی دوبارہ اسی طرح ہو گئی، جیسی مریض ہونے سے پہلے تھی۔ اس کا حال بتانے کے بعد تائب اِنلیل خاتمہ میں کہتا ہے:

جو شخص اِی سجیلا[1] کی نافرمانی کرتا ہے، وہ میری بات سن لے۔
کہ میں ایک شیر کے منہ[2] میں پہنچ گیا تھا اور قریب تھا کہ وہ مجھے نِگل جائے، لیکن مردوخ نے میری مدد کی۔

---

[1] بابل میں مردوخ کا مندر، یہاں ظرف کا نام لے کر اس سے مظروف مراد ہے۔
[2] یعنی مہلک مرض۔

مردوخ نے میرے تعاقب کرنے والے کا جال پکڑ لیا اور اس کے مسکن کے
گرد گھیرا ڈال دیا۔

ممکن ہے کہ اس کے بعد بھی اسی طرح کی کوئی اخلاقی تعلیم ہو کہ آدمی کو کسی حالت میں بھی دیوتاؤں کی مہربانی اور نظرِ کرم سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ حالات خواہ کیسے ہی خطرناک، اور تکلیف خواہ کتنی ہی شدید ہو، انسان کا فرض ہے کہ وہ دیوتاؤں کی پرستش میں کوتاہی نہ کرے اور ان کے رحم و کرم کا جویا رہے۔ لیکن اس کے بعد کی تحریر ضائع ہوگئی ہے۔

اب دو ایک متفرق ٹکڑے ملاحظہ کیجیے:

اخلاقی نظم

کسی پر تہمت نہ لگاؤ۔ بات وہ کرو، جو پاک صاف ہو۔
کسی کی برائی نہ کرو۔ بلکہ اچھائی سے کلام کرو۔
جو کسی پر تہمت لگاتا ہے، کسی کی برائی کرتا ہے۔
شمس [۵] اسے لوٹا کر اسی کے سر پر دے مارتا ہے۔
شیخیاں نہ مارو، اپنی زبان قابو میں رکھو۔
اگر تم غصّے میں ہو، تو فوراً بات نہ کرو۔
اگر تم جلدی بات کروگے، تو تمھیں بعد کو پچھتانا پڑیگا۔
چپ رہ کے اپنا جوش کم کرو۔

روزانہ اپنے دیوتا کی خدمت میں نذر لے کے جاؤ،
اور قربانی اور عبادت اور پسندیدہ خوشبو کے ساتھ بھینٹ چڑھاؤ۔
دیوتا کے سامنے بے میل دل لے کے جاؤ۔

---

[۵] شمس، انصاف کا دیوتا ہے۔

دیوتا کو سب سے زیادہ پسند ہے،
عبادت اور تفرع اور سجدہ۔
ہر صبح یہ اس کے پیش کرو۔ اس سے تمھاری طاقت میں اضافہ ہوگا۔
اس سے دیوتا کی مہربانی تم پر نازل ہوگی۔
دیوتا سے ڈرنا، اس کو مہربان بناتا ہے،
نذر پیش کرنے سے عمر بڑھتی ہے۔
پوجا پاٹ سے گناہ معاف ہوتے ہیں۔
جو ڈرتا ہے، انونا کی اس کی عمر لمبی کر دینگے۔
اپنے دوست اور ساتھی کی برائی نہ کرو۔
کمینہ بات نہ کہو، بات کرو تو لطف و عنایت کی۔
اگر تو وعدہ کرے، تو اپنا وعدہ پورا کر۔

غلاموں سے سلوک

ان سے ظلم اور سختی سے مت پیش آؤ۔
اس سے دیوتا تم سے ناراض ہو جائیگا۔
یہ بات شمس کو پسند نہیں، وہ اس کا بدلا بُرائی سے دیگا۔
کھانے کو خوراک اور پینے کو شراب خیرات کرو۔
نیکی کی تلاش کرو اور بُرائی سے بچو،
دیوتا اسے پسند کرتے ہیں۔
شمس کو بھی یہ بات پسند ہے وہ اس کی جزا دیگا،
خادم کی مدد کرو اور اس سے مہربانی سے پیش آؤ۔

کہاوتیں

آپ کسی قوم کی ذہنیت اور قوّتِ مشاہدہ واستنباط کا حال معلوم

کرنا چاہیں، تو اس کی کہاوتوں کا مطالعہ کیجیے۔ آپ کو آسانی سے پتا چل جائیگا کہ اس قوم کا معیارِ زیست کیا تھا اور اس کی عادات کیا تھیں اور وہ زندگی کے مسائل پر کس کس طرح غور و فکر کرتے تھے کیوں کہ کہاوت ہمیشہ بنتی ہی لوگوں کے لمبے تجربے اور کسی خاص ماحول میں بار بار ایک ہی نتیجہ برآمد ہونے سے ہے۔

مندرجۂ ذیل چند بابلی کہاوتوں سے ہمارے اس دعوے کی صداقت خود بخود ظاہر ہو جائیگی۔

۱ ـــ دروازے اور چٹخنیاں مضبوطی سے بند رکھو۔

(اس سے ملک میں بدامنی اور جان و مال کے غیر محفوظ ہونے پر استدلال کیا جاسکتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہر کام میں حفظِ ماتقدم سے کام لو۔ حدیث ہے:

"اِعقل و توکل"۔)

۲ ـــ ولی کے لیے ولی، اسے ولی کے سامنے لاؤ۔

(فارسی میں بھی ہے "ولی را ولی می شناسد"۔ مطلب یہ ہے کہ کسی شخص کی صحیح قدر و قیمت اور منزلت کا اندازہ اس کے برابر کا آدمی ہی کر سکتا ہے، ورنہ بھینس کے آگے بین والا مضمون ہو جائیگا۔)

۳ ـــ ٹوٹی لکڑی پھینک دو، مضبوط لکڑی کو گھڑو۔

(اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں، ایک تو یہ کہ تم محنت کرنا ہی چاہتے ہو، تو کسی ایسے کام پر کرو جو ختم ہونے کے بعد مفید ہو کیونکہ اگر وہ کام سرے ہی سے معمولی یا نقص والا ہے، تو تکمیل کے بعد بھی وہ اس ابتدائی نقص کی وجہ سے بے مصرف ہی رہیگا۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ اپنے ہتھیار کی جانچ پڑتال کر لو کہ اس میں کوئی نقص تو نہیں۔)

۴ ـــ مکان کے صحن میں وہ چھوٹا دکھائی دیتا ہے۔

(اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی شخص کو اپنی بڑائی کا غرور نہیں کرنا چاہیے کیونکہ اس سے بھی بڑے موجود ہیں۔ اس کہاوت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بابلی

مکانوں میں صحن ہوتے تھے۔)

۵۔ گواہوں کی کثرت سے بنیاد مضبوط بناؤ۔

(یہ کہاوت مقدمہ بازی کی عادت کی غماز ہے۔ مدعا ظاہر ہے کہ اپنے دعوے کے ثبوت کے لیے ہر قسم کی پختہ شہادت مہیا کر لینا چاہیے۔)

۶۔ خود ہی کھودو، خود ہی بناؤ۔

(یعنی اپنی مدد آپ کرو، کسی دوسرے کے بھروسے پر نہ رہو۔ جہاں بنیاد کھودی ہے، اب مکان بھی خود ہی تعمیر کر لو۔)

۷۔ آرام کی جگہ چاندی سے خریدو۔

(کوئی مقصد بھی کوشش اور سعی کے بغیر حاصل نہیں ہوتا۔ چاندی بطور سکے کے استعمال ہوتی تھی)

۸۔ اینٹوں کا انبار، اوپر نہ دیوار نہ شہتیر۔

(اگر کوئی شخص کسی کام کو مناسب طریقے پر شروع کرنے کے بعد اسے ادھورا چھوڑ دے، تو اس کے لیے کہینگے)

۹۔ ایک مرتبہ، دو مرتبہ نفع کمایا لیکن وہ قانع نہیں۔

(بابلی لوگ داخلی اور خارجی تجارت وسیع پیمانے پر کرتے تھے اور یہ کہاوت اسی سرگرمی کا نتیجہ ہے۔ اس میں قناعت کی تلقین ہے)

۱۰۔ جیسا مکان تمہارا اپنا ہے، ویسا ہی دوسرے کو بھی دو۔

(مطلب واضح ہے کہ صرف اپنے حقوق ہی پر اصرار نہ کرو بلکہ دوسروں کے حقوق کا بھی خیال رکھو)

۱۱۔ مرشسوان کا تیسواں دن چلنے کا ہے۔

مرشسوان کا تیسواں دن گھاس پھونس کھودنے کا ہے۔

(یہ کہاوت ان دو شکلوں میں ملتی ہے۔ مرشسوان بابلی سال کا آٹھواں مہینا تھا۔ یہ ہمارے سال کے اکتوبر نومبر کے مطابق ہوگا۔ ان ایام میں وہاں سخت بارشیں

ہوتی تھیں ۔ لوگ عام طور پر اس موسم میں سفر نہیں کرتے تھے، نہ کھیتی باڑی کی دیکھ بھال ہی کر سکتے تھے ۔ مطلب یہ ہے کہ جب مرشسوان ختم ہو جائے تو اب بھی پاؤں توڑ کے گھر میں بیٹھے رہنا درست نہیں ۔ کام کاج کے لیے باہر نکلنا چاہیے اور پانی برسنے سے کھیتوں میں جو گھانس پھونس اور روئیدگی نکل آئی ہے اس کی نلائی کر ڈالنا چاہیے ۔ مدعا یہ ہے کہ آج کا کام کل پر نہ ڈالو)

۱۲۔ دوستی کی عمر ایک دن، نسل ابد تک ۔

(یہ کہاوت بہت اہم ہے ۔ مراد یہ ہے کہ تمھیں اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ دینا چاہیے کیوں کہ اسی سے خاندان کا نام چلیگا، اگر بچے نالائق اور بداخلاق ہوئے، تو وہ اپنے والدین اور تمام آباواجداد کی بدنامی کا باعث ہونگے)

۱۳۔ جو آج زندہ ہے، کل ختم ہوتے سے پہلے مر جائیگا۔

(دنیا کی بے ثباتی اور ناپایداری کا اظہار مقصود ہے ۔ میر کا ایک شعر یاد آ گیا ۔

جس سر کو غرور آج ہے یاں تاجوری کا
کل اس پہ یہیں شور ہے پھر نوحہ گری کا)

۱۴۔ شاہی انعام منہ مانگی پیشگوئی کی ضمانت ہے ۔

(یہ کہاوت کسی منکر اور متشکک کی وضع کی ہوئی ہے، جسے کاہنوں اور جوتشیوں کی پیشگوئیوں پر اعتماد نہیں ۔ کہتا ہے جوتشی ہمیشہ اپنے ولی نعمت کی حسبِ خواہش پیشگوئی گڑھ لیگا کیونکہ دوسری صورت میں اسے انعام ملنے کی توقع نہیں ہو سکتی ۔

اس کہاوت سے بابل کے سماج میں جوتشیوں کی باقاعدہ موجودگی ثابت ہوتی ہے ۔)

۱۵۔ کیا کبھی دلدل کو سرکنڈے کی قیمت ملی ہے، یا کھیت کو فصل کی ۔

(مراد یہ، کہ دنیا آپ کی قابلیت اور صلاحیتوں کا بہت کم اعتراف کرتی ہے اور جتنے کے آپ مستحق ہیں وہ شاذونادر ہی آپ کے نصیب ہوتا ہے ۔)

اب سب سے آخر میں کسی گرگِ باراں دیدہ گھاگ کی عملی نصیحت سنیے ۔ کہتا ہے :۔

دو بہت آشناؤں کی معشوقہ سے کبھی شادی نہ کرو ۔ اگر کہیں تمھارے حالات

ناموافق ہوگئے، تو وہ تمھیں چھوڑ کے چل دیگی۔ اگر تم اس سے ناراض ہوئے، تو وہ تمھیں دھتّا بتائیگی۔ وہ جس گھر میں بھی داخل ہوگی اس پر مصیبت آئیگی۔ اور جو شخص اس سے شادی کریگا، اسے برباد کردیگی،،

کتابیات

1. A.H. Sayce: Assyrian Grammer (London, 1880).
2. Leonidas le Cenci Hamilton: Ishtar and Izdubar (Babylonian & Assyrian Literature) (New York, 1901).
3. R.Campbell-Thompson: Epic of Gilgamesh (Oxford, 1930).
4. Morris Jastrow: Religion of Babylonia and Assyria (Boston, 1898).
5. George Smith: The Chaldean Account of Genesis (London, 1876).
6. L.W. King: The Seven Tables of Creation-2 Vols. (London, 1902).
7. British Museum: Babylonian Legends of the Creatiou (London, 1931).
8. British Museum: The Babylonian Story of the Deluge (London, 1929).
9. S.Langdon: Babylonian Wisdom (London, 1923).
10. T.Eric Peet: A Comparative Study of the Literature of Egypt, Palestine and Mesopotamia (London, 1931).